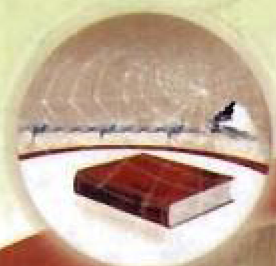
جاوید احمد غامدی کے تجدّد پسندانہ، ملحدانہ اور گمراہ کن عقائد و نظریات
پر بے لاگ تبصرہ، اُن کے ایک دیرینہ رفیق کے قلم سے

فتنۂ غامدیّت
کا علمی محاسبہ







پروفیسر مولانا محمد رفیق مدظلہ العالی



نام کتاب .... فتنۂ غامدیت کا علمی محاسبہ

مرتب .... پروفیسر مولانا محمد رفیق

ناشر .... مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اُردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون:5811297، موبائل:0333-4399812

اہتمام .... حافظ تقی الدین

ملنے کے پتے

مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

1۔ کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

2۔ مکتبہ مجددیہ، الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

[الحشر: 7]

”اور جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں لے لو، اور جس چیز سے روکیں اُس سے رُک جاؤ۔“

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء: 115)

''جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے گا حالاں کہ اُس پر صحیح راستہ واضح ہو چکا ہو تو اُسے ہم اُسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور پھر اسے جہنم میں داخل کریں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے۔''

فہرست مضامین

باب نمبر 3:

حدیث وسنت

باب نمبر 4:

عبادات

باب نمبر 5:

معاشرت

باب نمبر 6:

سیاست وریاست

باب نمبر 7:

فقہی مسائل

باب نمبر 8:

متفرقات

باب نمبر 9:

فکری تضادات

باب نمبر 10:

متفقہ اسلامی عقائد واعمال سے تقابل

ضمیمہ جات:



مقدمہ

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار میں جنم لینے والے بعض فتنوں مثلاً خوارج، معتزلہ، باطنیہ، قادیانیت اور انکارِ حدیث کی طرح دورِ حاضر میں ایک بڑا فتنہ تجدد پسند الحادی فکر ہے جس کا مقصد امت مسلمہ کو اُس کے ماضی سے کاٹ دینا اور اُسے دینِ اسلام کی چودہ سو سالہ متفقہ اور متوارث تعبیر سے محروم کر دینا ہے۔

اِس تجدد پسندانہ الحادی فکر کے چند اہداف یہ ہیں:

1۔ اسلام کو دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ثابت کرنا جو اجتماعی، تمدنی اور سیاسی معاملات سے بے دخل ہو کر فرد کا ذاتی معاملہ (Private Matter) قرار پائے۔ اس کے لیے سرکاری طور پر اور این جی اوز کے ذریعے ایسے بین المذاہب مکالموں کا اہتمام کرنا جس سے مذہب اور سیاست میں جدائی ہو جائے۔

2۔ اسلام کو ایک ایسے تصوف (Sufism) کا جامہ پہنانا جو جہاد کے تصور سے یکسر خالی ہو۔

3۔ اسلامی خلافت کے احیاء کی کوششوں کو دنیا کے سامنے ہوا بنا کر پیش کرنا تا کہ اسلام اپنی سیاسی قوت سے محروم ہو جائے۔

4۔ اسلامی جہاد کو دہشت گردی (Terrorism) کا نام دے کر دینِ اسلام کو ایک دہشت گرد مذہب ثابت کرنا۔

5۔ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے باہمی تعلق کو کاٹ دینا۔

6۔ قرآن مجید کی معنوی تحریف (Distortion) کرنا۔

7۔ حدیث وسنت کی حجیت کا انکار کرنا۔

8۔ اجماع قطعی اور دین کے مسلمات کا انکار کرنا
9۔ فاسد تاویلات کے ذریعے دینی اصطلاحات کے معنی بدل دینا۔
10۔ مغربی تہذیب کو مختلف ذرائع و وسائل کے ذریعے مسلم معاشرے میں رواج دینا۔

جناب جاوید احمد غامدی اسی تجدد پسند الحادی فکر کے علمبردار ہیں اور تقریر و تحریر اور میڈیا کے ذریعے اس فکر کو پھیلانے میں سرگرم عمل ہیں۔ موصوف اسلامی جہاد کے مخالف ہیں، قرآن مجید کی معنوی تحریف کرتے ہیں، حدیث و سنت کی حجیت کو نہیں مانتے اور حدیث کو دین کا حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ اجماع امت کے منکر ہیں، شرعی اصطلاحات کے معنی بدلتے ہیں اور مغربی تہذیب کو مسلم معاشرے میں رائج کرنے کے لیے ہمہ وقت کوشاں ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جنوب ایشیا میں جو حضرات بعض مذہبی فتنوں کے علمبردار رہے ہیں، ان سب کے ناموں میں 'احمد' کے نام کا اشتراک پایا جاتا ہے۔ سر سید احمد خان، مرزا غلام احمد قادیانی، مولوی احمد دین، غلام احمد پرویز اور اب جاوید احمد غامدی...... ان سب میں 'احمد' کا نام مشترک ہے۔

غامدی صاحب کے ہاں پوری امت میں سے صرف دو ہی 'علما' ان کے ممدوح ہیں جن کو وہ 'آسمان' کا درجہ دیتے ہیں اور باقی تمام علمائے اسلام کو وہ 'خاک' قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب 'مقامات' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا، لیکن امین احسن اور ان کے استاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ:

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

('مقامات' ص 57۔58 طبع اول، دسمبر 2001 لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''امین احسن کا پایۂ علم وہی تھا جو اس امت میں مختلف علوم و فنون کے ائمہ

مجتہدین کا رہا ہے۔" (مقامات،ص 47 طبع اول، دسمبر 2001ء لاہور)

وہ مولانا حمید الدین فراہی کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

"وہ (حمید الدین فراہی) اس زمین پر خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھے۔"

(مقامات،ص 19 طبع اول، دسمبر 2001ء لاہور)

غامدی صاحب کا اصل نام محمد شفیق ہے لیکن وہ بعد میں جاوید احمد ہو گئے۔ آپ پیر کریاں (پاکپتن ضلع ساہیوال) میں پیدا ہوئے۔ مذکورہ گاؤں اب قصبہ پاکپتن میں ضم ہو چکا ہے۔ پھر خاندان سمیت لاہور میں سلطان پورہ محلے میں مقیم ہو گئے۔ آج کل ڈیفنس لاہور میں رہائش پذیر ہیں، لیکن چندہ ماہ سے بعض وجوہات کی بنا پر بیرون ملک منتقل ہو چکے ہیں۔

ان کا تعلق ککے زئی خاندان سے ہے مگر انہوں نے اپنا نسب تبدیل کر لیا ہے اور آج کل وہ یمن کے ایک قبیلے غامد کی نسبت سے غامدی کہلاتے ہیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلام میں نسب تبدیل کرنا کتنا بڑا گناہ ہے اور صحیح حدیث میں سے کافرانہ عمل قرار دیا گیا ہے۔

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كُفْرٌ بِالْمَرْءِ اِدِّعَاءُ نَسَبٍ لَا يَعْرِفُهُ اَوْ جَحْدُهُ وَاِنْ دَقَّ))

(ابن ماجہ، رقم 2744۔ مسند احمد، 215/3۔ الصحیحہ 3370)

"یہ کفر ہے کہ آدمی ایسے نسب کا دعویٰ کرے جس کو وہ خود نہیں پہچانتا، یا اپنے نسب کی کسی چیز کا انکار کرے اگرچہ وہ معمولی قسم کی ہو۔"

غامدی نے بی اے تک تعلیم پائی ہے وہ کسی دینی مدرسے کے سند یافتہ فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ ستر (70) کی دہائی میں چند برس جماعت اسلامی (لاہور) کے رکن رہے ہیں۔ مولانا مودودی سے بہت متاثر تھے۔ پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے راہ ورسم پیدا کر لی۔ وہ مولانا اصلاحی کے باقاعدہ شاگرد نہیں ہیں۔ البتہ ان کے کچھ دروسِ قرآن میں ضرور شرکت کر چکے ہیں، وہ مولانا اصلاحی کا نام استعمال کرتے ہیں ورنہ ان سے گہرے اختلافات رکھتے ہیں جن

کی تفصیل اس کتاب میں کئی مقامات پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ پرویز مشرف کے دور میں ان کے ایما پر ان کو جنوری 2006ء میں کچھ عرصے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا ممبر بھی بنایا گیا۔

غامدی صاحب سے میرا بہت قریبی تعلق رہا ہے۔ ہم برسوں تک ایک دوسرے کے ہم پیالہ وہم نوالہ رہے ہیں۔ اس دوران میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر پوری ذمہ داری سے یہ کہتا ہوں کہ موصوف جھوٹ بولنے کے عادی ہیں۔ ان کے سامنے کسی فرضی کتاب کا نام لیا جائے تو وہ اس کے بارے میں بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ کتاب انہوں نے پڑھی ہوئی ہے۔ عربی کے مشہور پروفیسر خورشید احمد رضوی مرحوم کو بھی ان کے اس جھوٹ کا تجربہ ہوا تھا۔ ان کی اسی جھوٹ بولنے کی عادت نے ان کو جماعت اسلامی سے نکلوایا۔ ان پر الزامات تو اور بھی تھے جو پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی سے متعلق تھے، مگر جس بات نے جماعت اسلامی کی تحقیقاتی کمیٹی کو کئی ماہ کی انکوائری کے بعد ان کی رکنیت ختم کرنے کی سفارش کرنے پر مجبور کیا وہ موصوف کا صریح جھوٹ ہی تھا، جس کا علم تحقیقاتی کمیٹی کو مولانا مودودی کے ذریعے ہو گیا تھا اور جس کے چشم دید گواہوں میں پروفیسر سلیم منصور خالد بھی شامل تھے۔

افسوس! اب اس شخص کے شاگردوں کو بھی جھوٹ بولنے کی عادت ہوگئی ہے۔ چنانچہ ان کا ایک شاگرد (خورشید احمد ندیم) اسی واقعے کے بارے میں لکھتا ہے:

"استاد محترم جاوید احمد صاحب غامدی نے جب ازدواجی سفر کا آغاز کیا تو وہ جماعت اسلامی کے رکن نہیں تھے۔ جماعت سے ان کی رکنیت کوئی وجہ بتائے بغیر ختم کی جا چکی تھی۔" (ماہنامہ، اشراق ص58، بابت اگست 2009ء لاہور)

حالانکہ جو لوگ جماعت اسلامی کے نظم سے تھوڑے بہت واقف ہیں وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ جماعت نہ تو فوری طور پر کسی شخص کو اپنا رکن بناتی ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا بااثر ہو اور نہ کوئی وجہ بتائے بغیر اپنے کسی رکن کی رکنیت ختم کرتی ہے۔ جماعت ایک سو ایک دفعہ سوچ کر کسی کو رکن بناتی اور دو سو دو دفعہ غور کر کے اس کی رکنیت ختم کرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ جماعت اسلامی پر جھوٹا الزام اور بہتان ہے جو غامدی صاحب اپنے شاگرد سمیت

اس پر لگا رہے ہیں کہ اس نے ''علامہ جیسے قیمتی'' آدمی کو کوئی وجہ بتائے بغیر بیک بینی و دوگوش جماعت سے نکال باہر کیا ع

بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ کسی شخص کی ذاتی زندگی کو زیر بحث لانا اخلاقیات کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں یہ چیز مغربی معاشرے میں شاید بعض صورتوں میں درست ہو مگر اسلامی معاشرے میں ہرگز درست نہیں ہوسکتی۔ ہم کسی ایسے شخص کو مسجد کا امام یا موذن نہیں بنا سکتے جو اپنی ذاتی زندگی میں شرابی یا جواری ہو۔ ہمارے محدثین بھی کسی حدیث کے راوی کی ذاتی زندگی کو پہلے زیر بحث لاتے، اسے جرح وتعدیل کی چھلنی میں چھانتے، اس کے بعد کہیں جا کر اس کی روایت کی ہوئی حدیث کو دیکھتے تھے۔

غامدی صاحب آئے دن زبانی اور تحریری طور پر اپنے نظریات گرگٹ کی طرح بدلتے رہتے ہیں اور اپنی اس حرکت کو 'فکری ارتقا' کا نام دے کر دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ سنن کی تعداد میں بھی انہوں نے یہی حربہ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ دین میں کوئی نئی رائے قائم کرنے سے پہلے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کا اظہار ضروری ہوتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غامدی صاحب کی کتابوں کے نئے ایڈیشنوں میں ان کی ترمیمی آراء شامل ہوتی ہیں جب کہ وہ اپنی پہلی آراء سے اپنے رجوع کا ذکر تک نہیں کرتے ع

عدل کا جس کے بہت چرچا سنا تھا ہم نے
اُس کے انصاف کے بھی کتنے ترازو نکلے

اسی طرح کبھی وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو علمائے اسلام بالخصوص اہل سنت سے کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے محض 'تعبیر' کا اختلاف ہے ورنہ وہ خود بھی اہل سنت بلکہ احناف ہی میں سے ہیں۔ لیکن دراصل 'تعبیر' کے لفظ کے ذریعے وہ دوسروں کو مغالطہ اور فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر معاملہ اجتہادی اختلافات کا ہو تو اس میں تعبیر کے فرق واختلاف کا جواز ہے لیکن اگر بات دین کے نصوص اور مسلمات کی ہو تو یہی الگ تعبیر ضلالت

بلکہ کفر تک منتج ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر قادیانی حضرات بھی قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر انہوں نے قرآنی الفاظ 'خاتم النّبیین' کی غلط تعبیر کر کے نہ صرف اپنے لیے جھوٹی نبوت کا دروازہ کھولا بلکہ وہ اپنی اس حرکت کی وجہ سے غیر مسلم قرار پاتے ہیں۔ یہ بھی محض تعبیر ہی کا فرق ہے جو آگے چل کر کفر و اسلام کا فرق بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے تصورِ حدیث وسنت نے ان کو انکارِ حدیث وسنت تک پہنچا دیا ہے۔

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے کہ وہ اصولِ دین میں علمائے اہلِ سنت ہی کے پیرو ہیں۔سوال یہ ہے اگر وہ علمائے اہلِ سنت ہی کے اصولوں کو مانتے ہیں تو ان کے ہاں ان اصولوں کے نتائج ان سے مختلف کیوں نکلتے ہیں؟ جن اصولِ دین کی پیروی سے اہلِ سنت ہدایت کی راہ پاتے ہیں انہی اصولِ دین کو اپنا کر غامدی صاحب ضلالت کی اندھیری راہوں میں کیوں جا بھٹکتے ہیں؟ مثال کے طور پر علمائے اہلِ سنت جب قرآن وحدیث کے فہم کے لیے اپنی اصولِ دین کو کام میں لاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سنت کی رو سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے مگر جب انہی اصولوں کے ذریعے غامدی صاحب قرآن وحدیث کا مطالعہ فرماتے ہیں تو ان کو مرتد کے لیے سزائے قتل نظر نہیں آتی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ درخت تو اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ جڑ سے! لٰہذا اہلِ سنت سے نصوص اور مسلمات میں اختلاف کرنے کے بعد غامدی صاحب اہلِ سنت کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں غامدی صاحب کے تصورِ دین کا بھرپور علمی جائزہ ان کی تحریروں کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک سوالنامہ بھی درج کیا گیا ہے جس سے غامدی صاحب کی اصل شخصیت کو سمجھنے اور ان کے گمراہ کن عقائد ونظریات جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ میں نے اس سارے کام کی زحمت اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ میرا فرض بھی تھا اور مجھ پر قرض بھی، جس سے بحمد للہ اب میں سبکدوش ہو گیا ہوں اور اب یہ علمائے دین کا کام ہے کہ وہ اس فتنے کا تعاقب کریں۔ ہو سکتا ہے یہ شخص ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے اور منظر

نا ے سے ہٹ کر کہیں زیر زمین (Under ground) چلا جائے۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ سترہ (17) برس کے بے ریش لڑکے تھے۔ میں نے ان کو ماہنامہ 'محدث' لاہور کی دو اشاعتوں میں اور ایک نجی ٹی وی پر مناظرے کا کھلا چیلنج دے رکھا ہے، جس کے لیے وہ تا حال دانستہ طور پر تیار نہیں ہوئے۔ البتہ انہوں نے اپنے بھانجے طالب محسن اور عمار ناصر صاحب کو ایڈیٹر 'محدث' کے ہاں بھیجا تا کہ ان کے خلاف ہمارے سلسلہ مضامین کو رکوایا جا سکے۔ ویسے وہ کبر نفس کے سبب اپنے اوپر ہونے والی تنقید کا خود جواب دینا پسند نہیں فرماتے بلکہ اپنے شاگردوں کے نام سے جواب دیتے ہیں بلکہ اکثر اوقات اپنی تحریروں کو اپنے احباب کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ ان کی ایمانی قوت اور اللہ تعالیٰ پر بھروسے کا حال یہ ہے کہ چند ماہ پہلے مبینہ طور پر بعض جہادی گروپوں کی طرف سے دھمکی ملنے پر وہ موت کے خوف سے اپنے بال بچوں سمیت ڈیفنس لاہور کا گھر چھوڑ کر، ملک سے فرار ہو کر ملائیشیا میں پناہ لے چکے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میری اِس کاوش کا مقصد محض احقاقِ حق اور ابطال باطل ہے کسی کے خلاف تعصب یا نفرت پھیلانا میرے پیش نظر نہیں ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات سننے، سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ﴾

(الزمر : 18)

''پس میرے بندوں کو خوش خبری دے دیجئے جو کلام کو غور سے سنتے اور اس کے بہتر پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔''

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب...... وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب .

10 اکتوبر 2010ء   خاکسار

بمطابق یکم ذوالقعدہ 1431ھ   محمد رفیق

باب نمبر 1:

ایمانیات

1۔ کیا صرف خدا اور آخرت پر یقین رکھنے والا جنتی ہے؟

اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح اسلامی عقیدے کے مطابق ایمان کے بغیر کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکے گا اور اس ایمان سے مراد ہے اللہ پر ایمان لانا، اس کے فرشتوں پر، اس کے نبیوں پر، اس کی کتابوں پر، آخرت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لانا۔

مگر غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں پر ایمان لائے بغیر بھی محض خدا اور آخرت پر یقین رکھنے سے جنت کا حقدار ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ان کا ایک انٹرویو مصعب سکول سسٹم، جوہر ٹاؤن، لاہور (یاد رہے کہ مصعب سکول سسٹم خود غامدی صاحب کی سرپرستی میں قائم ہے) کے سالانہ مجلّہ 'مصعبی' میں ان کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس میں انٹرویو نگار کا ایک سوال اور غامدی صاحب کا جواب ملاحظہ کیجئے:

سوال: کیا جنت میں صرف مسلمان ہی جائیں گے یا کوئی نیک غیر مسلم بھی جنت میں جا سکتا ہے؟

جواب: جنت میں جانے کا معیار قرآن میں بیان ہے، خدا اور آخرت پر یقین، اچھے اعمال کرنا اور جرائم سے دور رہنا، خواہ اب وہ مسلمان ہو، یہودی ہو یا کسی بھی مذہب کو ماننے والا جنت کا حقدار ہے۔ (سالانہ مجلّہ 'مصعبی' سال 2008۔2009ء ص 15 لاہور)

2۔ کیا موجودہ توریت، زبور اور انجیلیں خدا کی کتابیں ہیں؟

غامدی صاحب موجودہ توریت، زبور اور چاروں انجیلوں کو بھی قابل اعتبار، قابل حجت واستدلال سمجھتے ہیں اور ہر مسلمان کے لیے ان پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ سب خدا کی کتابیں (Word of God) ہیں۔ چنانچہ وہ موجودہ توریت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس (توریت) کی جو روایت (Version) زمانۂ رسالت کے یہود ونصاریٰ کے پاس تھی، قرآن فی الجملہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔"

(میزان، ص 152، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

پھر زبور کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ اس کتاب کا نام ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی...... انجیل کی طرح یہ بھی ایک صحیفۂ حکمت ہے اور خدا کی نازل کردہ ایک کتاب کی حیثیت سے قرآن اس کی تصدیق کرتا ہے۔" (میزان، ص 153، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

پھر انجیل کے بارے میں فرماتے ہیں:

"قرآن جس انجیل پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ سیرت کی ان کتابوں (متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی موجودہ چاروں انجیلوں) میں محفوظ ہے۔" (میزان، ص 153، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اور ان تینوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ سب کتابیں خدا کی کتابیں ہیں۔" (میزان، ص 151، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

ہم سمجھتے ہیں کہ ان کتابوں کے بارے میں غامدی صاحب کا یہ عقیدہ کسی مناظرہ باز پادری کے لیے تو قابل قبول ہوسکتا ہے مگر کسی مسلمان کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ اہل اسلام کا عقیدہ تو یہ ہے کہ سابقہ تمام الہامی کتب اپنے اپنے زمانے میں خاص قوموں کے لیے ہدایت تھیں، پھر یہ محفوظ نہیں رہیں اور نزول قرآن سے قبل ہی دنیا سے ناپید ہوچکی

تھیں اور اب روئے زمین پر صرف اور صرف قرآن مجید ہی اللہ کا کلام اور اس کی کتاب ہے جو محفوظ بھی ہے اور پوری انسانیت کے لیے ہدایت و رہنما بھی۔

سابقہ الہامی کتب کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو ان کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہوگئیں جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔''

(تدبر قرآن، ج7، ص112، طبع 1983ء لاہور)

اسی طرح علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں:

''توریت جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا، پھر مترجموں کی کتر بونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔''

(سیرت النبیؐ، ج4، ص1324)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''انبیاء کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے کہ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب کہ اگلا صحیفۂ وحی جو دین وشریعت کا محافظ تھا، کھو گیا، یا انسانی دست بُرد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہوگئی۔ صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا ناقص خلاصہ تورات کے سفر تکوین میں ہے، صحیفۂ موسیٰ علیہ السلام نازل ہوا، صحیفہ موسیٰ علیہ السلام کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا، چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لیے آیا ہے، اس لیے ہر تحریف اور

انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی ہے اور قیامت تک کی جائے گی، اس لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں ہے۔''

(سیرت النبیؐ ج4، ص313)

3۔ کیا صرف رسولوں کے جھٹلانے والوں پر عذاب آتا ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی غلط اور خلافِ قرآن ہے کہ صرف رسولوں کی تکذیب اور سرکشی کرنے والوں پر ہی عذاب آتا ہے جب کہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ نبیوں کی تکذیب اور سرکشی کرنے والوں پر بھی عذاب آتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں دو مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں۔

1۔ سورۃ الزخرف میں ہے کہ:

﴿وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ ○ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○ فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُم بَطْشًا وَمَضَىٰ مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ○﴾

(الزخرف: 6۔ 8)

''ہم نے پہلی قوموں کے لیے بہت سے نبی بھیجے، مگر کوئی نبی ان کے پاس ایسا نہ آیا جس کا انہوں نے مذاق نہ اڑایا ہو۔ پھر ہم نے ان سب کو جو ان مشرکوں سے زیادہ طاقت ور تھے ہلاک کر دیا اور پہلے والوں کی مثالیں گزر چکی ہیں۔''

2۔ سورۃ الاعراف میں ہے کہ:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّبِيٍّ إِلَّآ أَخَذْنَآ أَهْلَهَا بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ○ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ مَسَّ آبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَأَخَذْنَاهُم بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○﴾ (الاعراف: 94۔ 95)

''اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو اس کے نافرمان باشندوں کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ گڑگڑائیں۔ پھر ہم نے اُن کے دُکھ کو سکھ میں بدل

دیا یہاں تک کہ انہیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے: ''اِس طرح کے دُکھ سکھ ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچ تھے۔'' پھر ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔''

درج بالا دونوں آیات اس پر صریح ہیں کہ نبیوں کو جھٹلانے والوں پر بھی ہمیشہ عذاب آتا رہا ہے اور اس میں رسولوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

لیکن اس حوالے سے غامدی صاحب کے دعاوی دیکھئے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''رسولوں کے بارے میں اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا کی کامل حجت بن کر آتے ہیں۔ وہ آفتابِ نیم روز کی طرح قوم کے آسمان پر چمکتے ہیں، کوئی دانا و بینا کسی دلیل و برہان کی بنا پر ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی حال میں ان کی تکذیب کرنے والوں کے حوالے نہیں کرتا۔ نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی، بارہا ان کے قتل کے در پے ہو جاتی ہے...... لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔

(ماہنامہ اشراق، اگست 1988ء، ص 68 نیز میزان حصہ اول، ص 21 مطبوعہ مئی 1985)

وہ مزید کہتے ہیں:

''نبی اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام ہو سکتا ہے لیکن رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔'' (میزان، حصہ اول، ص 23 مطبوعہ مئی 1985ء)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''رسالت یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے...... چنانچہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت

کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔"

(میزان، ص 69۔70 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اور پھر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

"نبی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام (دنیوی غلبے کے لحاظ سے ہو جائے لیکن رسول بہر حال اپنی قوم پر غالب آتا ہے۔"

(برہان، ص 148، طبع چہارم جون 2006ء)

لیکن نبی اور رسول کا یہ فرق قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن مجید ہی سے ثابت ہے کہ بعض انبیاء بھی قتل ہوئے ہیں اور رسولوں کا قتل ہونا بھی قرآن مجید کی درج ذیل آیات سے ثابت ہے، دیکھئے البقرۃ: 87، المائدۃ: 70 اور آل عمران 183۔

پھر جس طرح رسولوں کو جھٹلانے والوں پر عذاب آیا ہے اسی طرح نبیوں کے جھٹلانے والوں پر بھی عذاب آتا رہا ہے۔

4۔ نزول عیسیٰ علیہ السلام کے عقیدے کا انکار

قرآن مجید میں سیدنا علیہ السلام ابن مریم علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے اور قربِ قیامت میں ان کے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کے کچھ اشارات ملتے ہیں (ملاحظہ ہو سورہ آل عمران آیت 55، سورہ النساء آیت 159، سورہ الزخرف آیت 61)

پھر صحیح احادیث میں، جو ایک درجن سے زیادہ صحابہ کرام سے مروی ہیں اور جن کو تلقی بالقبول کی وجہ سے تواتر کا درجہ حاصل ہے، یہ بتایا گیا ہے کہ قیامت سے پہلے آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا اور وہ دجال کو قتل کریں گے۔ انہی صحیح احادیث کی بنیاد پر اس عقیدے پر اجماع امت ہے۔

لیکن غامدی صاحب قادیانیوں اور پرویزیوں کی طرح مسلمانوں کے اس مسلمہ عقیدے کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک جلیل القدر پیغمبر (علیہ السلام) کے زندہ آسمان سے نازل ہو جانے کا واقعہ کوئی معمولی

واقعہ نہیں ہے۔ لیکن موقع بیان کے باوجود اس واقعے کی طرف کوئی ادنیٰ اشارہ بھی قرآن کے بین الدفتین کسی جگہ مذکور نہیں ہے۔ علم وعقل اس خاموشی پر مطمئن ہو سکتے ہیں؟ اسے باور کرنا آسان نہیں ہے۔" (میزان، ص178، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

چونکہ غامدی صاحب احادیث کو دین کا حصہ تسلیم نہیں کرتے اس لیے اُن کی طرف سے نزول مسیح علیہ السلام کے عقیدہ کو نہ ماننا قابل فہم ہے۔

تاہم اس سلسلے میں ذیل میں چند ایسی احادیث پیش کی جاتی ہیں جو عقیدۂ نزولِ مسیح علیہ السلام کی بنیاد ہیں۔

1۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ لَيُوْشِكَنَّ اَنْ يَنْزِلَ فِيكُمُ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلاً فَيَكْسِرُ الصَّلِيْبَ وَيَقْتُلُ الْخِنْزِيْرَ وَيَضَعُ الْجِزْيَةَ وَيَفِيْضُ الْمَالُ حَتّٰى لَا يَقْبَلَهٗ اَحَدٌ حَتّٰى تَكُوْنَ السَّجْدَةُ الْوَاحِدَةُ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا .

(صحیح بخاری، رقم 3448، صحیح مسلم، رقم 389-390 ترمذی، رقم 2233)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، عنقریب ابن مریم عیسیٰ علیہ السلام تمہارے درمیان ایک عادل حاکم کے طور پر نازل ہوں گے۔ وہ صلیب توڑ دیں گے۔ خنزیر کو مار ڈالیں گے۔ جزیہ ختم کر دیں گے۔ مال کی اتنی ریل پیل ہوگی کہ اُسے لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ ایک سجدہ دنیا اور اُس کی ہر چیز سے بہتر ہوگا۔"

2۔ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ ابْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔

(صحیح بخاری، رقم 3449، صحیح مسلم، رقم 391-293)

"تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے درمیان ابن مریم علیہ السلام اُتریں گے اور تمہارا امام خود تم میں سے ہوگا۔"

3۔ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ......
فَيَنْزِلُ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فَيَقُوْلُ اَمِيْرُهُمْ: تَعَالَ فَصَلِّ لَنَا۔ فَيَقُوْلُ: لَا،
اِنَّ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ اُمَرَاءُ تَكْرِمَةَ اللّٰهِ هٰذِهِ الْاُمَّةَ۔

(صحیح مسلم، رقم 395)

''حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول ﷺ سے سُنا کہ...... پھر عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر اُن سے کہے گا، آیئے آپ نماز پڑھایئے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ایک دوسرے کے امیر ہو۔ یہ وہ اس عزت کا لحاظ رکھتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس امت کو دی ہے۔''

مذکورہ بالا صحیح احادیث کی بنیاد پر اس پر اجماعِ امت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب آسمان سے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ آپ کا یہ نزول بھی قیامت کی خاص نشانیوں میں سے ہے، وہ دنیا میں آ کر صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو مار ڈالیں گے، جزیہ ختم کر دیں گے (کیونکہ غیر مسلم کوئی نہ ہوگا) اور دجال کو قتل کریں گے، اس وقت مال و دولت کی فراوانی ہوگی۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگی تو ان کو مدینہ منورہ میں روضۂ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دفن کیا جائے گا۔

5۔ کیا کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا؟

غامدی صاحب نے نبی اور رسول کے درمیان منصب اور درجے کے لحاظ سے فرق و امتیاز کی بحث کرتے ہوئے یہ نکتہ آفرینی بھی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کو تو اُن کی قوم بعض اوقات قتل بھی کر دیتی رہی ہے مگر کسی قوم کے ہاتھوں کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ غامدی صاحب اس امر کو ایک اُصول، ایک عقیدہ اور قانونِ الٰہی قرار دیتے ہیں کہ نبی کے لیے وفات پانے یا قتل ہونے کی دونوں صورتیں تو ممکن ہیں مگر رسول کبھی قتل نہیں ہوسکتا۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''رسولوں کے بارے میں اس اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر خدا

کی کامل حجت بن کر آتے ہیں۔ وہ آفتاب نیم روز کی طرح قوم کے آسمان پر چمکتے ہیں۔ کوئی دانا و بینا کسی دلیل و برہان کی بنا پر اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کسی حال میں ان کی تکذیب کرنے والوں کے حوالے نہیں کرتا۔ نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی، بارہا اُن کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے اور ایسا ہوا بھی ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے...... لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون اس سے مختلف ہے۔''

(ماہنامہ ''اشراق'' اگست 1988، صفحہ 68، نیز ''میزان'' حصہ اوّل، صفحہ 21، مطبوعہ مئی 1985)

پھر مزید فرماتے ہیں:

''نبی اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام ہو سکتا ہے لیکن رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔'' (میزان حصہ، صفحہ 23، مطبوعہ مئی 1985ء)

وہ مزید لکھتے ہیں:

''رسالت یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر فائز کوئی شخص اپنی قوم کے لیے اس طرح خدا کی عدالت بن کر آئے کہ اس کی قوم اگر اسے جھٹلا دے تو اس کے بارے میں خدا کا فیصلہ اسی دنیا میں اس پر نافذ کر کے وہ حق کا غلبہ عملاً اس پر قائم کر دے...... چنانچہ اللہ تعالیٰ ان رسولوں کو غلبہ عطا فرماتے اور ان کی دعوت کے منکرین پر اپنا عذاب نازل کر دیتے ہیں۔

(میزان، ص 69۔70 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اور مزید لکھتے ہیں کہ:

''نبی ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کے مقابلے میں ناکام (دنیوی غلبے کے لحاظ سے) ہو جائے لیکن رسول بہر حال اپنی قوم پر غالب آتا ہے۔''

(برہان، ص 148، طبع چہارم جون 2006ء)

مگر غامدی صاحب کی یہ نکتہ طرازی بالکل غلط ہے اور خود قرآنِ مجید کے نصوص اور
ضح احکام کے خلاف ہے۔ قرآنِ مجید کی اکثر آیات اس قدر واضح اور صریح انداز میں
عبارۃ النص کے طریقے پر) اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ انبیائے کرام کی طرح رسولوں کا
ں ہو جانا بھی ایک امرِ واقعہ ہے۔ نبی اور رسول کے درمیان کچھ فرق و امتیاز درست سہی مگر
ں یا عدمِ قتل کا معاملہ اُن کے درمیان ہرگز فرق و امتیاز نہیں رکھتا۔

ر آنِ مجید کے نصوص:

قرآنِ مجید کے جن نصوص کی بنیاد پر ہم اس ''نئے عقیدے'' اور اس ''نرالے اُصول
ین'' کو غلط قرار دیتے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح حضرت محمد ﷺ
کے لیے بھی وفات پانے یا قتل ہو جانے کی دونوں صورتوں کا امکان موجود ہے۔ گویا
آپ ﷺ کو طبعی موت بھی آ سکتی ہے اور آپ ﷺ مقتول بھی ہو سکتے ہیں:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا﴾ (آل عمران: 144)

''اور محمدؐ تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پس
اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور
جو کوئی بھی اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔''

2۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے فرمایا گیا کہ:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ﴾ (البقرۃ: 87)

''تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو تمہارے نفس کو
پسند نہ آئی تو تم نے تکبر کی راہ اختیار کی۔ پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم قتل

کرتے تھے۔‘‘

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں کئی رسول قتل ہوئے تھے۔

3۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا کہ:

﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ﴾ (المائدۃ: 70)

’’بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لایا جو اُن کو پسند نہ آئی تو بعض کو وہ جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر ڈالتے تھے۔‘‘

اس آیت سے بھی صریح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کئی رسولوں کو قتل کیا تھا۔

4۔ سورۂ آل عمران میں بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

(آل عمران: 183)

’’یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپؐ کہہ دیجیے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کئی رسول آئے، نشانیاں لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو، پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ اگر تم سچے ہو۔‘‘

اس مقام پر بنی اسرائیل کے بارے میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے رسول پر ایمان نہ لائیں جو ان کے

سامنے نیاز یا قربانی کو آسمانی آگ سے نہ جلا دکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کا یہ جواب دیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ اگر یہی بات ہے تو جو رسول اور پیغمبر اُن کے پاس دلائل اور مذکورہ معجزہ بھی لاتے رہے، اُن کی اُنھوں نے تکذیب کیوں کی تھی اور ان میں سے بعض کو قتل کیوں کیا تھا؟

قرآنِ مجید کے یہ واضح نصوص ہیں جن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی طرف رسول بھی بعض اوقات اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اُنہوں نے بہت سے رسولوں کو نہ صرف جھٹلایا تھا بلکہ اُن کو قتل کر بھی ڈالا تھا۔ مذکورہ دلائل و براہین کے بعد یہ دعویٰ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قانونِ الٰہی یہی رہا ہے کہ کبھی کوئی رسول کسی قوم کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا؟

اصل میں زمانۂ حال کے بعض لوگوں کو جن آیات کی بنا پر یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوسکتا وہ درج ذیل آیات ہیں:

1۔ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

(المجادلۃ: 21)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے، بے شک اللہ قوت والا غالب ہے۔''

2۔ ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ﴾ (الصافات: 171۔ 172)

''اور ہم اپنے بھیجے ہوئے بندوں (رسولوں) سے پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ بے شک انہیں ہماری مدد حاصل ہوگی، اور ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

لیکن ان آیات کی تشریح میں مفسرین حضرات نے اپنی اپنی تفاسیر مثلاً الکشاف، قرطبی، ابن کثیر، روح المعانی اور فتح القدیر وغیرہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل و حجت کے موقع ہر رسول ہمیشہ غالب رہتا ہے اور میدانِ جنگ میں مقابلے کے وقت

بھی غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔ ان آیات سے یہ معنی نکالنا ہرگز درست نہیں کہ وہ عام حالات میں قتل نہیں ہوسکتا کیونکہ ایسا دعویٰ خود قرآن مجید کے دوسرے واضح نصوص، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن کے بیانات میں تضاد یا تناقض نہیں ہوسکتا۔

6۔ تکفیر یعنی کسی کو کافر قرار دینے کا مسئلہ

غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ صرف پیغمبر ہی کسی شخص یا گروہ کی تکفیر کرسکتا ہے اور کسی غیر نبی عالم، فقیہ یا مفتی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص یا گروہ کو کافر قرار دے۔

چنانچہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے غامدی صاحب فرماتے ہیں:

"کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے...... یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں۔"

(ماہنامہ اشراق، دسمبر 2000ء ص 54۔55 لاہور)

لیکن غامدی صاحب کی یہ رائے بالکل غلط اور بے اصل ہے۔ خلفائے راشدین سے لے کر آج تک ایسے لوگوں کی ہمیشہ تکفیر کی گئی ہے جو ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک اَمر کا بھی انکار کرتے رہے ہیں۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مدعیانِ نبوت اور مانعین زکوٰۃ کو کافر قرار دے کر اُن کے خلاف جہاد کیا تھا، ماضی قریب میں امت مسلمہ نے اجماعی طور پر جھوٹے مدعیٔ نبوت مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو کافر قرار دیا تھا۔ متحدہ پاکستان کے قریباً ایک ہزار علمائے کرام نے غلام احمد پرویز کو کافر قرار دیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نے اپنے گمراہ کن عقائد و نظریات کے پیشِ نظر خود تکفیر کی زد سے بچنے کے لیے تکفیر ہی کا انکار کر دیا ہے جب کہ کتبِ عقائد میں لکھا ہے کہ جو کافر کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔



باب 2:

قرآنیات

1۔ کیا قرآن مجید کی صرف ایک ہی متواتر قراءت ہے؟

اہل علم کا اِس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ (سبعہ یا عشرہ) قراءتیں ہیں مگر غامدی صاحب قرآن کی ان متواتر قراءتوں کے منکر ہیں۔ وہ صرف ایک ہی قراءت کو درست مانتے ہیں اور اس ایک قراءت کو وہ قراءت عامہ کا نام دیتے ہیں جو دراصل قراءت حفص ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام قراءتوں کو وہ قطعیت کے ساتھ عجم کا فتنہ قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قراءت ہے جو ہمارے مصاحف میں ثبت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی جو قراءتیں تفسیروں میں لکھی ہوئی ہیں یا مدرسوں میں پڑھی اور پڑھائی جاتے ہیں، یا بعض علاقوں میں لوگوں نے اختیار کر رکھی ہیں، وہ سب اسی فتنۂ عجم کی باقیات ہیں جن کے اثرات سے ہمارے علوم کا کوئی شعبہ، افسوس ہے کہ محفوظ نہ رہ سکا۔''

(میزان، ص 32، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور، اصول ومبادی: ص 32، طبع دوم، فروری 2005ء لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں امت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری

قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔"

(میزان: ص 27، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور، اصول ومبادی، 29، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

اور آخر میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

"قرآن کا متن اس (ایک قراءت) کے علاوہ کسی دوسری قراءت کو قبول نہیں کرتا۔"

(میزان: 29 طبع سوم، مئی 2008ء لاہور، اصول ومبادی: 29، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کی رائے میں:

1۔ قرآن مجید کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے۔

2۔ قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے۔

3۔ امتِ مسلمہ کی عظیم اکثریت جس قراءت کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہی ہے صرف وہی قرآن ہے۔

4۔ قرآن کا متن صرف ایک ہی قراءت کو قبول کرتا ہے۔

اب ہم ان تمام اُمور کا علمی جائزہ لیں گے:

1..... کیا قرآن مجید کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہرگز صحیح نہیں کہ قرآن مجید کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے اور یہ کہ باقی سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں، کیونکہ اس پر پوری امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ (سبعہ عشرہ) قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں اور اس کے حسب ذیل دلائل ہیں:

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام قرآن مجید کو ایک سے زیادہ طریقوں اور لہجوں میں پڑھا کرتے تھے اور ایسی سب قراءتیں درست اور جائز ہیں۔ اس سلسلے میں چند احادیث ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

1۔ ((عن عمر بن الخطاب يقول: سمعت هشام بن حكيم بن حزام يقرأ سورة الفرقان على غير ما أقرأها، وكان رسول

الله ﷺ أقر أنيها، فكدت أن أعجل عليه، ثم أمهلته حتى انصرف، ثم لببته بردائه، فجئت به رسول الله ﷺ، فقلت: يا رسول الله ﷺ! إني سمعت هذا يقرأ سورة الفرقان على غير ما اقراتنيها، فقال رسول الله ﷺ: أرسله "إقرأ" فقرأ القراءة التي سمعته يقرأ، فقال رسول الله ﷺ: هكذا انزلت، ثم قال لي "إقرأ" فقرأت، فقال: هكذا انزلت، إن هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف، فاقرءوا ما تيسر منه))

(صحيح البخاری: 2419، صحیح مسلم: 1899)

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ایک دفعہ) میں نے حضرت ہشام بن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کو سورۂ فرقان اس سے مختلف طریقے پر پڑھتے سنا جس پر میں پڑھتا تھا، حالانکہ سورۂ فرقان مجھے خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ قریب تھا کہ میں غصے سے ان پر جھپٹ پڑتا، مگر میں نے (صبر کیا) اور انہیں مہلت دی، یہاں تک کہ انہیں نے اپنی قراءت مکمل کر لی۔ پھر میں نے ان کی چادر پکڑی اور انہیں کھینچتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اسے سورۂ فرقان اس سے مختلف طریقے پر پڑھتے سنا ہے، جس پر آپ ﷺ نے پڑھائی تھی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہیں چھوڑ دو، پھر حضرت ہشام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم پڑھو۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ فرقان اس طرح پڑھی جس طرح میں نے ان کو پہلے پڑھتے سنا تھا۔ ان کی قراءت سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسی طرح اتری ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ تم پڑھو۔ چنانچہ میں نے (اپنے طریقے پر) پڑھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسی طرح اتری ہے۔ پھر مزید فرمایا کہ یہ قرآن سات حرفوں (سبعہ احرف) پر نازل ہوا ہے، لہٰذا جس طرح

سہولت ہو، اس طرح پڑھو۔"

2۔ ((عن ابی بن کعب قال: لقی رسول اللہ ﷺ جبریل، فقال: یا جبریل، إنی بعثت إلی أمة امیین منھم العجوز، والشیخ الکبیر، والغلام والجاریة، والرجل الذی لم یقرأ کتابا قط، قال: یا محمد! إن القرآن أنزل علی سبعة أحرف .))

(سنن ترمذی: 2944)

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جبرائیل سے رسول اللہ ﷺ ملے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: اے جبرائیل! مجھے ایسی امت کی طرف بھیجا گیا ہے جو اَن پڑھ ہے۔ پھر ان میں سے کوئی بوڑھا ہے، کوئی بہت بوڑھا، کوئی لڑکا ہے کوئی لڑکی اور کوئی ایسا آدمی ہے جس نے کبھی کوئی تحریر (کتاب) نہیں پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے مجھے جواب دیا کہ اے محمد ﷺ! قرآن سات حرفوں (سبعہ احرف) پر اترا ہے۔"

3۔ ((عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال: ((أقرانی جبریل علیہ السلام علی حرف، فراجعته، فلم أزل أستزیده فیزیدنی، حتی إنتھی، إلی سبعة أحرف، قال ابن شھاب: بلغنی ان تلك السبعة الأحرف إنما ھي فی الامر الذی یکون واحدا، لا یختلف في حلال ولا حرام))

(صحیح البخاری: 3219، صحیح مسلم: 1902)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جبرئیل نے پہلے مجھے قرآن مجید ایک حرف کے مطابق پڑھایا۔ پھر میں نے کئی بار اصرار کیا اور مطالبہ کیا کہ قرآن مجید کو دوسرے حروف (Versions) کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ وہ مجھے یہ اجازت دیتے گئے یہاں

تک کہ سات حرفوں (سبعہ احرف) تک پہنچ گئے۔"

اس روایت کے راوی امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ سات حروف، جن کے مطابق پڑھنے کی اجازت دی گئی تھی، ایسے تھے کہ وہ تعداد میں سات ہونے کے باوجود گویا ایک ہی حرف تھے۔ ان کے مطابق پڑھنے سے حلال وحرام کا فرق واقع نہیں ہو جاتا تھا۔

4۔ ((عن ابن مسعود قال: سمعت رجلا قرأ آية، وسمعت النبي ﷺ يقرأ خلافها، فجئت به النبي ﷺ فاخبرته فعرفت في وجهه الكراهية وقال: ((كلاكما محسن فلا تختلفوا فإن من كان قبلكم اختلفوا فهلكوا)) (صحيح البخاری: 3476)

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن پڑھتے سنا جب کہ اس سے پہلے میں نے نبی ﷺ کو اس سے مختلف طریقے پر پڑھتے سنا تھا۔ میں اس آدمی کو نبی ﷺ کی خدمت میں لے گیا اور آپ ﷺ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو میری بات ناگوار گزری ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو۔ آپس میں اختلاف نہ کرو، کیونکہ تم سے پہلے جو قومیں ہلاک ہوئیں، وہ اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔"

5۔ عن شهر بن حوشب قال: سألت ام سلمة كيف كان رسول الله ﷺ يقرأ هذه الآية: ﴿إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ فقالت قرأها: اِنَّهُ عَمِلَ غَيْرَ صَالِحٍ)) (سنن ابوداود: 3983)

"شہر بن حوشب کہتے ہیں کہ میں نے ام المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ درج ذیل آیت "إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ" (ھود:46) (قرآنی الفاظ) کو کیسے پڑھتے تھے؟ تو انہوں نے بتایا کہ آپ ﷺ نے اس

طرح پڑھا ہے کہ: اِنَّهُ عَمِلَ غَيْرَ صَالِحٍ۔“

6۔ ((عن عائشة قالت: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُهَا: ﴿فَرُوْحٌ وَّرَيْحَانٌ﴾ (الواقعة: 89) (سنن ابو داؤد: 3991، سنن ترمذی: 2983)

”سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح قراءت کرتے سنا کہ فَرُوْحٌ وَّرَيْحَانٌ۔(الواقعہ: 89) (یاد رہے کہ فَرُوْحٌ کو قراءتِ حفص میں فَرَوْحٌ پڑھا گیا ہے)۔“

اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف چند احادیث بیان کر دی ہیں اور ان سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن مجید کی ایک سے زیادہ قراءتیں ہیں۔

پھر معتبر کتب احادیث میں ایسے ابواب موجود ہیں جو ایک سے زیادہ قراءتوں کو ثابت کرتے ہیں۔ جیسے صحیح بخاری میں 'کتاب فضائل القرآن' کے تحت 'باب انزل القرآن علی سبعة احرف'، صحیح مسلم میں 'کتاب فضائل القرآن' کا 'باب القراء ات' سنن ابی داوٗد میں 'کتاب الحروف والقراء ات' اور جامع ترمذی میں 'ابواب القراء ات'۔

ان احادیث صحیحہ اور قراءتوں کے ابواب سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کو مختلف لہجات کے مطابق پڑھنے کی اجازت تھی جو دراصل ایک ہی عربی زبان کے الفاظ کے مختلف تلفظ (Pronunciations) تھے جو دنیا کی ہر زبان میں پائے جاتے ہیں۔

کتب تفاسیر:

ہر زمانے میں تفسیر کی کوئی معتبر کتاب ایسی نہیں جس میں ایک سے زیادہ قراءتوں (سبعہ وعشرہ) کو صحیح نہ مانا گیا ہو۔ اس سلسلے میں چند مشہور تفاسیر کے حوالے ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

1۔ تفسیر الکشاف از علامہ محمود زمخشری (م 538ھ)

مشہور ماہر لغت علامہ زمخشری بھی قرآن کی ایک سے زیادہ قراءتوں کے قائل تھے۔

چنانچہ ایک مقام پر وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

((قری ء "ملك یوم الدین" مٰلِكِ، وَمَلِكِ"، "مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ میں ملك کو مٰلِكِ بھی پڑھا گیا ہے اور مَلِكِ بھی۔))

(تفسیر الکشاف، تفسیر سورۃ فاتحہ: 56/1، طبع مصر)

یاد رہے کہ علامہ زمخشری کو غامدی صاحب اور ان کے استاد بھی لغت کا امام مانتے ہیں۔

2۔ تفسیر ابن کثیر از حافظ ابن کثیر۔ (م 774ھ)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی مشہور اور مقبول ترین تفسیر میں متعدد قراءتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ فاتحہ کی درج ذیل آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"مَلِك یوم الدین" قرا بعض القراء (مَلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ) وقرأ آخرون (مٰلِكِ) وکلاھما صحیح متواتر فی السبع"

(تفسیر القرآن العظیم، تفسیر سورۃ الفاتحہ: 64/1، طبع بیروت 1400ھ)

3۔ مجمع البیان فی تفسیر القرآن از ابوعلی طبرسی (چھٹی صدی ہجری کی معتبر شیعہ تفسیر) میں مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

((قرأ عاصم والکسائی وخلف ویعقوب الحضرمی ملك بالالف والباقون ملك بغیر الف))

(مجمع البیان، تفسیر الفاتحہ: 23/1، طبع قم، ایران)

"عاصم، کسائی، خلف اور یعقوب حضرمی نے اسے مٰلِكِ اور باقی قراء نے اسے مَلِكِ پڑھا ہے۔"

4۔ فتح القدیر از امام شوکانی (م 1250ھ)

(ملك یوم الدین) قرء مَلِكِ، ومٰلِكِ......

(فتح القدیر، تفسیر الفاتحۃ: 20، طبع الریاض 1422ھ)

(مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْن) میں مَلِكِ کو مٰلِكِ اور مَلِكِ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔"

ز۔ تفسیر مراغی از احمد مصطفٰی مراغی مصری۔

"(ملك يوم الدين) قرأ بعض القراء مٰلِكِ، وبعض آخر مَلِكِ"

(تفسیر مراغی یا تفسیر الفاتحۃ: 1/ 831 طبع بیروت)

(مٰـلِكِ يَـوْمِ الدِّيْنِ) میں مٰلِكِ کو بعض قراء نے مٰلِك اور بعض دوسروں نے مَلِكِ پڑھا ہے۔"

کتب علوم القرآن:

علوم القرآن سے متعلق کتب میں بھی قراءتوں کے اختلاف کو درست تسلیم کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر سب سے ضخیم اور مستند کتاب 'البرھان فی علوم القرآن' ہے جسے امام بدر الدین زرکشی رحمہ اللہ نے مرتب کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کی مختلف متواتر قراءتوں پر بحث کرتے ہوئے درج ذیل عنوان قائم کیا ہے:

((النوع الثالث والعشرون: "معرفة توجيه القراءات وتبيين وجه ما ذهب اليه كل قارىء)) (البرھان: 339/1، طبع 1391ھ بیروت)

اسی طرح المفردات از امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ جو کہ بنیادی طور پر قرآنی لغت کی مستند کتاب ہے تاہم اس میں علوم القرآن کی بعض بحثیں بھی موجود ہیں، میں بھی ایک سے زیادہ قراءتوں (سبعہ وعشرہ) کو صحیح مانا گیا ہے اور ان کے مطابق لغوی تشریحات کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید کے ایک مقام کے بارے میں امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

"﴿تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ﴾ (المومنون:20) قرئ بالفتح والكسر"

(مفردات از امام راغب اصفہانی، تحت مادہ 'سین': 439، طبع 1416ھ دمشق)

"یعنی اس میں سَیْنَاءَ کو سِیْنَاءَ بھی پڑھا گیا ہے۔"

معتبر عربی لغات:

عربی زبان کے انتہائی معتبر اور مستند لغت 'لسان العرب' میں بھی ایک سے زیادہ قراءتوں (سبعہ، عشرہ) کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس کا ایک مقام ملاحظہ ہو:

((وفي التنزيل: ملك يوم الدين: قرأ ابن كثير ونافع وابو عمرو وابن عامر وحمزة: مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بغير الف ، وقرأ عاصم والكسائي ويعقوب مٰلِكِ بالف)) (لسان العرب: ابن منظور، تحت ماده، ملك)

''تنزیل یعنی قرآن مجید میں ہے: مٰلك يوم الدين اسے ابن کثیر، نافع، ابوعمرو، ابن عامر اور حمزہ نے مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْن الف کے بغیر پڑھا ہے، جب کہ عاصم، کسائی اور یعقوب نے اسے مٰلِكِ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔''

مدارس و جامعات میں تدریس:

صدیوں سے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے مدارس اور جامعات میں قرآن مجید کی ایک سے زیادہ قراءتیں (سبعہ وعشرہ) پڑھائی جا رہی ہیں جہاں اہل علم اور مقری حضرات ان کی تدریس میں مشغول رہتے ہیں تو کیا یہ سب علمائے اسلام دین سے ناواقف ہیں؟ ہاں البتہ وہ غامدی صاحب جیسے متجدد اور منکر حدیث کی طرح 'میں نہ مانوں' کی گردان کرنے سے اور 'ایک ہی قراءت کی رٹ لگانے' سے ضرور قاصر ہیں۔

قاری اور مقری میں فرق:

اہل علم جانتے ہیں کہ کسی ایک قراءت کے ماہر کو قاری اور کئی قراءتوں (سبعہ وعشرہ) کے ماہر کو مقری کہا جاتا ہے۔ آج بھی امت مسلمہ میں سینکڑوں ہزاروں مقری ہیں۔ خود ہمارے وطن پاکستان میں بھی درجن بھر مستند مقری موجود ہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی ایک سے زیادہ قراءتیں ثابت ہیں۔

ملک فہد کمپلیکس:

عالم اسلام کے مرکز سعودی عرب کے مجمع الملک فہد (مدینہ منورہ) کی طرف سے علمائے دین کی زیر نگرانی مختلف قراءتوں (ورش، دوری، قالون وغیرہ) کے مطابق لاکھوں کی تعداد میں مصاحف طبع کر کے متعلقہ مسلمان ممالک کی طرف بھیجے جاتے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ امت مسلمہ میں مختلف قراءتوں کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے۔

عجم کے فتنے کے باقیات کون؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ ''ایک قراءت کے سوا باقی تمام قراءتیں عجم کے فتنے کی باقیات ہیں۔''

غالبًا یہ حربہ انہوں نے جناب پرویز صاحب سے سیکھا ہے جو تمام احادیث کو عمر بھر عجمی سازش کا نتیجہ قرار دیتے رہے۔ اب انہی کے انداز میں غامدی صاحب نے بھی قرآن مجید کی ایک قراءت کے سوا باقی سب قراءتوں کو عجم کا فتنہ قرار دے ڈالا ہے۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس 'قراءتِ حفص' کو وہ 'قراءت عامہ' کا جعلی نام دے کر صحیح مان رہے ہیں وہ دراصل امام عاصم بن ابی النجود رحمہ اللہ کی قراءت ہے جس کو امام حفص نے ان سے روایت کیا ہے اور خود امام عاصم ابن ابی النجود عربی النسل نہیں بلکہ عجمی النسل تھے۔ چنانچہ امام بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب البرہان فی علوم القرآن میں پہلے سبعہ قراء (سات مشہور قراء حضرات) کے یہ نام لکھے ہیں:

1۔ عبداللہ بن کثیر رحمہ اللہ (م120ھ)

2۔ نافع بن عبدالرحمٰن رحمہ اللہ (169ھ)

3۔ عبداللہ بن عامر رحمہ اللہ (118ھ)

4۔ ابوعمرو بن علاء رحمہ اللہ (م154ھ)

5۔ عاصم بن ابی النجود رحمہ اللہ (م128ھ)

6۔ حمزہ بن حبیب رحمہ اللہ (م156ھ)

7۔ علی بن حمزہ الکسائی رحمہ اللہ (م189ھ)

((ولیس فی ہؤلاء السبعة من العرب الا ابن عامر وابو عمرو)) (البرھان فی علوم القرآن از زرکشی : 329/1، طبع بیروت)

''اور ان ساتوں میں سوائے ابن عامر اور ابوعمر کے کوئی بھی عربی النسل نہیں۔''

اب غامدی صاحب اگر عربی النسل قراء کی قراءتوں کو عجم کا فتنہ کہہ کر ان کا انکار کر سکتے

ہیں تو وہ ایک عجمی قاری کی قراءت (امام عاصم کی قراءت جس کی روایت امام حفص نے کی ہے اور جسے غامدی صاحب 'قراءتِ عامہ' کا نام دے کر صحیح مانتے ہیں) کو کس دلیل سے صحیح مانتے ہیں؟ اگر عربی قراءتیں محفوظ نہیں رہیں اور عجم کے فتنے کا شکار ہوگئی ہیں تو ایک عجمی قراءت عجم کے فتنے سے کیسے محفوظ رہ گئی؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ متواتر قراءتیں عجم کا فتنہ نہیں ہیں بلکہ غامدی صاحب خود عجم کا فتنہ ہیں۔

کیا قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے۔ غالبًا وہ قرآن اور مصحف کا فرق نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب قرآن کو رسم الخط کی شکل میں لکھا جاتا ہے تو وہ مصحف کہلاتا ہے۔ لیکن اصل قرآن وہ ہے جو ایک مستند حافظ یا قاری کے سینے میں محفوظ ہوتا ہے اور وہ زبانی طور پر اس کی تلاوت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ (العنکبوت: 49)

"بلکہ یہ (قرآن) ایسی واضح آیتیں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جن کو علم عطا ہوا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ جب کسی مصحف کی تیاری میں کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں تو ان کی نشاندہی اور اصلاح کا کام بھی کوئی مستند حافظ یا قاری سرانجام دیتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ قرآن کی حفاظت کا اصل دارومدار اس کے حفظ و قراءت پر ہے نہ کہ لکھے ہوئے اور ثبت شدہ مصاحف پر۔

پھر اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن مجید تحریری شکل میں نازل نہیں ہوا ہے بلکہ وقفے وقفے سے جبرئیل علیہ السلام نے نبی اُمی ﷺ کو پڑھ کر سنایا جسے آپ ﷺ نے حفظ فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے لوگوں کو زبانی سنایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے سن کر اسے حفظ کیا۔ یہی سلسلۂ حفظ و قراءت جسے اصلاح میں تلقی کہا جاتا ہے نسل در نسل چلا آ رہا ہے۔

اس کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے احتیاطاً یہ اہتمام بھی کیا کہ قرآن کو مصحف کی صورت میں بغیر نقاط اور اعراب کے امت کو منتقل کر دیا جسے کسی مستند قاری کے بغیر پڑھنے کی ممانعت تھی۔ کیونکہ بغیر استاد کے کسی بھی زبان کی عبارت کا صحیح تلفظ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ خود نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے کچھ نسخے (مصاحف) لکھوا کر لوگوں میں تقسیم کر دیئے ہوں کہ ان میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قرآن ثبت ہے اسے پڑھو، سمجھو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

3۔ کیا امت مسلمہ کی عظیم اکثریت جس قراءت کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہی ہے صرف وہی قرآن ہے؟

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کی عظیم اکثریت جس قراءت کے مطابق قرآن کی تلاوت کر رہی ہے صرف وہی قرآن ہے۔ عظیم اکثریت کی بنا پر قرآن کی ایک ہی قراءت ہونے کا دعویٰ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ دنیائے اسلام میں چونکہ حنفی فقہ کے پیروں کاروں کی عظیم اکثریت ہے لہٰذا صرف فقہ حنفی ہی صحیح اسلامی فقہ ہے اور باقی تمام فقہیں فتنۂ عجم کی باقیات ہیں۔ ظاہر ہے ایسا دعویٰ صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو احمق ہو، یا انتہائی درجے کا متعصب ہو، یا پھر فتنہ پرور ہو۔

پھر کیا اس طرح کا دعویٰ کر کے غامدی صاحب پورے شمالی افریقہ کے درجن بھر ممالک کے ان کروڑوں مسلمانوں کی تکفیر کا ارتکاب نہیں کر رہے جو دوسری متواتر قراءتوں کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں؟ کیونکہ یہ افریقی مسلمان غامدی صاحب کے فتویٰ کی رو سے جب غیر قرآن کو قرآن مانتے ہیں تو لامحالہ کافر ٹھہرتے ہیں۔ غور کیجئے غامدی صاحب کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچ رہی ہے؟

4۔ کیا قرآن کا متن ایک قراءت کے سوا کسی دوسری قراءت کو قبول نہیں کرتا؟

اب ہم غامدی صاحب کے موقف کے اس نکتے پر بحث کریں گے کہ کیا قرآن کا متن ایک قراءت کے سوا کسی دوسری قراءت کو قبول نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے متن

میں تمام قراءات متواترہ کی گنجائش موجود ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ موجودہ مصاحف کے قرآنی الفاظ رسم عثمانی کے مطابق لکھے گئے ہیں۔ اس رسم الخط کی خوبی اور کمال یہی ہے کہ اس میں تمام قراءات متواترہ (سبعہ بلکہ عشرہ) کے پڑھنے کا امکان موجود ہے اور یہ ساری قراءتیں اس ایک متن میں سما جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ کی آیت ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کو لیجئے۔ اسے رسم عثمانی (بغیر اعراب اور نقطوں کے) میں یوں لکھا گیا تھا:

﴿ ملك ىوم الدىں ﴾

اس آیت میں لفظ مٰلك کو مٰلِكِ اور مَلِكِ دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہے اور یہ دونوں قراءتیں متواترہ ہیں۔ قراءت حفص میں اسے مٰلِكِ (میم پر کھڑی زبر) اور قراءت ورش میں اسے مَلِكِ (میم پر زبر) کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ حجاز میں یہ دونوں الفاظ ایک ہی مفہوم کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ یعنی روزِ جزا کا مالک یا روزِ جزا کا بادشاہ۔ بادشاہ بھی اپنے علاقے کا مالک ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے نظائر سے بھی ان دونوں مفاہیم کی تائید ملتی ہے۔ اس طرح قراءات کا یہ اختلاف اور تنوع قرآن مجید کے رسم عثمانی میں موجود ہے۔

اب مذکورہ لفظ ملك کے رسم عثمانی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ غامدی صاحب کی رائے کے برعکس اس قرآنی لفظ کا متن قراءت ورش (مــــلك) کو زیادہ قبول کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں قراءت حفص کو کم قبول کرتا ہے۔ پہلی قراءت (ورش) میں اسے بغیر کسی تکلیف کے مـلك کو مَـلِكِ پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دوسری قراءت (حفص) میں اسے تھوڑے سے تکلف (کھڑا زبر) کے ساتھ مٰلِكِ پڑھا جاتا ہے۔

پہلی دلیل: اس کی پہلی دلیل یہ ہے کہ یہی لفظ جب سورۃ الناس میں آتا ہے تو رسم عثمانی کے مطابق اس طرح آتا ہے: ﴿ملك الىاس﴾ اور سب اسے ﴿مَلِكِ النَّاسِ﴾ پڑھتے ہیں جو کہ متن کے بالکل قریب ایک صحیح قراءت ہے اور اسے کوئی بھی مٰلِكِ (کھڑی زبر کے ساتھ) نہیں پڑھتا۔ لہٰذا سورۃ الفاتحہ میں بھی مٰلِكِ کو مَلِكِ پڑھنے کی پوری گنجائش

موجود ہے اور قراءت ورش کے مطابق یہ بالکل جائز اور درست ہے۔

دوسری دلیل: اس کی دوسری دلیل سورۂ ہود، آیت 41 کے لفظ مَجْرِيْهَا میں ہے کہ:

﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيْهَا وَمُرْسٰهَا﴾

اسے رسم عثمانی میں یوں لکھا گیا ہے: ﴿بسم الله مجريها ومرسها﴾

اس میں لفظ (مجريها) کو قراءت متواترہ میں تین طرح سے پڑھا جاتا ہے:

مجريها (اصل رسم عثمانی)

1۔ مُجْرٰيهَا (ایک متواترہ قراءت کے مطابق)

2۔ مُجْرَےْ هَا (دوسری متواترہ قراءت کے مطابق)

3۔ مَجْرَےْ هَا (تیسری متواترہ قراءت حفص کے مطابق)

اس سے معلوم ہوا کہ رسم عثمانی کے مطابق لکھا ہوا یہ لفظ (مجريها) جو کہ قرآن کا اصل متن ہے وہ تینوں متواتر قراءتوں کو قبول کر لیتا ہے اور اسے تینوں طریقوں سے پڑھنے کی گنجائش موجود ہے۔ بلکہ اہل علم جانتے ہیں پہلی دو قراءتیں تیسری قراءت حفص کے مقابلے میں زیادہ متداول اور زیادہ فصیح عربی کے قریب ہیں، کیونکہ یہی لفظ جب مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم کے معلقے میں آتا ہے:

صبنت الكأس عنا ام عمرو

وكان الكاس مجراها اليمينا

تو اس شعر کے لفظ 'مجراها' کو بھی عام طور پر 'مَجْرَاهَا' پڑھا جاتا ہے۔ اسے قراءت حفص کی طرح کوئی بھی مَجْرَےْ هَا نہیں پڑھتا۔

تیسری دلیل: غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود قراءت حفص (جسے وہ قراءت عامہ کا نامانوس نام دیتے ہیں) میں بھی قرآن مجید کے کئی الفاظ کی دو دو قراءتیں درست ہیں۔ گویا ایک ہی قراءت حفص میں بھی بعض قرآنی الفاظ کو دو دو طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے اور پڑھا جاتا ہے۔ جیسے

(ا) سورۃ البقرۃ آیت نمبر 245 میں ہے کہ

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ﴾

میں لفظ يَبْصُطُ کو يَبْسُطُ بھی پڑھا جاتا ہے، جس کے لیے ہمارے ہاں کے مصاحف میں حرف صاد کے اوپر چھوٹا سین (س) ڈال دیا جاتا ہے۔

(ب) سورۃ الغاشیہ، آیت نمبر 22 میں ہے کہ

﴿لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾

میں لفظ بِمُصَيْطِرٍ کو بِمُسَيْطِرٍ بھی پڑھا جاتا ہے۔

(ج) سورۃ الطّور، آیت نمبر 37 میں ہے کہ

﴿اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ﴾

میں لفظ المصیطرون کو المسیطرون بھی پڑھا جاتا ہے۔

(د) سورۃ الروم، آیت نمبر 54 میں ہے کہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَيْبَةً﴾

میں ضُعْفٍ کے تینوں الفاظ کو ضَعْفٍ بھی پڑھا جاتا ہے۔ (مجمع ملک فہد سے مطبوعہ روایت حفص یا 'قراءت عامہ' کے کروڑہا نسخوں میں بھی ایسے ہی لکھا گیا ہے۔ جبکہ پاکستانی مصاحف میں ضُعْفٍ لکھا گیا ہے۔

اس وضاحت کے بعد کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ قرآن کا متن ایک قراءت کے سوا کسی اور قراءت کو قبول نہیں کرتا؟ ایسا دعویٰ صرف وہی آدمی کرسکتا ہے جو علم قراءات سے نابلد ہو، رسم عثمانی سے بے خبر ہو اور جس نے کبھی آنکھیں کھول کر قرآن کے متن کو نہ پڑھا ہو۔

دراصل قراءات کا یہ اختلاف دنیا کی ہر زبان کی طرح تلفظ اور لہجے کا اختلاف ہے۔ اس سے قرآن مجید میں کوئی ایسا تغیر نہیں ہو جاتا جس سے اس کے معنی ومفہوم تبدیل ہو

جائیں یا حلال حرام ہو جائے بلکہ اس کے باوجود قرآن قرآن ہی رہتا ہے اور اس کے نفس مضمون میں کسی قسم کا کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

خود ہماری اردو زبان میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جیسے 'ناپ تول' اور 'ماپ تول' دونوں صحیح ہیں۔ اسی طرح 'کے بارہ میں' اور 'کے بارے میں' دونوں درست ہیں۔

انگلش میں بھی اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر Schedule کو ''شیڈول'' بھی پڑھا جاتا ہے اور سکیجوئل بھی۔ Constitution کو کانسٹی چوشن بھی پڑھتے ہیں اور کانسٹی ٹیوشن بھی۔ یہ محض تلفظ اور لہجے (Pronunciation) کا فرق ہے جو عربی سمیت دنیا کی ہر بڑی زبان میں پایا جاتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ قرآن مجید کی مختلف قراءتوں کا ہے۔

یہ تفصیل جان لینے کے بعد آخر یہ دعویٰ کرنے کی کہاں گنجائش باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے اور باقی تمام قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں؟

2۔ کیا قرآن میزان ہے؟

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ ''الفرقان'' اور ''المہیمن'' وغیرہ اسماء قرآنی کی طرح ''المیزان'' بھی قرآن کے ناموں میں سے ایک نام اور اس کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن مجید اس زمین پر حق و باطل کے لیے ''میزان'' اور ''فرقان'' اور تمام سلسلۂ وحی پر ایک ''مہیمن'' کی حیثیت سے نازل ہوا ہے:
>
> ﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾ (الشوریٰ: 17)
>
> ''اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اُتاری، یعنی میزان نازل کی ہے۔''
>
> اس آیت میں ''والمیزان'' سے پہلے ''و'' تفسیر کے لیے ہے۔ اس طرح ''المیزان'' درحقیقت یہاں ''الکتاب'' ہی کا بیان ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے لیے قرآن اُتارا ہے جو دراصل ایک میزان عدل

ہے اور اس لیے اُتارا ہے کہ ہر شخص اس پر تول کر دیکھ سکے کہ کیا چیز حق ہے اور کیا باطل۔ چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر اسے تولا جا سکے۔" (میزان، ص 24، طبع سوم مئی 2008ء)

(اُصول و مبادی، ص 22,23 طبع فروری 2005ء)

ہمارے نزدیک میزان نہ تو قرآن کے ناموں میں سے کوئی نام ہے اور نہ اس کی صفات میں سے کوئی صفت بلکہ وہ میزان ہرگز نہیں ہے۔ جس آیت سے اُنہوں نے قرآن کے میزان ہونے کا استدلال کیا ہے وہ استدلال کئی لحاظ سے غلط ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

1۔ قرآن مجید کے پچپن (55) اسماء اور صفات کی مکمل فہرست امام بدرالدین زرکشی نے "البرہان فی علوم القرآن" میں اور امام سیوطی نے "الاتقان" میں دے دی ہے مگر ان میں "میزان" کا نام یا صفت ہرگز شامل نہیں ہے۔

(ملاحظہ ہو: البرہان فی علوم القرآن، جلد اوّل ص 273 تا 276)

2۔ علامہ زمخشری (جسے غامدی صاحب "امام اللغۃ" مانتے ہیں، ملاحظہ ہو: میزان حصہ اوّل ص 128 طبع 1985ء) نے اپنی تفسیر الکشاف میں سورۃ الشوریٰ کی مذکورہ بالا آیت میں "الکتاب" سے قرآن مراد نہیں لیا بلکہ "جنس الکتاب" مراد لی ہے جس کا مطلب ہے وہ سلسلۂ کتب جو اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں نازل کیا ہے۔ اس سے خاص قرآن مراد نہیں لیا جا سکتا، بلکہ ہر الہامی کتاب اس میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ علامہ زمخشری نے میزان کو قرآن کی صفت نہیں مانا بلکہ "وَ" کو عاطفہ مانا ہے اور قرآن اور میزان کو دو الگ الگ چیزیں قرار دیا ہے۔ نیز انہوں نے میزان کے دو معنی لکھے ہیں ایک "عدل و انصاف" اور دوسرے "ترازو"

لہٰذا جب عربی زبان کے امام لغت نے مذکورہ آیت میں نہ تو قرآن کو میزان قرار دیا ہے اور نہ "وَ" کو بیان یا تفسیر کے معنوں میں لیا ہے بلکہ واوٌ عاطفہ قرار دے کر اس سے "عدل و انصاف"...... "ترازو" کے معنی لیے ہیں تو غامدی صاحب کس بنیاد پر اس آیت سے قرآن

کا میزان ہونا مراد لے سکتے ہیں؟ الکشاف میں پورا حوالہ یہ ہے:

(('انزل الكتاب' أي جنس الكتاب(والميزان) والعدل والتسوية، و معنى انزال العدل أنه انزله في كتبه المنزلة وقيل الذي يوزن به.)) (الکشاف جلد3، ص465، طبع مصر، 1392ھ)

آیت مذکورہ کا یہی مفہوم امام طبری نے ''تفسیر طبری'' میں، امام قرطبی نے ''تفسیر قرطبی'' میں، حافظ ابن کثیر نے ''تفسیر ابن کثیر'' میں، علامہ شوکانی نے ''فتح القدیر'' میں، علامہ محمود آلوسی نے ''روح المعانی'' میں اور احمد مصطفیٰ مراغی نے ''تفسیر مراغی'' میں بیان کیا ہے۔

ان میں سے کسی مفسر نے اس آیت میں ''الکتاب'' سے نہ تو قرآن مراد لیا ہے اور نہ میزان کو اس کی صفت قرار دیا ہے۔ بلکہ اُمت مسلمہ کے یہ تمام معتمد علیہ اور عربی زبان وادب کے ماہر مفسرین کرام اس آیت کا ایک ہی مفہوم مراد لیتے ہیں کہ اس میں الکتاب سے سلسلۂ کتب مراد ہے اور میزان سے یا تو عدل و انصاف مراد ہے یا پھر ترازو مراد ہے ان میں سے کسی نے بھی اس آیت کا وہ مفہوم نہیں لیا جو غامدی صاحب اس آیت سے کشید کرتے ہیں۔

3۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کرنا اعلیٰ اور معتبر ترین تفسیر ہوتی ہے کیونکہ ''القرآن يفسر بعضه بعضاً'' کا اُصول ایک مسلمہ اُصول ہے۔ اس اُصول کے تحت جب ہم اس آیت کے نظائر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان سے بھی قرآن کا میزان ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر صرف دو آیات ملاحظہ ہو:

(ا) .... ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید: 27)

''بے شک ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیاں دے کر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتابیں نازل کیں اور ترازو بھی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔''

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے ہر

دور میں واضح نشانیوں کے ساتھ پیغمبر بھیجے، کتابیں نازل کیں اور ان کتابوں کے ساتھ ترازو یعنی عدل و انصاف کا تصور اور اس کے بارے میں حکم بھیجا تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور ظلم و زیادتی سے باز رہیں۔

مذکورہ آیت سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ قرآن میزان ہے کیونکہ اگر یہ مان لیا جائے کہ قرآن میزان ہے تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ قرآن تمام پیغمبروں پر نازل ہوا ہے جب کہ واقع میں ایسا نہیں ہے۔ میزان تو پہلے بھی تھی اور عدل و انصاف کا تصور اور حکم پہلے بھی تھا مگر قرآن صرف اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہی پر نازل ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میزان نہیں ہے۔

(ب)...... ''میزان'' کے معنی و مفہوم کو سمجھنے کے لیے ایک نظیر یہ بھی پیش نظر رہے کہ:

﴿وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝﴾ (الرحمان: 7 تا 9)

''اور اُسی نے آسمان کو بلند کیا اور ترازو رکھ دی تاکہ تم لوگ تولنے میں زیادتی نہ کرو بلکہ انصاف سے پورا تولو اور کم نہ تولو۔''

سورۂ رحمان کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کی تخلیق کا ذکر فرمایا ہے اور پھر میزان یعنی ترازو رکھنے کو واضح فرمایا ہے، پھر یہ حکم دیا ہے کہ تول ٹھیک رکھو، پورا تولو اور تول میں کمی نہ کرو، ان آیات کا سیدھا سادا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان بنانے کے بعد انسانوں کو میزان کا تصور دیا ہے تاکہ وہ عدل و انصاف سے کام لیں، تول پورا رکھیں اور تول میں ہرگز کمی نہ کریں۔

یہ آیات بھی قرآن کے میزان ہونے کی نفی کرتی ہیں۔ کیونکہ آسمان، زمین، سورج اور چاند کی تخلیق کے ساتھ اوّل روز سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو میزان یعنی عدل و انصاف کا تصور دیا اور پھر حکم دیا کہ لوگ عدل و انصاف سے کام لیں اور ترازو سیدھی تولیں اور ڈنڈی نہ ماریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزول سے بہت پہلے "وَضَعَ الْمِيْزَانَ" (میزان رکھی گئی) ہو چکی تھی۔ اس لیے قرآن کو میزان قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

4۔ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی جانتا ہے کہ میزان (ترازو) کا کام کسی شے کو صرف تولنا اور اس کا وزن بتانا ہوتا ہے، اس کا کام اچھی اور بُری یا اصلی اور نقلی چیز میں فرق و امتیاز کرنا نہیں ہوتا۔ آپ اصلی اور نقلی سونے کو تول کر اُن کا وزن معلوم کر سکتے ہیں مگر میزان کے ذریعے سونے کے اصلی یا نقلی ہونے کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ میزان کا کام تولنا ہے وہ کھری چیز کو بھی تولے گی اور کھوٹی چیز کو بھی تولے گی، وہ حلال شے کو بھی تولے گی اور حرام شے کو بھی تولے گی مگر وہ کھری اور کھوٹی چیز میں یا حلال اور حرام شے میں امتیاز نہیں کر سکے گی۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جب وہ قرآن کو "میزان" قرار دیتے ہیں تو وہ قرآن کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں۔ گویا نعوذ باللہ قرآن مجید ایک ایسی میزان ہے جو اس لیے نازل ہوئی تا کہ لوگ اس کے ذریعے سے ہر طیب، نجس، پاک اور ناپاک چیز کو تول کر اس کا وزن معلوم کر لیا کریں۔

5۔ دراصل غامدی صاحب کے لیے قرآن کو "میزان" کہنا ایک "ضرورت" اور "مجبوری" ہے تا کہ وہ اس کی آڑ میں آسانی سے جس حدیث کا جب چاہیں یہ کہہ کر انکار کر دیں کہ یہ تو قرآن کی "میزان" پر تولنے کے بعد "باطل" ثابت ہوئی ہے لہٰذا اسے ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے۔ یاد رہے کہ غامدی صاحب اپنی اس "میزان" کے حربے سے بالفعل بہت سی احادیث صحیحہ کا انکار کر چکے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب کا یہ کہنا کہ قرآن میزان ہے ایک بالکل بے اصل بات ہے۔

3۔ کیا سورۃ النصر مکی سورہ ہے؟

اہل علم جانتے ہیں کہ سلف و خلف کے تمام مفسرین کے نزدیک سورۂ نصر مدنی ہے اور

اس کے مدنی سورہ ہونے پر سب کا اتفاق اور اجماع ہے۔

مگر جناب جاوید غامدی صاحب نے اس متفقہ اور مجمع علیہ امر میں بھی اختلاف پیدا کیا ہے اور اُن کو سورۂ نصر کے مکی سورہ ہونے پر اصرار ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اُلٹی تفسیر ''البیان'' (میں اس تفسیر کو اُلٹی اس لیے کہتا ہوں کہ یہ آخری سورتوں سے شروع ہو کر ابتدائی سورتوں کی طرف اُلٹے رُخ پر چلی آ رہی ہے اور ابھی تک نامکمل ہے) میں لکھتے ہیں:

''سورۃ النصر کا مرکزی مضمون آپ کے لیے سرزمین عرب میں غلبہ حق کی بشارت اور آپ کو یہ ہدایت ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ اپنے پروردگار سے ملاقات کی تیاری کریں۔

سورۂ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے یہاں اس سورہ (النصر) کے مقام سے واضح ہے کہ سورۂ کوثر کی طرح یہ بھی، اُم القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلہ ہجرت و براءت میں آپ ﷺ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔'' (البیان: ص: 252، مطبوعہ 2000ء)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب سورۂ نصر کو مکی قرار دیتے ہیں اور ''مرحلہ ہجرت و براءت'' کے زمانے میں اس کا نزول بتاتے ہیں۔ اسی بات کو وہ دوسرے مقام پر مختصر اور واضح طور پر یوں فرماتے ہیں کہ:

''ساتواں باب سورۂ ملک سے شروع ہو کر سورۂ الناس پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں آخری دو یعنی معوذتین مدنی اور باقی سب مکی ہیں۔'' (البیان: صفحہ 6)

گویا غامدی صاحب کی رائے میں سورۂ نصر بھی مکی ہے کیونکہ وہ بھی سورۂ ملک اور معوذتین کے درمیان واقع ہے۔ البتہ اُن کے نقطہ نظر کو مزید اچھی طرح سمجھنے کے لیے پہلے حوالے میں ایک دریافت طلب بات یہ ہے کہ ''مرحلہ ہجرت و براءت'' سے اُن کی کیا مراد ہے تو اسے بھی خود ان کی زبانی سنئے، وہ لکھتے ہیں:

''مرحلہ ہجرت و براءت الماعون 107...... الاخلاص 112۔''

''قریش کے سرداروں کی فرد قرار داد جرم، اُنہیں عذاب کی وعید اور رسول اللہ ﷺ کے لیے بشارت کہ حرم کی تولیت اب اُن کی جگہ آپ ﷺ کو حاصل ہوگی اور آپ کے دشمنوں کی جڑ اس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے کٹ جائے گی۔'' (108،107)

''اُم القریٰ کے ائمہ کفر سے آپ کا اعلانِ براءت اور سرزمین عرب میں غلبہ حق کی بشارت۔ 110،109۔''

''قریش کی قیادت، بالخصوص ابولہب کا نام لے کر اس کی ہلاکت کی پیشین گوئی اور نبی ﷺ کی طرف سے، اس مرحلے کے اختتام پر عقیدۂ توحید کے فیصلہ کا اعلان۔ (112،111)'' (البیان: صفحہ 14)

گویا غامدی صاحب کا خود ساختہ مرحلہ ''ہجرت و براءت'' دراصل ہجرت سے پہلے کا مکی دور ہے اور وہ سورۂ نصر کو اسی دور کی نازل شدہ مکی سورت مانتے ہیں۔ ایک اور مقام پر جناب غامدی قرآن مجید کے بارے میں اپنے خود ساختہ ''سات ابواب'' میں آخری باب کی وضاحت کرتے ہوئے بھی سورۂ نصر کو مکی سورہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ قرآن مجید کا ساتواں باب ہے۔ اس میں الملک (67) سے الناس (114) تک 48 سورتیں ہیں۔ ان سورتوں کے مضامین، اور اس باب میں ان کی ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلی 46 سورتیں اُم القریٰ مکہ میں، اور آخری دو الفلق اور الناس ہجرت کے فوراً بعد مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔

قرآن مجید کے دوسرے سب ابواب کی طرح یہ چیز اس باب میں بھی ملحوظ رہے کہ یہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا اور مدنیات پر ختم ہو جاتا ہے۔'' (البیان: صفحہ 11)

گویا غامدی صاحب کی رائے میں زمانی اعتبار سے بھی سورۂ نصر ہجرت سے پہلے مکہ میں نازل ہونے والی مکی سورت ہے۔ ہمارے نزدیک غامدی صاحب کی مذکورہ رائے نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ اجماع مفسرین اور اجماع اُمت کے بھی خلاف ہے۔ اس سلسلے میں

ہم ذیل میں چند معتبر اور مستند تفاسیر کے حوالے پیش کرتے ہیں:

1:...... **تفسیر الکشاف** از علامہ محمود زمخشری

((سورة النصر، مدنية وهي ثلاث آيات.... روي أنها نزلت في أيام التشريق بمنى في حجة الوداع.))

(تفسیر الکشاف، ج:4، صفحہ:293، مطبوعہ مصر)

''سورۂ نصر مدنی ہے، اس کی تین آیات ہیں...... روایت ہے کہ یہ سورت ایام تشریق میں منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔''

2:...... **تفسیر قرطبي** از امام قرطبی

((وهي مدنية بإجماع و تسمّٰى سورة التوديع، وهي ثلاث آيات وهي آخر سورة نزلت جميعاً، قاله ابن عباس في صحيح مسلم.))

(الجامع لاحکام القرآن، جلد: 10، صفحہ229)

''اور وہ (سورۂ نصر) مدنی ہے، اس کے مدنی ہونے پر اجماع ہے۔ اسے سورۂ تودیع (الوداعی سورت) بھی کہتے ہیں۔ اس کی تین آیتیں ہیں۔ یہ آخری مکمل نازل ہونے والی سورت ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول نقل ہوا ہے۔''

3:...... **تفسیر ابن کثیر** از حافظ ابن کثیر

((تفسير سورة إذا جاء نصر الله والفتح وهي مدنية.))

(تفسیر القرآن العظیم، جلد4، ص561، مطبوعہ بیروت)

''تفسیر سورہ اذا جاء نصر الله والفتح اور یہ سورۃ مدنی ہے۔''

4:...... **تفسیر رازي** از امام فخر الدین رازی

((هذا السورة من أواخر ما نازل بالمدينة.))

(تفسیر کبیر: جلد32، ص150، مطبوعہ تہران)

"یہ سورۃ مدینے میں نازل ہونے والی آخری سورتوں میں سے ایک ہے۔"

5:...... **تفسیر روح المعاني** از علامہ محمود آلوسی

((وتُسمّى سورة إذا جآء، وعن ابن مسعود: أنها تسمّى سورة التوديع لما فيها من الإيماء إلى وفاته عليه الصلاة والسلام وتوديعه الدنيا وما فيها.... وهي مدنية على القول الأصح في تعريف المدني.... عن ابن عمر رضى الله عنهما أنه قال: هذه السورة نزلت على رسول الله ﷺ أوسط أيام التشريق بمنى وهو في حجة الوداع.")) (روح المعانی : ج16، ص458)

"اور یہ (سورۂ نصر) سورۂ إذا جآءَ بھی کہلاتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اسے سورۂ تودیع (الوداعی سورت) بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں نبی ﷺ کی وفات اور آپ ﷺ کے دنیا و مافیہا سے رُخصت ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔ اور یہ "مدنی" کی تعریف کے صحیح ترین قول کے مطابق مدنی سورت ہے...... حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ سورۃ حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں ایامِ تشریق کے وسط میں رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔"

6:...... **تفسیر مراغي** از احمد مصطفیٰ مراغی

((هي مدنية وآياتها ثلاث، نزلت بعد التوبة.))

(تفسیر مراغی، جلد30، ص257)

"یہ (سورۂ نصر) مدنی سورت ہے، اس کی تین آیتیں ہیں اور یہ سورۂ توبہ کے بعد نازل ہوئی۔"

پھر آگے چل کر علامہ مراغی لکھتے ہیں:

((وقد فَهِمَ النبي ﷺ من هذا أن الأمر قد تمَّ، ولم يبقَ إلا أن يَلْحَقَ بالرفيق الأعلىٰ.)) (تفسیر مراغی، جلد30، صفحہ260)

''اس سورت کے نازل ہونے سے نبی ﷺ نے یہ بات سمجھ لی کہ اب کام ختم ہو چکا ہے۔ اب صرف ''رفیق اعلیٰ'' سے ملنا باقی رہ گیا ہے۔''

6:...... **تفسیر جلالین** از علامہ محلی وسیوطی

((سورة النصر نزلت بمنى في حجة الوداع فتعد مدنية وهي آخر ما نزل من السور وآياتها ثلاث.)) (جلالین: جلد 1، ص825، مطبوعہ قاہرہ)

''سورۂ نصر منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ اسے مدنی شمار کیا گیا ہے اور یہ نازل ہونے والی سورتوں میں سے آخری ہے، اس کی آیتیں تین ہیں۔''

8:...... **فتح القدير** از امام شوکانی

((إذا جاء نصر الله والفتح وتسمى سورة التوديع هي ثلاث آيات وهي مدنية بلاخلاف.)) (فتح القدیر: جلد5، صفحہ724)

''یہ سورہ **إذا جاء نصر الله والفتح** ہے اور یہ الوداعی سورہ بھی کہلاتی ہے۔ اس کی آیات تین ہیں۔ اور اس کے مدنی ہونے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔''

9:...... **البرهان في علوم القرآن** از بدرالدین زرکشی

یہ اگرچہ تفسیر کی کتاب نہیں ہے لیکن علوم القرآن کے موضوع پر سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ اس میں سورۂ **إذا جاء نصر الله** یعنی سورۂ نصر کو بالاتفاق مدنی سورتوں کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: البرہان فی علوم القرآن، جلد اوّل، ص194)

10:...... **تدبر قرآن** از مولانا امین احسن اصلاحی

اس میں بھی سورۂ نصر کو ''بالاتفاق مدنی'' قرار دیا گیا ہے۔ اور اصلاحی صاحب اسے صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے نازل شدہ مدنی سورت مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہجرت اور فتح ونصرت کے درمیان یہی وہ رشتہ ہے جس کے سبب سے (یہ سورہ جو بالاتفاق مدنی ہے) ایک مکی سورہ کی مثنیٰ قرار پائی۔ اس سورہ کے زمانہ نزول سے متعلق دو قول ہیں: ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں سے یہ سب سے آخری سورہ ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اسی دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے۔'' (تدبر قرآن: جلد 9، صفحہ 615، 616)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام مفسرین اور علمائے اُمت کے نزدیک سورۂ نصر مدنی سورت ہے۔ اس کے مدنی ہونے پر اجماع اُمت ہے اور امام قرطبی نے، جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا، اس پر اجماع نقل کیا ہے اور امام شوکانی کہتے ہیں کہ اس بارے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کو آخر ایک اجماعی متفق علیہ امر میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟

میرے نزدیک اس کا واحد سبب اُن کے وہ من گھڑت، خود ساختہ اور موضوعہ اُصولِ تفسیر و اُصولِ دین ہیں جن کا لازمی نتیجہ اُمت کے متفقہ اور مجمع علیہ مسائل میں بھی اختلاف کی صورت میں نکلتا ہے اور جس سے اُمت میں افتراق وانتشار پیدا ہوتا ہے۔

چنانچہ حد رجم کا مسئلہ ہو یا مرتد کی سزا کا، جہاد وقتال کا حکم ہو یا قراءات سبعہ کا، حدود میں عورت کی گواہی کا مسئلہ ہو یا دیت کا، وحی خفی کی بات ہو، یا عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اُٹھا لینے کی یا پھر رسولوں کا قتل ممکن ہونے کی۔ غامدی صاحب ہر معاملے میں اُمت

سے الگ کھڑے نظر آتے ہیں اور اس غیر سبیل المؤمنین پر چلتے دکھائی دیتے ہیں جو کعبے کی بجائے ترکستان کو جاتی ہے۔

4۔ کیا قرآنی الفاظ کے صرف معروف معنی لینا درست ہے؟

غامدی صاحب قرآن مجید کے الفاظ کے صرف معروف معنی لینے کو جائز سمجھتے ہیں اور اگر معروف معنی نہ لیے جائیں تو ان کے نزدیک ایسا کرنا ناجائز ہے۔

وہ اپنے موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس قرآن کے ترجمہ وتفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہئیں، ان سے ہٹ کر ان کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جا سکتی۔'' (میزان، ص18، طبع دوم اپریل 2002ء)

اس کے بعد اپنے موقف کو درج ذیل مثالوں سے واضح کرتے ہیں:

''وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ میں اَلنَّجْمُ کے معنی ''تاروں'' ہی کے ہو سکتے ہیں۔ إِلا إِذَا تَمَنّٰى میں لفظ تَمَنّٰى کا مفہوم خواہش اور ارمان ہی ہے۔ أَفَلَا يَنظُرُوْنَ إِلَى الْإِبِلِ میں الإِبِلِ کا لفظ اونٹ ہی کے لیے آیا ہے۔ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ میں بَيْض انڈوں ہی کے معنی میں ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ میں نَحَر کا لفظ قربانی ہی کے لیے ہے۔ اور اسے ''بوٹیوں'' اور ''تلاوت'' اور ''بادل'' اور ''انڈوں'' کی چھپی ہوئی جھلی اور ''سینہ پر ہاتھ باندھنے'' کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔'' (حوالہ مذکورہ، ص18، 19)

اصولی طور پر تو سرے سے یہ بحث ہی فضول اور جاہلانہ ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے صرف معروف معنی ہی لینے چاہئیں اور ان سے ہٹ کر ان کی کوئی تاویل بارگاہِ غامدی میں کسی حال میں قبول نہیں ہو سکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر زبان کی طرح عربی زبان میں بھی ایک ہی لفظ کے کئی کئی معروف معنی ہوتے ہیں جو سیاق کلام اور فحوائے کلام سے معلوم ہو سکتے ہیں جیسے کوئی اردو زبان میں کہے مجھے سونا چاہیے تو

اس فقرے کے دو معروف معنی ہیں جو موقع ومحل کی مناسبت سے سمجھے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح مثال کے طور پر 'دین' کے لفظ ہی کو لیجئے، یہ لفظ قرآن مجید میں چار مختلف معروف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ سہولت کی خاطر ہم اس جگہ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر ہی پیش کر دیتے ہیں جو اپنی تفسیر تدبر قرآن، میں سورۃ الفاتحہ کی ایک آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ: دین کا لفظ قرآن میں کئی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے:

1۔ مذہب وشریعت کے معنی کے لیے مثلاً افغیر دین الله یبغون (آل عمران:83)
"کیا خدا کے اتارے ہوئے مذہب کے سوا وہ کسی اور مذہب کے طالب ہیں۔"

2۔ قانونِ ملکی کے لیے مثلاً مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (یوسف:76)
"اس کو بادشاہ کے قانون کی رو سے یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کو روک سکے۔"

3۔ اطاعت کے معنی کے لیے مثلاً: ﴿وَ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا﴾ (النحل:52) "اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے۔"

4۔ جزا کے معنی میں مثلاً: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ (الذاریات:5۔6) "جس چیز کی تمہیں دھمکی سنائی جا رہی ہے وہ سچ ہے اور جزا وسزا واقع ہو کر رہے گی۔" (تدبر قرآن، ج1، ص57، طبع 1983ء لاہور)

یہی حال اوپر کی ان مثالوں کا ہے جو غامدی صاحب نے دی ہیں۔ ان میں الفاظ کے ایک سے زیادہ معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ جیسے انہوں نے سورۃ الرحمٰن آیت 6 کی مثال دی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝﴾

کہ اس آیت میں لفظ اَلنَّجْمُ کے معنی صرف 'تاروں' کے ہیں۔ حالانکہ اس سے 'جڑی بوٹیاں' بھی مراد ہو سکتی ہیں اور وہ بھی اس لفظ کے معروف معنی ہی شمار ہوں گے کیونکہ لغت

میں اس لفظ کے یہ دونوں معنی موجود ہیں۔ بلکہ اکثر مفسرین نے، جو عربیت کے ماہر بھی ہیں، اس مقام پر اس لفظ سے 'جڑی بوٹیاں' ہی مراد لی ہیں۔ اگرچہ بعض حضرات اس سے 'ستارے' بھی مراد لیتے ہیں اور اس کے یہ دونوں معنی درست ہیں۔ ان میں سے کسی ایک معنی پر اصرار محض جہالت اور کم علمی کی دلیل ہے۔

اب ہم ذیل میں چند مشہور اور مستند کتب تفسیر اور کتب لغات کے حوالے سے واضح کریں گے کہ سورۃ الرحمٰن کی آیت 6 میں آمدہ لفظ اَلنَّجْمُ کے کیا کیا معنی مراد ہو سکتے ہیں۔

1۔ تفسیر طبری:

تفسیر طبری میں پہلے تو 'النجم' کے معنی کے بارے میں دو قول لکھے گئے ہیں ایک کے مطابق 'ستارے' اور دوسرے کے مطابق اس سے 'جڑی بوٹیوں' مراد ہیں۔ اور پھر دوسرے قول ہی کو ترجیح دی گئی ہے۔

2۔ تفسیر الکشاف:

اس میں اس کے صرف ایک ہی معنی لکھے ہیں کہ:

(('والنجم' والنبات الذی ینجم من الارض الاساق له کالبقول والشجر الذی له ساق)).

'نجم' سے مراد وہ نباتات ہے زمین پر ظاہر ہو جاتی (اُگتی) ہے اور اس کا تنا نہیں ہوتا جیسے سبزیاں۔ اور 'شجر' وہ ہے جس کا تنا بھی ہوتا ہے پھر یہ وضاحت کی ہے کہ:

((ان الشمس والقمر سماویان، والنجم والشجر ارضیان، فبین القبیلین تناسب من حیث التقابل))

''شمس و قمر دونوں آسمانی اور نجم و شجر دونوں زمینی چیزیں ہیں۔ اس قرب کی مناسبت سے ان کو مقابل میں بیان کیا گیا ہے۔''

3۔ تفسیر قرطبی:

تفسیر قرطبی میں ہے کہ:

((قال ابن عباس وغیره: النجم مالا ساق له والشجر ماله ساق))

"النجم، کے بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اس سے وہ پودے مراد ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا اور شجر وہ ہے جس کا تنا ہوتا ہے۔"

4۔ تفسیر ابن کثیر:

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ:

((قال ابن جریر: اختلف المفسرون فی معنی قوله 'والنجم' بعد اجماعهم علی ان الشجر ما قام علی ساق، فروی عن ابن ابی طلحة عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال النجم ما انبسط علی وجه الارض یعنی من النبات، وکذا قال سعید بن جبیر والسدی وسفیان الثوری، وقد اختاره ابن جریر رحمہ اللہ وقال مجاهد النجم الذی فی السماء))

"ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ "والنجم" کے اس جگہ معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے اگرچہ وہ اس پر متفق ہیں کہ 'شجر' وہ ہوتا ہے جو تنے پر کھڑا ہوتا ہے۔ ابن ابی طلحہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ 'النجم' سے مراد وہ نباتات ہے جو زمین کی سطح پر پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی قول سعید بن جبیر، سدی اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ اور اسی معنی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ 'نجم' سے وہ ستارے مراد ہیں جو آسمان پر ہوتے ہیں۔"

5۔ تفسیر روح المعانی:

((المراد بالنجم النبات الذی ینجم ای یظهر ویطلع من الارض ولا ساق له، وبالشجر النبات الذی له ساق، وهو

المروی عن ابن عباس، وابن جبیر وابی رزین.))

''اس جگہ 'نجم' سے مراد وہ نباتات اور جڑی بوٹیاں ہیں زمین کی سطح پر اگتی اور ظاہر ہوتی ہیں اوران کا تنا نہیں ہوتا۔ 'شجر' سے وہ نباتات مراد ہے جس کا تنا بھی ہو۔ یہی قول ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابن جبیر اور ابو رزین رحمہم اللہ کا بھی ہے۔''

6۔ تفسیر مراغی:

((والنجم: مالا ساق له من النبات، والشجر: ماله ساق))

''نجم سے مراد وہ نباتات ہے جس کا تنا نہ ہو اور شجر سے تنے والی نباتات مراد ہے۔''

7۔ فتح القدیر (امام شوکانی رحمہ اللہ)

((النجم مالا ساق له من النبات والشجر ماله ساق))

''نجم وہ نباتات ہے جس کا تنا نہ ہو اور شجر وہ ہے جس کا تنا بھی ہو۔''

8۔ المفردات (امام راغب اصفہانی)

قرآن مجید کے اس لغت میں نجم کے دونوں معنی (جڑی بوٹیاں اور ستارے) لکھے ہیں مگر پہلے معنی کو ترجیح دی ہے کہ اس سے مراد 'جڑی بوٹیاں' ہیں۔

((فالنجم: مالا ساق له من النبات، وقیل اراد الکواکب))

نجم سے وہ نباتات (جڑی بوٹیاں) مراد ہیں جن کا تنا نہیں ہوتا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد 'ستارے' ہیں۔

9۔ غریب القرآن (عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ)

((والنجم: العشب والبقل))

''اس جگہ 'نجم' سے گھاس اور سبزیاں مراد ہیں۔''

10۔ لسان العرب (ابن منظور)

عربی زبان کے مشہور و مستند لغت 'لسان العرب' میں 'نجم' کے یہ معنی لکھے گئے ہیں:

((كل ما طلع وظهر فقد نجم))

''ہر وہ چیز جو طلوع ہو یا ظاہر ہو وہ نَجَمَ (فعل) ہے۔''

پھر سورۃ الرحمٰن کے حوالے سے ابو اسحٰق کا یہ قول لکھا ہے کہ:

((وجائز ان يكون النجم ههنا ما نبت على وجه الارض و ما طلع من نجوم السماء))

''اس مقام پر نجم سے وہ جڑی بوٹیاں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو زمین کی سطح پر اُگ آتی ہیں اور اس سے وہ ستارے بھی مراد لیے جا سکتے ہیں جو آسمان پر طلوع ہوتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ 'نجم' کے معروف معنی 'جڑی بوٹیوں' کے بھی ہیں اور 'ستاروں' کے بھی ہیں لہٰذا کسی ایک ہی معنی پر اڑنا علمیت کی نہیں جہالت کی نشانی ہے۔ البتہ کوئی شخص ان دونوں میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دینے کا حق رکھتا ہے۔

خود ہماری اردو زبان میں 'کان' کے معنی انسانی جسم کے ایک عضو کے بھی ہیں اور جہاں سے معدنیات نکلتی ہیں اسے بھی 'کان' کہتے ہیں۔ گویا لفظ 'کان' کے اردو زبان میں دو مختلف معنی ہیں اور دونوں ہی معروف معنی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک معنی کو معروف کہہ کر مراد لینا اور دوسرے معنی کو غیر معروف کہہ کر چھوڑ دینا حماقت اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے؟

5۔ محکم اور متشابہ آیات:

اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں۔ ایک محکم، دوسری متشابہ جیسا کہ سورۃ آل عمران کی آیت میں ان کا ذکر موجود ہے۔ 'محکمات' سے مراد وہ آیتیں ہیں جن کے معنی واضح اور متعین ہیں اور متشابہات وہ آیتیں ہیں جن کے معنی واضح اور متعین نہیں ہیں۔

لیکن غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ متشابہات کے معنی اور ان کا مفہوم بھی متعین ہے اور بغیر کسی تردد کے ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیز نہیں کر سکتے یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔''

''......وہ نہ غیر متعین ہیں اور نہ ان کے مفہوم میں کوئی ابہام ہے۔ ان کے الفاظ عربی مبین ہی کے الفاظ ہیں اور ان کے معنی بھی ہم بغیر کسی تردد کے سمجھتے ہیں۔'' ......''قرآن کی جس آیت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ متشابہات کا مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ متشابہات کے معنی اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔'' (میزان، ص 33۔ 34 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا یہ محض ادعا ہے جو ہرگز درست نہیں ہے۔ کیونکہ متشابہات کے معنی سمجھنا اور ان کا مفہوم متعین کرنا ممکن نہیں ہے اور اسی بات پر مفسرین کرام کا اجماع اور اتفاق ہے۔

ایک مثال سے سمجھئے۔ سورۂ البقرہ اور سورۂ آل عمران کا آغاز 'الٓـمٓ' کے حروف مقطعات سے ہوا ہے اور سب جانتے ہیں کہ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں اور ان کے معنی لوگوں کو معلوم نہیں ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید کی سات مسلسل سورتوں کے آغاز میں ایک آیت حٰمٓ ۝ بار بار آئی ہے:

1۔ ﴿حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝﴾ (المومن: 1-2)

2۔ ﴿الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (حم السجدۃ: 1۔ 2)

3۔ ﴿حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ ۝ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ (الشوریٰ: 1۔ 3)

4۔ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ (الزخرف: 1۔ 2)

5۔ ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝﴾ (الدخان: 1۔ 2)

6۔ ﴿حٰمٓ o تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ o﴾ (الجاثیۃ: 1-2)

7۔ ﴿حٰمٓ o تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ o﴾

(الاحقاف: 1۔2)

لیکن میں غامدی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ صحیح دلیل کے ساتھ ان ساتوں مقامات پر اس آیت یعنی حٰمٓ کے معنی اور مفہوم معین طور پر بیان کر کے دکھائیں اور بتائیں کہ ان سب مقامات پر اس آیت سے کیا مراد ہے؟ پھر ہم مان لیں گے کہ قرآن مجید کے متشابہات بھی غیر متعین نہیں ہیں اور ان کے معنی کو بھی بغیر تردد کے سمجھا جا سکتا ہے؟ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین؟

6۔ کیا قرآن کی سورتوں کا شانِ نزول خود ان کے اندر موجود ہے؟:

غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی سورتوں کا پس منظر اور شانِ نزول خود ان کے اندر موجود ہوتا ہے اور اس کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس (قرآن) کو سمجھنے کے لیے اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یعنی وہ پس منظر، وہ تقاضے اور وہ صورت حال معین کی جائے جس کو پیش نظر رکھ کر قرآن کی کوئی سورت نازل ہوئی ہے۔ اس کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ سب چیزیں خود قرآن کی روشنی میں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔'' (میزان، ص 22، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے بہت سے دعاوی کی طرح غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی غلط اور بے اصل ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کا پس منظر اور ان کا شان نزول خود ان کے اندر موجود ہوتا ہے اور اس کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر سورۂ 'عبس' کو دیکھئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى o اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى o﴾ (عبس: 1۔2)

''اس نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑ لیا، اس پر کہ ایک نابینا اس کے پاس آیا۔''

اس میں لفظ عَبَسَ (اس نے تیوری چڑھائی) کا فاعل ہی مذکور نہیں ہے کہ کس نے تیوری چڑھائی۔ پھر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں 'اَلْاَعْمٰی' (ایک نابینا) سے کون سا شخص مراد ہے؟ جب کہ تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس میں 'عَبَسَ' (اس نے تیوری چڑھائی) کا فاعل حضرت محمد ﷺ ہیں اور اَلْاَعْمٰی، (نابینا) سے مراد مشہور نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔

پورا واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ مکے میں نبی ﷺ قریش کے چند سرداروں کو دین اسلام کی دعوت دے رہے تھے، اتنے میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جو کہ نابینا تھے وہ بھی اسی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا اس طرح بے موقع آ جانا، نبی ﷺ کو ناگوار گذرا۔ اس لیے آپ ﷺ نے ان کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور سرداران قریش کو برابر دعوت وتبلیغ فرماتے رہے کہ شاید یہ بااثر لوگ اسلام قبول کر لیں تو اس کے نتیجے میں پورا عرب آسانی سے مسلمان ہوسکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کا ایک صحابی سے اس طرح بے رُخی برتنا پسند نہ آیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

اب ظاہر ہے جب تک یہ پورا واقعہ اور اس کا پس منظر اور اس سورت کا یہ شانِ نزول معلوم نہ ہو ہم اس سورت کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ایک اور مثال 'سورۃ الفیل' کی سامنے لایئے جو کہ اس طرح ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾ (الفیل: 1۔5)

''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ کیا ان کی چال ناکام نہیں بنا دی؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ مسلط کر

دیے۔ جو ان پر کنکر کی پتھریاں پھینکتے تھے۔ پھر انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

اِس سورت میں مذکور اصحابُ الفیل (ہاتھی والے) کون تھے؟ انہوں نے کہا 'کَیْد' یعنی چال چلی تھی، جسے اللہ تعالیٰ نے ناکام کر دیا تھا اور یہ کس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب تک یہ سب چیزیں واضح نہ ہوں۔ 'سورۂ الفیل' کا صحیح مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

اب جب تک سورۂ الفیل کو سمجھنے کے لیے قرآن سے باہر کا پورا واقعہ ہمارے سامنے نہ ہو ہم اس سورۂ کا اصل مضمون اور مطلب ہرگز سمجھ نہیں سکتے۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے اصل ہے کہ قرآن کی سورتوں کا پس منظر اور ان کا شانِ نزول خود ان کے اندر موجود ہوتا ہے اور اس کے لیے ہمیں قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کے بہت سے مقامات کی وضاحت اور تشریح ہمیں حدیث وسنت یا تاریخ عرب سے ملتی ہے اور وہ بھی قرآن سے باہر کی چیزیں ہیں۔

7۔ قرآنی عبارت میں حذف کی بحث:

اس بات پر تمام مفسرین حضرات کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعض مقامات پر کچھ الفاظ حذف ہوتے ہیں جو سیاقِ کلام یا فحوائے کلام سے بآسانی سمجھے جا سکتے ہیں۔

مگر غامدی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ جہاں چاہتے ہیں قرآن کی عبارات میں من مانے طریقے سے محذوف مان کر ان کی غلط تاویلیں کرتے ہیں اور تفسیر بالرائے مذموم کے مرتکب ہوتے ہیں جو کہ مسلمہ اصولِ تفسیر کے خلاف بات ہے۔

چنانچہ وہ ایک جگہ حذف کی ایک مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

1۔ سورۃ انعام (6) میں ایک آیت اس طرح آئی ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (الانعام: 38)

''اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر اپنے پاؤں سے چلتا ہو اور کوئی پرندہ نہیں جو فضا میں اپنے دونوں بازوں سے اڑتا ہو، مگر یہ تمہاری ہی طرح امتیں ہیں۔''

اس میں دیکھ لیجیے، مقابل کے بعض الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔ مثلاً جملے کے پہلے حصے میں 'فی الارض' ہے تو دوسرے میں 'فی السماء' کا لفظ نہیں آیا۔ اسی طرح دوسرے حصے میں، 'یطیر بجناحیہ' کے الفاظ ہیں۔

تو پہلے حصے میں 'تدب علی رجلیھا' یا 'ارجلھا' کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں۔'' (میزان، ص 37، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

2۔ انہوں نے حذف کی دوسری مثال سورۃ النساء کی آیت 23 سے اس طرح دی ہے کہ:

''قرآن کا مدعا، لاریب یہی ہے کہ ''اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ وبین المرءۃ وعمتھا وبین المرءۃ وخالتھا' وہ یہی کہنا چاہتا ہے لیکن بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ کے بعد یہ الفاظ اس لیے نہیں لاتا کہ مذکور کی دلالت اپنے عقلی اقتضا کے ساتھ اس مفہوم پر ایسی واضح ہے کہ قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا۔'' (میزان، 38 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اب ہم مذکورہ حذف کی ان دونوں مثالوں کا علمی جائزہ لیں گے۔ نئی سطر جہاں تک حذف کی پہلی مثال کا تعلق ہے تو پہلی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب نے مذکورہ آیت کا ترجمہ ہی غلط کیا ہے۔ ''وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ'' کا صحیح ترجمہ وہی ہے جو ان کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر میں کیا ہے جو کہ یہ ہے: ''اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر چلتا ہو۔'' (تدبر قرآن، ج 3، ص 42)

مگر غامدی صاحب نے اس میں ''اپنے پاؤں سے'' کے الفاظ حذف مان کر اپنی طرف سے بڑھا کر یہ غلط ترجمہ کیا ہے کہ:

''اور کوئی جانور نہیں جو زمین پر ''اپنے پاؤں سے'' چلتا ہو۔''

اس ترجمے کے غلط ہونے اور اس میں 'تدب علی رجلیھا' یا 'ارجلھا' کو

محذوف ماننے کے باطل ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ روئے زمین پر چلنے والے کئی جانوروں کے سرے سے پاؤں ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ بغیر پاؤں کے پیٹ کے بل رینگ کر چلتے ہیں جیسے سانپ، دوسرے یہ کہ اس مقام پر یہ حذف ماننا خود قرآن کی نص قطعی کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّمْشِيْ عَلٰى اَرْبَعٍ ط يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o﴾ (النور: 45)

''اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے، کوئی دو پاؤں پر چلتا ہے اور کوئی چار پیروں پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اس مقام پر غامدی صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ مقابل کے کچھ الفاظ حذف ہوگئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس مقام پر اَلْاَرْضُ (زمین) کا تقابل (اَلسَّمَاء) (آسمان) سے نہیں کیا جارہا اور نہ اس کا یہاں موقع ہے بلکہ زمین کی سطح اور فضا کا ذکر ہو رہا ہے کہ اللہ کی قدرت دیکھو کہ زمین کی سطح پر جانور چل رہے ہیں اور فضا میں پرندے اڑ رہے ہیں جو تمہاری طرح کی امتیں ہیں۔ لہٰذا اس جگہ الارض (زمین) کے مقابل میں السماء (آسمان) لانے یا اس کو حذف ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پھر پرندے آسمان میں نہیں فضا میں اڑتے ہیں جیسا کہ علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر الکشاف میں لکھا ہے کہ 'فی جو السماء' (فضائے آسمانی میں) اڑتے ہیں اور ان کے بقول اس مقام پر طائر کی صفت 'یطیر بجناحیہ' (وہ دو بازوؤں یا پیروں سے اڑتا ہے) لانے کا مقصد بھی تقابل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی وسیع اور محیط قدرت کا اظہار ہے۔

2۔ دوسری جگہ جہاں سورۃ النساء میں محرماتِ نکاح کے ضمن میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ دو

بہنوں کا کسی ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت ہونا حرام ہے کہ: ﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾

تو غامدی صاحب نے اس مقام پر یہ حذف مانا ہے کہ:

﴿اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ کے بعد وبين المرء ة وعمتها وبين المرء ة و خالتها کے الفاظ محذوف ہیں۔ (میزان، ص 38، 416 طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کو اس مقام پر محذوف ماننے کی ایک سخت ضرورت بلکہ مجبوری لاحق تھی وہ یہ کہ نہ تو وہ حدیث کو دین کا حصہ مانتے ہیں اور نہ اس سے ثابت کسی حکم کو حکم شرعی مانتے ہیں اس لیے ان کو حدیث وسنت سے ثابت شدہ ایک صریح حکم (جس کا وہ بہر طور انکار نہیں کر سکتے تھے) کو زبردستی قرآن کے اندر سے برآمد کرنے کے لیے اس کی عبارت کے اندر حذف ماننا پڑا۔

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جہاں دو بہنوں کا کسی ایک مرد کے نکاح میں بیک وقت ہونا حرام ہے اسی طرح پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی بھی بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں نہیں ہوسکتیں۔ وہ حدیث یہ ہے:

((عن ابی هريرة رضي الله عنه: ان رسول الله ﷺ قال: لا يجمع بين المرء ة وعمتها، ولا بين المرء ة وخالتها))

(صحیح بخاری، رقم 5109، صحیح مسلم، رقم: 3436، ابوداؤد، رقم: 2066)

''عورت اور اس کی پھوپھی نیز عورت اور اس کی خالہ کو کسی ایک مرد کے نکاح میں اکٹھا نہ کیا جائے۔''

مطلب یہ ہے کہ پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی بیک وقت کسی ایک مرد کی بیویاں نہیں بن سکتیں۔

پھر عربی زبان کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے بھی میں کہتا ہوں کہ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ کے بعد جو محذوف غامدی صاحب نے نکالا ہے وہ عربیت کی رُو سے بھی غلط

ہے۔ کیونکہ بالفرض ایسا حذف بھی ہوتا تو اس کے لیے یہ الفاظ موزوں ہوتے کہ:

((او بین المرء ة وعمتها ، او بین المرء ة وخالتها))

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غامدی صاحب خود بدلتے نہیں قرآن کو بدلنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

8۔ غُثَاءً اَحْوٰی کا ترجمہ وتفسیر:

ہم ذیل میں غامدی صاحب کے ایک غلط ترجمے کی نشان دہی کریں گے جو اُنھوں نے قرآنِ مجید کی سورۂ اعلیٰ کے درج ذیل مقام پر کیا ہے:

﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی o فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی o﴾ (الاعلیٰ: 5-4)

اپنی اُلٹی تفسیر ''البیان'' (جو آخری سورتوں سے پہلی سورتوں کی طرف اُلٹے رخ پر آتی ہے اور نامکمل ہے) میں غامدی صاحب نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''اور جس نے سبزہ نکالا، پھر اُسے گھنا سرسبز وشاداب بنادیا۔'' (البیان، صفحہ 165)

یہ ترجمہ ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے اور اس ترجمے اور مفہوم پر ہمارے اعتراضات یہ ہیں:

1۔ یہ ترجمہ ومفہوم عربیت کے خلاف ہے۔ عربی میں غُثَاءً کا لفظ ''گھنے سبزے'' کے معنوں میں نہیں آتا۔

2۔ یہ ترجمہ خود قرآنِ مجید کے نظائر کے خلاف ہے۔

3۔ یہ ترجمہ احادیث کے شواہد کے بھی خلاف ہے۔

4۔ یہ ترجمہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہ اللہ علیہ کے اقوال کے بھی خلاف ہے۔

5۔ یہ ترجمہ اجماعِ اُمت کے بھی خلاف ہے کیوں کہ کسی مفسر نے آج تک غُثَاءً کے معنی ''گھنے سبزے'' کے نہیں کیے۔

ہمارے نزدیک اس مقام کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ؛

''اور جس نے سبز چارہ نکالا اور پھر اُسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنادیا۔''

اب ہم اپنے موقف کی تائید میں تفصیلی دلائل پیش کریں گے۔

1۔ عربی لغت کے دلائل:

مشہور عربی لغت لسان العرب میں اہل لغت کی یہ تصریحات موجود ہیں کہ " غُثَـــاءً اَحْوٰی " کے معنی سیاہ خشک گھاس یا خس و خاشاک کے ہیں۔

1- ((الفراء في قوله تعالیٰ: ﴿وَالَّذِيْ أَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَاءً اَحْوٰی ۝﴾ قال: إذا صار النبت يبسًا فهو غثآء، والأحوى: الذى قد اسود من القدم والعتق، وقد يكون معناه أيضًا أخرج المرعٰي أحوى أي أخضر فجعله غثآء بعد خضرته فيكون مؤخرا معناه التقديم. والأحوى: الأسود من الخضرة كما قال: ﴿مُدْهَآمَّتَانِ﴾.)) (لسان العرب، جلد 14، صفحہ 207)

" فراء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ ﴿ وَالَّذِيْ أَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَاءً أَحْوٰی ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ جب نباتات سوکھ کر خشک ہو جائے تو اسے غثاء کہتے ہیں اور احوی اس چیز کو کہتے ہیں جو بوسیدگی اور قدامت کی وجہ سے سیاہ ہو جائے۔ اس کے معنی یہ بھی بیان کیے گئے ہیں کہ أخرج المرعی کہ اسے سبز اُگایا اور پھر خشک کر دیا اور اس طرح دونوں جملوں میں تاخیر و تقدیم ہو گئی ہے اور أحوی کے معنی زیادہ سرسبز و شاداب ہونے کی وجہ سے سیاہ ہونے کے بھی ہیں جیسے (قرآن میں) مُدْهَآمَّتَانِ " دو سرسبز سیاہی مائل باغ " آیا ہے۔ "

2- ((وقال الزجاج في قوله تعالىٰ: ﴿وَالَّذِيْ أَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَاءً اَحْوٰی ۝﴾ قال: غثاء جفّفه حتى صيّره هشيما جافا كالغثآء الذي تراه فوق السيل، وقيل معناه أخرجه المرعى الأحوى أي أخضر فجعله غثآء بعد ذلك أي يابسًا.))

(لسان العرب، از ابن منظور، جلد 15، صفحہ 116)

''الزجاج نے اللہ کے اس ارشاد: ﴿ وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعٰى ○ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰى ﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ غثاء بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ اس سبزے اور نباتات کو خشک اور چورا بنا دیا جیسے سیلاب کے اوپر خس و خاشاک نظر آتے ہیں۔''

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی أَخْرَجَ الْمَرْعٰى الْأَحْوٰى یعنی سبز نباتات کو اُگایا اور پھر اس کے بعد اسے غثآء یعنی خشک کر دیا۔

3۔ ابن قتیبہ نے ''تفسیر غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ:

((فَجَعَلَهُ غُثَآءً أي يبسا.))

''پھر اسے غثاء بنا دیا یعنی خشک بنا دیا۔''

((أحوى أسود من قدمه واحتراقه.))

''جو بوسیدگی یا جل کر راکھ ہونے کی وجہ سے سیاہ ہو چکا ہو۔''

(تفسیر غریب القرآن، صفحہ 524، طبع بیروت)

4۔ مشہور لغوی مفسر علامہ زمخشری نے غُثَآءً کے بارے میں یہ تحقیق کی ہے:

((وهو الحميل السيل مما بلي وأسود من العيدان والورق.))

(الکشاف للزمخشری، جلد 3، صفحہ 32، طبع بیروت)

''﴿ غُثَاءً ﴾ سے مراد سیلاب کے خشک اور سیاہ خس و خاشاک ہیں جو اصل میں بوسیدہ لکڑیوں کے ٹکڑے اور درختوں اور پودوں کے سوکھے ہوئے پتے ہوتے ہیں۔''

5۔ امام راغب اصفہانی ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھتے ہیں:

((قوله عزوجل: ﴿فَجَعَلَهُ غُثَآءً أَحْوٰى﴾ أي شديد السواد. (مادہ ''حوا'' کے تحت) وقيل تقديره: والذي أخرج المرعى أحوى فجعله غثآء، والحوة: شدة الخضرة.)) (صفحہ 271)

''اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰى ﴾ سے مراد گہری سیاہی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ترتیب کلام یوں ہے کہ وہ جس نے سبز چارہ نکالا پھر اسے

سیاہ کردیا۔ ویسے حوۃ گہرے سبز رنگ کو بھی کہتے ہیں۔''

پھر مادّہ غثا کے تحت تحریر کیا ہے کہ:

((الغثآء: غثاء السیل والقذر، ویضرب به المثل فیما یضیع ویذهب غیر معتد به.)) (صفحہ 602، طبع دار القلم، دمشق 1416ھ)

''﴿ غُثَـــاءً ﴾ سے مراد سیلاب کا خس وخاشاک ہے۔ یہ مثال اُس چیز کے بارے میں دی جاتی ہے جو ضائع ہوکر ختم ہوجائے۔''

2۔عربی تفاسیر کے حوالے سے:

1۔ تفسیر طبری میں علامہ ابن جریر طبری نے ﴿ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰی ﴾ کے تحت لکھا ہے کہ:

((﴿فَجَعَلَهُ غُثَاءً﴾ فجعل المرعی غثاء، وهو ما جف من النبت ویبس، فطارت به الریح (الأحوی) متغیر إلی الحوة وهو السواد بعد البیاض، أو الخضرة.)) (تفسیر طبری، سورۃ الاعلیٰ)

''پھر چارے کو غُثَــاءً بنادیا اور غُثَــاءً کہتے ہیں اُس نباتات کو جو خشک ہوجائے اور جسے ہوا اُڑائے پھرتی ہو۔ الأحــوی بنادیا یعنی حــوۃ میں تبدیل کردیا اور حوۃ کہتے ہیں اُس سیاہی کو جو سفیدی یا سبزی کے بعد ہوجائے۔''

2۔ تفسیر الکشاف میں غُثَاءً کا مفہوم بیان کرتے ہوئے امام زمخشری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

((أحوی صفة لغثآء: أي ﴿أَخْرَجَ الْمَرْعٰی﴾ أنبته ﴿فَجَعَلَهُ﴾ بعد خضرته ورفیفه ﴿غُثَاءً أَحْوٰی﴾ درینا أسود، ویجوز أن یکون حالا من المرعی، أي أخرجه أحوی أسود من شدة الخضرة والري فجعله غثاء بعد حوته.)) (الکشاف، جلد 4، صفحہ 243، طبع مصر)

''أحوی یہاں غُثَاءً کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ گویا أَخْـرَجَ الْـمَرْعٰی سے مراد ہے کہ نباتات اُگائی اور فَـجَـعَـلَـهُ غُثَـاءً أَحْوٰی یعنی اس کو تر وتازہ سبزہ

بنانے کے بعد سیاہ خشک کر دیا۔ اور یہ معنی بھی جائز ہیں کہ أَحْـــوٰی حال ہو الـمـرعیٰ کا۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہے کہ سبزہ اُگایا جو تر و تازگی اور شادابی کی وجہ سے سیاہی مائل تھا اور اس کے بعد اسے خشک سیاہ بنا دیا۔''

3۔ مشہور مفسر قرطبی نے غُثَاءً کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

((الغثآء: الشيء اليابس.))

''یعنی غُثَاءً سے خشک چیز مراد ہے۔''

پھر اس کی مزید تشریح کی ہے کہ:

((الغثآء ما يقذف به السيل على جوانب الوادي من الحشيش والنبات والقماش ويقال للبقل والحشيش إذا تحطم ويبس: غثاء وهشيم.))

''غُثَـــاءً سے مراد وہ گھاس پھوس اور کوڑا کرکٹ ہے جسے سیلاب وادیوں کے کناروں پر پھینک دیتا ہے۔ جب سبزہ اور گھاس ریزہ ریزہ اور خشک ہو جائیں تو اُسے غُثَاءً یا ھشیم کہا جاتا ہے۔''

پھر اسی تفسیر میں غُثَـــاءً أَحْوٰی کے بارے میں مشہور ماہرین لغت ابوعبیدہ رحمہ اللہ اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ کے یہ اقوال بھی ہیں:

((وقال أبو عبيدة: فجعله أسود من احتراقه وقدمه، والرطب إذا يبس أسود، وقال عبدالرحمٰن بن زيد: أخرجه المرعى أخضر، ثم لما يبس أسود من احتراقه، فصار غثاء تذهب به الرياح والسيول.))

''ابوعبیدہ نے اس غُثَـــاءً أَحْوٰی کے بارے میں کہا ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ اسے بوسیدہ ہونے یا جل کر راکھ ہونے کی وجہ سے سیاہ کوڑا کر دیا، اور سبزہ جب خشک ہو جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے۔ اور عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ اس کا مفہوم

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سبز نباتات اُگائی۔ پھر جب وہ خشک ہوئی اور سیاہ راکھ بن گئی تو وہ غُثَاءً ہے، جسے ہوائیں اُڑاتی ہیں اور سیلاب بہا لے جاتے ہیں۔''

(ملاحظہ ہو: تفسیر قرطبی، جلد 10، صفحہ 17، 18، طبع بیروت)

4۔ تفسیر البحر المحیط میں ابن حیان اندلسی رحمہ اللہ نے غُثَاءً أَحْوٰی کے ضمن میں لکھا ہے:

((قال ابن عباس المغني فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰى: أي أسود لأن الغثاء إذا قدم وأصابته الأمطار أسود وتعفن فصار أحوى.))

(البحر المحیط، جلد 8، صفحہ 458)

''ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ غُثَاءً أَحْوٰی کے معنی ہیں کہ غُثَاءً یعنی خشک نباتات سیاہ ہو گئی۔ کیوں کہ خشک نباتات جب بوسیدہ ہو جاتی ہے تو بارش وغیرہ کے اثر سے گل سڑ کر سیاہ ہو جاتی ہے اور اُحوی ہونے کے یہی معنی ہیں۔''

5۔ امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر فتح القدیر میں ﴿ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰى ﴾ کے تحت لکھتے ہیں:

((أي: فجعله بعد أن كان أخضر غثاء، أي: هشيما جافا كالغثاء يكون فوق السيل: (أحوى) أي: أسود بعد اخضراره، وذلك أن الكلأ إذا يبس أسود. قال قتادة: الغثاء الشيء اليابس.))

(فتح القدیر، صفحہ 1889)

''مطلب یہ ہے کہ اس سبزے کو غُثَاءً بنا دیا اور غُثَاءً اُس خس و خاشاک کو کہتے ہیں جو سیلاب کے اوپر آ جاتا ہے اور أَحْوٰی بنا دیا یعنی جو پہلے سبز تھا، اُسے سیاہ بنا دیا کیوں کہ گھاس پھونس جب خشک ہو جائے تو سیاہ ہو جاتی ہے۔ (مشہور تابعی) قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں غُثَاءً خشک چیز کو کہتے ہیں۔''

6۔ تفسیر قاسمی (محاسن التاویل) میں محمد جمال الدین قاسمی نے لکھا ہے کہ:

((المرعى: أي أخرج من الأرض مرعى الأنعام من صنوف النبات ﴿فَجَعَلَهُ﴾ أي بعد خضرته ونضرته ﴿غُثَآءً﴾ أي جافا

یابسا تطیر به الریح. ﴿أَحْوٰی﴾ أی أسود، صفة مؤکدة (لغثآء) لأن النبات إذا یبس تغیر إلی (الحوة) وهي السواد.))

(تفسیر قاسمی، جلد 10، صفحہ 126، طبع بیروت)

''اَلْمَرْعٰی کے معنی ہیں کہ زمین سے مختلف قسم کے نباتات اُگائیں جو مویشیوں کے لیے گھاس چارہ ہے۔ فَجَعَلَهُ غُثَاءً یعنی اس نباتات کو سرسبزی وشادابی کے بعد اُسے ایسا خشک کر دیا جسے ہوا اُڑائے پھرتی ہے۔ اور أَحْوٰی کے معنی ''سیاہ'' کے ہیں اور یہ غُثَـاءً کی صفت کے طور پر آیا ہے کیوں کہ جب سبزہ خشک ہو جاتا ہے تو اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔''

7۔ تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے غُثَاءً أَحْوٰی کی یہ تفسیر بھی منقول ہے کہ:

((﴿فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوٰی﴾ قال ابن عباس هشیما متغیرا.))

(بحوالہ تفسیر ابن کثیر: 4/500)

''یعنی اس سے مراد سیاہ رنگ میں تبدیل شدہ کوڑا، چورا۔''

لغت وتفسیر کی ان تصریحات سے درج ذیل اُمور بالکل واضح ہیں:

1۔ لفظ غُثَاءً کے لغوی معنی یہ ہیں:

''خس و خاشاک، سوکھی ہوئی گھاس پھونس، خشک نباتات، خشک چورا اور کوڑا کرکٹ وغیرہ۔''

2۔ لفظ أَحْوٰی کے لغوی معنی دو ہیں:

(i) ایسی نباتات جو بوسیدہ اور پرانی ہونے کی وجہ سے سیاہ ہو چکی ہو۔

(ii) ایسی نباتات جو تازگی وشادابی اور زرخیزی کی وجہ سے سیاہ مائل سبز ہو گئی ہو۔

3۔ پھر جن لوگوں نے لفظ أَحْوٰی کو غُثَـاءً کی صفت مانا ہے، اُنھوں نے اس کے پہلے معنی مراد لیے ہیں۔ یعنی کہنگی اور بوسیدگی کی وجہ سے سیاہ ہونے کا مفہوم اور ان کے نزدیک دونوں آیات کا مطلب یہ ہے کہ؛

''وہ جس نے نباتات اُگائی اور پھر اسے سیاہ خس و خاشاک بنادیا۔''

4۔ جن لوگوں نے احوی کو المرعی کی صفتِ مؤخر قرار دیا ہے، اُنھوں نے أحوی کو مذکورہ دوسرے معنوں میں لیا ہے اور ان کی رائے میں دونوں آیات کا مفہوم یہ ہے:

''وہ جس نے سیاہی مائل سبز نباتات اُگائی اور پھر اسے خس و خاشاک بنادیا۔''

گویا أحوٰی کے دو مختلف لغوی معنوں کے باوصف جس مفہوم پر علماے لغت اور مفسرین کرام رحمہم اللہ کا کامل اتفاق اور اجماع ہے، وہ یہ ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و عجیبہ ہے کہ اس نے پہلے سبزہ پیدا کیا اور ہر طرح کی نباتات اُگائی اور پھر کچھ عرصے کے بعد اُسے خس و خاشاک اور خشک و سیاہ چورے میں تبدیل کردیا۔''

سورۂ اعلیٰ کی ان دونوں آیات کی یہی تفسیر قرآنِ مجید کے دوسرے نصوص اور نظائر سے مطابقت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

3۔ قرآنِ مجید کے نظائر:

1۔ سورۂ زمر میں ارشاد ہوا:

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر: 21)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی آسمان سے پانی اُتارتا ہے۔ پھر اسے چشمے بنا کر زمین میں چلا دیتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے سے مختلف رنگوں کی کھیتی اُگاتا ہے، پھر وہ خوب بڑھتی ہے۔ پھر تو اُسے زرد شدہ دیکھتا ہے، پھر وہ اسے ریزہ ریزہ کردیتا ہے۔ بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بڑی نصیحت ہے۔''

2۔ سورۂ حدید میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾ (الحدید: 20)

''جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا اور زیبائش اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور ایک دوسرے سے زیادہ مال اور اولاد چاہنا ہے، جیسے بارش کی حالت کہ اس کی روئیدگی سے کسان خوش ہو جائیں پھر وہ اُبھرے اور تم اُسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔''

3۔ سورۂ کہف میں بیان ہوا:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ (الکہف: 45)

''اور ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو جیسے پانی کہ جسے ہم نے آسمان سے برسایا پھر زمین کی روئیدگی پانی کے ساتھ مل گئی۔ پھر وہ ریزہ ریزہ ہو گئی جسے ہوائیں اُڑاتی پھرتی ہیں۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنا والا ہے۔''

آخری آیت میں ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴾ ...... ''اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔'' سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ سرسبز نباتات اُگانا اور پھر اُسے زرد خشک اور سیاہ خس و خاشاک کر دینا اور اُسے چورا بنا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ اور یہی مضمون سورۂ اعلیٰ کی زیر بحث آیات میں بھی دہرایا گیا ہے اور یہ چیز قرآن مجید میں تصریفِ آیات کے اُسلوب کے بالکل مطابق ہے کہ ایک ہی مضمون بار بار کئی طرح بیان ہوتا ہے اور اس سے ایک اور مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے کہ ((القرآن یفسر بعضه بعضا.)) ......یعنی'' قرآن کا بعض حصہ اس کے بعض حصے کی تفسیر کرتا ہے۔'' گویا قرآن اپنی تفسیر آپ کر دیتا ہے۔

4۔ حدیث سے دلیل:

قیامت کے بارے میں ایک حدیث میں غُثَآءً کا لفظ یوں آیا ہے:

((کما تنبت الحبة في غثاء السیل.))

(سنن دارمی: 1/61، مسند احمد: 12013)

"جیسے سیلاب کے خس و خاشاک میں دانہ اُگتا ہے۔"

اس میں لفظ غُثَآءً کی وضاحت ابن اثیر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب النہایۃ میں یوں کی ہے کہ:

((الغُثاء بالضم والمدّ: ما یجئ فوق السیل مما یحمله من الزبد والوسخ وغیره.)) (النهایة في غریب الحدیث والاثر، جلد 3، صفحه 343)

"مطلب یہ ہے کہ غُثَـآءً اُس جھاگ اور کوڑا کرکٹ کو کہتے ہیں جو سیلاب کے پانی کے اوپر آتا ہے۔"

خلاصۂ کلام:...... یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ کی زیر بحث آیات کا وہی مفہوم صحیح اور معتبر ہے جس کی تائید لغت سے ہوتی ہے اور جس کی موافقت قرآن و حدیث کے نصوص اور نظائر سے بھی موجود ہے اور جو اُمت مسلمہ کے تمام جلیل القدر مفسرین کرام کی متفقہ تفسیر کے بالکل مطابق ہے۔

5۔ اُردو تراجم:

اب ہم مذکورہ آیت کے سلسلے میں پاک و ہند کے علمائے کرام کے مستند اور متداول تراجم پیش کرتے ہیں:

(1) شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ:

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے فارسی ترجمے "فتح الرحمٰن" میں مذکورہ آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے:

وآنکہ بر آورد گیاہِ تازہ را۔ باز ساخت آں را خشک شدہ

سیاہ گشته.

''اور جس نے تازہ چارا نکالا۔ پھر اُسے خشک سیاہ بنادیا۔'' (راقم)

(2) شاہ رفیع الدین دھلویؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے نکالا چارہ، پس کردیا اس کو کوڑا سیاہ۔''

(3) شاہ عبدالقادر دھلویؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے نکالا چارہ۔ پھر کر ڈالا اس کو کوڑا کالا۔''

(4) مولانا فتح محمد خان جالندھریؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے چارہ اُگایا، پھر اُس کو سیاہ رنگ کا کوڑا کردیا۔''

(5) مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے چارہ پیدا کیا۔ پھر اس کو خشک سیاہ کردیا۔''

(6) نواب وحید الزمانؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے (جانوروں کے لیے) چارہ نکالا۔ پھر اس کو (سکھا کر) کوڑا بنا دیا کالا کردیا۔''

(7) مولانا محمود حسن دیو بندیؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے نکالا چارہ۔ پھر کر ڈالا اُس کو کوڑا سیاہ۔''

(8) مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے (زمین سے) چارہ نکالا، پھر اُس کو سیاہ کوڑا کردیا۔''

(9) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ:

''اور جس نے چارہ (زمین سے) نکالا، پھر اُسے سیاہ کوڑا کردیا۔''

(10) مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا ترجمہ:

''جس نے نباتات اُگائیں، پھر اُن کو سیاہ کوڑا کرکٹ بنادیا۔''

(تفہیم القرآن: 6/310)

کیا یہ سب حضرات عربیت سے نابلد تھے اور ان کو عربی نہیں آتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ جب مذکورہ آیت کے ایک ہی ترجمے اور مفہوم پر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سمیت پوری اُمت مسلمہ کے مفسرین متفق ہیں تو یہی ترجمہ لغت کی رُو سے درست ہے۔ قرآن و حدیث کے نظائر و شواہد کے مطابق بھی یہی ترجمہ ہے تو پھر اس سے ہٹ کر غامدی صاحب کے لیے اس آیت کا کوئی اور ترجمہ اخذ کرنا جہالت اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں!!

5۔ سورۃ الفیل کی غلط تاویل:

قرآنِ مجید کی سورۃ الفیل میں اصحاب الفیل (ہاتھی والوں) کے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی صحیح، متفقہ اور مجمع علیہ تفسیر میں بھی غامدی صاحب نے اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اصل واقعہ جس پر سلف سے خلف تک، تمام مفسرین کرام کا اتفاق اور اجماع ہے، مختصر طور پر یہ ہے کہ یمن کا ایک متعصب عیسائی حکمران اَبرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر ہاتھیوں کے ہمراہ خانہ کعبہ پر حملہ آور ہوا تاکہ اسے مسمار کردے۔ قریش مکہ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے، اس لیے وہ اس موقع پر قریب پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب وہ لشکر مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادی مُحَسَّر میں پہنچا تو اچانک ایک طرف سے پرندوں کے جھنڈ نمودار ہوئے، جنھوں نے اس لشکر پر سنگ ریزوں اور کنکروں کی بارش کردی۔ اس کے نتیجے میں ہاتھیوں سمیت پورا لشکر تباہ و برباد ہوگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے خانہ کعبہ کی حفاظت فرمائی اور ابرہہ کا منصوبہ ناکام بنادیا گیا۔ یہ واقعہ اسی سال پیش آیا جس میں حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی۔

اصحابِ فیل کے واقعے کی اس تفسیر پر تمام مفسرین کرام کا چودہ سو برس سے اتفاق اور اجماع موجود ہے۔ اس کے برعکس غامدی صاحب سورۂ فیل کا درج ذیل ترجمہ اور تفسیر فرماتے ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝﴾

''اللہ کے نام سے جو سراسر رحمت ہے، جس کی شفقت ابدی ہے۔''

''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا کیا؟ اُن کی چال کیا اُس نے اکارت نہیں کر دی؟ اور اُن پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیے؟ (اس طرح کہ) تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر اُنھیں مار رہا تھا اور اُس نے اُنھیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔'' (البیان، صفحہ 239، مطبوعہ جنوری 2000ء)

اس ترجمے میں سب سے پہلے الرَّحِيْم کے ترجمے ''جس کی شفقت ابدی ہے'' کی انفرادیت کی داد دیجیے گا اور اس کے بعد ﴿ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴾ کے ترجمہ ''(اس طرح کہ) تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر اُنھیں مار رہا تھا۔'' پر سر دُھنیے گا۔

پھر ذرا اُن تفسیری حواشی پر بھی نظر ڈالیے جو غامدی صاحب نے تحریر فرمائے ہیں۔ پہلی آیت کی وضاحت فرماتے ہوئے، اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

یمن کا نائب السلطنت ابرہہ جب نو ہاتھیوں اور ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر بیت الحرام کو ڈھا دینے کی غرض سے مکہ پر حملہ آور ہوا، تو قریش کھلے میدان میں، اُس کے مقابلے کی طاقت نہ پا کر منیٰ کے پہاڑوں میں چلے گئے، اور وہیں سے اُنھوں نے اس لشکر جرار پر سنگ باری کی۔ اُن کی یہ مدافعت، ظاہر ہے کہ انتہائی کمزور تھی، لیکن اللہ پروردگارِ عالم نے اپنی قوتِ قاہرہ اس میں شامل کر دی اور اس کے نتیجے میں ہوا کے تند و تیز طوفان (حاصب) نے ابرہہ کی فوجوں کو اس طرح پامال کیا کہ وادیٔ محصب میں پرندے دنوں اُن کی نعشیں نوچتے رہے۔ اُس زمانے کے ایک شاعر ابوقیس نے کہا ہے:

فأرسل من ربهم حاصب
يلفهم مثل لف القزم

"پھر اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر حاصب بھیجی گئی جو خس و خاشاک کی طرح اُنھیں لپیٹتی چلی جاتی تھی۔"

"تو نے دیکھا نہیں، میں واحد کے صیغے سے خطاب کا جو اُسلوب اس آیت میں ہے، یہ بالعموم اُس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب مخاطبین کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً متوجہ کرنا پیش نظر ہو۔" (البیان، صفحہ 239)

اس کے بعد تیسری آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ ابرہہ کی فوجوں کی بے بسی سے کنایہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ساف و حاصب کے طوفان سے اُنھیں اس طرح پامال کیا کہ کوئی اُن کی لاشیں اُٹھانے والا بھی نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی تھیں اور گوشت خور پرندے اُنھیں نوچنے اور کھانے کے لیے، اُن پر جھپٹ رہے تھے۔" (البیان، صفحہ 240)

پھر آگے چل کر آیت 4 کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اصل میں تَرْمِيْهِمْ ہے۔ یہ اس سے پچھلی آیت میں عَلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور سے حال واقع ہوا ہے۔ ہوا کہ تند و تیز تھپیڑوں کے ساتھ ابرہہ کے لشکر پر آسمان سے جو سنگ باری ہوئی، اس کے لیے اگر غور کیجیے تو یہ لفظ نہایت صحیح استعمال ہوا ہے۔ پرندوں کے پتھر پھینکنے کے لیے، جس طرح کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، اسے کسی طرح موزوں قرار نہیں دیا جا سکتا۔" (البیان، صفحہ 240)

پھر آگے چل کر آیت 54 کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اصل میں كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ کے الفاظ آئے ہیں۔ کسی چیز کا نام اُس کے انجام کے لحاظ سے رکھنا عربی زبان کا ایک معروف اُسلوب ہے۔ یہ اسی نوعیت کی ترکیب ہے اور آیت کا مدعا یہ ہے کہ تمہاری مدافعت اگرچہ ایسی کمزور تھی کہ

تم پہاڑوں میں چھپے ہوئے اُنہیں کنکر پتھر مار رہے تھے، لیکن جب تم نے حوصلہ کیا اور جو کچھ تم کر سکتے تھے، کر ڈالا تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق تمہاری مدد کی اور ساف و حاصب کا طوفان بھیج کر اپنی ایسی شان دکھائی کہ انھیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔" (البیان، صفحہ 241)

غامدی صاحب نے سورۃ الفیل کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ قرآن کے نظائر، اجماعِ اُمت اور تاریخ و کلامِ عرب کے خلاف ہے، اس لیے نا قابل قبول ہے۔ اب ہم اپنے نقطہ نظر کو تفصیل سے پیش کریں گے۔

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر:

سب سے پہلے ہم اس سورہ کی تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کو دیکھتے ہیں:

1۔ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں صحیح بخاری کی اس حدیث ((إِنَّ اللّٰہَ حبس عن مكة الفيل.)) کی شرح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ؛

((وأخرجه ابن مردويه بسند حسن عن عكرمة، عن ابن عباس قال: جاء أصحاب الفيل حتى نزلوا الصفاح وهو بكسر المهملة ثم فاء ثم مهملة موضع خارج مكة من جهة طريق اليمن، فأتاهم عبدالمطلب فقال: إن هذا بيت الله لم يسلط عليه أحدا، قالوا لا نرجع حتى نهدمه، فكانوا لا يقدمون فيلهم إلا تأخر، فدعا الله الطير الأبابيل فأعطاها حجارة سوداء فلما حاذتهم رمتهم فما بقي منهم أحد إلا أخذته الحكة فكان لا يحكّ أحد منهم جلده إلا تساقط لحمه.)) (جلد 15، صفحہ 255، مطبوعہ بیروت)

"اور ابن مردویہ نے عکرمہ سے اور اُنہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ روایت کی ہے کہ ہاتھیوں والے آئے اور وہ صفاح کے مقام پر پہنچ گئے جو

مکہ سے باہر (مضافات میں) یمن کے راستے پر ایک جگہ کا نام ہے۔
عبدالمطلب ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: ''یہ اللہ کا گھر ہے جس پر وہ کسی اور کو مسلط نہیں ہونے دیتا۔'' وہ بولے: ''ہم اس کو گرائے بغیر واپس نہ جائیں گے۔'' اُن کے ہاتھی آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ اس وقت اللہ نے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بلا لیے، ان کو سیاہ کنکر دے دیے۔ پھر جب وہ لشکر کے پاس پہنچے تو اُنہوں نے اُن پر کنکر برسائے (جس سے وہ سب مر گئے) اور جو کوئی بچ گیا تو اسے حُکّہ (جلد کی بیماری) نے آ لیا جس سے اس کے جسم کا گوشت اس سے الگ ہو کر گر جاتا تھا۔''

2۔ امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں سورۃ الفیل کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے:

((روی عن عکرمة عن ابن عباس، قال: لما أرسل الله الحجارة علی أصحاب الفیل لم یقع حجر علی أحد منهم إلا نفط جلده وثار به الجدري.)) (ج 32، ص 100، مطبوعہ تہران)

''عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں پر کنکر بھیجے تو ان میں سے جس کو وہ کنکر لگا، اس کی کھال گلنے لگی اور اس کو جدري (جلد کی بیماری) نے آ لیا۔''

اب ظاہر ہے قرآن کی جس تفسیر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مجمل طور پر بیان کر رہی ہو، اسی حدیث کی تشریح ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرما رہے ہوں تو پھر اس تفسیر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھیوں کو مکہ پہنچنے سے روک دیا اور پرندوں کے کنکر پھینکنے کے ذریعے ان کو تباہ کر دیا تھا اور اس دعویٰ کا کیا جواز رہتا ہے کہ ہاتھیوں کا لشکر تو قریش کے پتھراؤ سے برباد ہوا اور پرندے صرف ان کی لاشوں کو کھانے کے لیے آئے تھے۔

2۔قرآن کا اسلوبِ بیان:

سب سے پہلے اس سورہ میں قرآنِ مجید کے اسلوبِ بیان پر غور کریں تو آغاز میں أَلَمْ تَرَ (کیا تو نے نہیں دیکھا) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان قرآن میں عموماً غیر معین مخاطب کے لیے آتا ہے۔ جسے اصطلاح میں خطاب لغیر معین کہا جاتا ہے اور یہ استفہامِ انکاری کے طور پر آتا ہے۔ اس اُسلوب میں کوئی خاص فرد یا گروہ مخاطب نہیں ہوتا بلکہ عام انسانوں سے خطاب کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ہے کہ؛

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ (الفجر: 6)

''کیا تو نے دیکھا کہ تیرے رب نے قومِ عاد سے کیا سلوک کیا۔''

ایک اور مثال یہ ہے کہ؛

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (الفرقان: 45)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے ربّ نے سائے کو کیسے پھیلایا ہے۔''

اس طرح سورۂ فیل کے شروع میں بھی أَلَمْ تَرَ کا خطاب کسی خاص فرد یا گروہ کے لیے نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے خاص قریش کو مخاطب ماننا ہرگز درست نہیں ہے۔

3۔تفسیر القرآن بالقرآن:

قرآن کی تفسیر کا سب سے عمدہ اور اعلیٰ اُصول جسے سب جانتے ہیں، یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے۔ اس اُصول کے مطابق جب ہم سورۂ فیل پر غور کرتے ہیں تو اس کی کئی نظیریں موجود ہیں۔

ا پہلی نظیر یہ ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ (الفجر: 6)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے ربّ نے قومِ عاد سے کیا سلوک کیا۔''

یہ آیت اپنے اندازِ بیان ہی سے واضح کر رہی ہے کہ قومِ عاد کے لیے جس عذابِ الٰہی

کی طرف اشارہ ہے، اس میں کسی انسانی کوشش اور کسب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ قومِ عاد پر جو عذاب بھیجا گیا وہ کوئی انسانی فعل نہیں تھا بلکہ سراسر قدرتِ الٰہی کا کرشمہ تھا۔

﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ﴾ ...... ''کیا تو نے دیکھا کہ تیرے ربّ نے کیا کیا۔'' کے اُسلوب سے واضح ہے کہ اس کے ضمن میں واقع ہونے والے فعل کا فاعل صرف ربّ ہی ہے۔ بالکل اسی طرح سورۂ فیل کے شروع میں بھی پہلی آیت یوں ہے کہ؛

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾ (الفیل : 1)

''کیا تو نے دیکھا کہ تیرے ربّ نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔''

اس آیتِ زیرِ بحث کا اُسلوبِ بیان بھی اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ آگے جو فعل بیان ہوگا اس کا فاعل صرف ربّ ہے، بندوں کے فعل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا اصحابِ فیل کے واقعے کی تفسیر میں ابرہہ کے لشکر کو تباہ کرنے میں بندوں کا خواہ وہ قریش ہوں یا کوئی اور، قطعاً کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ قریش کے کسی فعل کو بیان کرنے کے لیے یہ اُسلوب بالکل مناسب نہیں ہے۔

ب دوسری نظیر یہ ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ﴾ (الفرقان : 45)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے ربّ نے سائے کو کیسے پھیلایا ہے۔''

ظاہر ہے اشیا کا سایہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے گھٹتا بڑھتا ہے اور سورج کی روشنی کے مختلف زاویوں سے بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت میں انسانی فعل اور کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ یہاں بھی اُسلوبِ بیان وہی ہے جو سورۂ فیل کے شروع میں بیان ہوا ہے۔

ج تیسری نظیر یہ ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ﴾ (العنکبوت : 19)

''کیا اُنہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ کس طرح پہلی بار پیدا کرتا ہے اور پھر دوبارہ پیدا کرے گا۔''

یہ حقیقت ہے کہ اشیاء کو پہلی بار پیدا کرنا اور دوبارہ پیدا کرنا، صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت وصنعت ہے، اس میں انسانی محنت اور کوشش کا کوئی دخل نہیں۔

اس آیت کا اندازِ بیان بھی سورۂ فیل کی مذکورہ آیت جیسا ہے، لہٰذا اصحابِ فیل کی تباہی و بربادی میں بھی قریش یا دوسرے انسانوں کی کسی کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

د چوتھی نظیر یہ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴾ (نوح: 15)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح اوپر تلے سات آسمان پیدا کیے ہیں۔''

اب ظاہر ہے کہ جس طرح سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر تلے پیدا کرنے میں کسی انسان کے کسب وفعل کو دخل نہیں، اسی طرح سورۂ فیل میں بھی اس کے آغاز کے اُسلوب بیان میں اصحابِ فیل کی تباہی و بربادی میں قریش کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔

4۔ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ کے معنی:

قرآن میں جہاں کہیں کسی قوم کی ہلاکت و برباد کے سلسلے میں اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ کے الفاظ آئے ہیں، وہاں اس کے بعد آنے والا اسم اس قول کی ہلاکت و بربادی کی شکل کے طور پر آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو عذاب کی صورت قرار دیا ہے۔ قرآن میں اس کی کئی مثالیں ہیں:

الف: پہلی مثال یہ ہے:

﴿وَفِي عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴾ (الذاریات: 41)

''اور عاد کے بارے میں، جب ہم نے اُن پر منحوس آندھی چلادی۔''

اس مقام پر جس طرح أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ کے بعد جو الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ (منحوس آندھی) ہے، وہ قومِ عاد پر عذاب کی شکل ہے جس سے ان کی ہلاکت و بربادی ہوئی۔ بالکل اسی طرح ﴿ وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ﴾ ...... ''اور ہم نے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ مسلط کردیے۔'' میں بھی أُرْسَلَ عَلَيْهِمْ کے بعد جو طَيْرًا اَبَابِيْلَ (جھنڈ کے جھنڈ پرندے) آیا

ہے تو یہی عذابِ الٰہی کی وہ صورت ہے جس کے ذریعے اصحابِ فیل کی تباہی و بربادی ہوئی۔ اس کے باہر عذاب کا کوئی اور سبب تلاش کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ب: دوسری مثال یہ ہے:

﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ﴾ (سبا: 16)

''پھر ہم نے اُن پر بند کا سیلاب مسلط کر دیا۔''

اس مقام پر بھی قومِ سبا جس ذریعے اور سبب سے ہلاک ہوئی وہ سَيْلَ الْعَرِمِ ہے جو اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ کے فوراً بعد آیا ہے۔ بالکل یہی انداز سورۂ فیل کا بھی ہے۔

ج: تیسری مثال یہ ہے:

﴿لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الذاریات: 33)

''تاکہ ہم اُن پر کھنگر کے پتھر برسائیں۔''

اس جگہ پر قومِ لوط علیہ السلام کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ (تاکہ ہم اُن پر مسلط کر دیں) کے بعد حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ (کھنگر کے پتھر) آیا ہے جو کہ قومِ لوط کی ہلاکت و بربادی کی شکل ہے۔ بالکل یہی معاملہ سورۂ فیل میں بھی ہے۔ وہاں بھی وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ میں طَيْرًا اَبَابِيْلَ ہی اصحابِ فیل کی تباہی کی صورت اور ذریعہ بنے ہیں نہ کہ قریش کا پتھراؤ یا کچھ اور۔

5۔ تَرْمِيْهِمْ کا مفہوم

غامدی صاحب تَرْمِيْهِمْ میں فعل کا فاعل قریش کو قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ قریش کا سرے سے اس سورت میں کہیں ذکر نہیں اور یہ ان کی اپنی اختراع اور اُپچ کے سوا کچھ نہیں۔

ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اَلَمْ تَرَ کا خطاب عام اور غیر معین ہوتا ہے۔ اس سے کوئی خاص گروہ مراد لینا قرآنی اسلوب کے خلاف ہے۔ اس لیے یہاں قریش مخاطب نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان کو یہاں مخاطب سمجھنا قرآنِ مجید کی معنوی تحریف کے زمرے میں آتا

ہے۔سیدھی بات یہ ہے کہ تَرْمِيهِمْ میں فاعل کی ضمیر اپنے قریبی مرجع طَيْرًا أَبَابِيلَ کی طرف لوٹتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ یہ پرندوں کے جھنڈ ہی تھے جو ہاتھی والوں پر کنکریاں پھینکتے تھے اور جس کے نتیجے میں اصحابِ فیل تباہ ہوئے۔

اس مقام پر ایک اور لغوی نکتہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔کہ عربی زبان میں رمي کا فعل کسی چیز کو صرف بازو یا فلاخن (بازو سے گھما کر کسی چیز کو غلیل کی طرح دور تک پھینکنے والا آلہ) کے ذریعے پھینکنے کے معنوں میں آتا ہے اور یہ لفظ اوپر سے کسی چیز کو گرانے کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔لیکن ان لوگوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے۔حقیقت یہ ہے کہ عربیت میں رمي کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے۔اس کے معنی کسی چیز کو ہاتھ یا فلاخن سے پھینکنے کے بھی ہیں اور بلندی سے نشانہ باندھ کر کوئی چیز نیچے گرانے کے معنی بھی ہیں۔اصل میں اس لفظ کے مفہوم میں بلندی یا پستی کا کوئی مفہوم شامل نہیں بلکہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم کسی چیز کا نشانہ لے کر اس پر کوئی شے پھینکنا ہے۔اہل عرب آج کل لڑاکا اور بمبار طیاروں کی گولہ باری اور بمباری ے لیے بھی یہی رمي کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔قرآن میں رمي کے مجازی معنی کسی پر تہمت لگانے، الزام تراشی کرنے اور بہتان طرازی کرنے کے بھی آئے ہیں، جیسا کہ سورۂ نور میں ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ (النور: 4)

"اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں۔"

لہٰذا رمي کے لفظ کو صرف بازو اور فلاخن کے ذریعے کسی چیز کے پھینکنے کے معنوں میں محدود اور منحصر سمجھنا عربیت کے خلاف ہے۔

6۔بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ کے معنی:

تفسیر کا یہی طریقہ سب سے عمدہ اور مستند ہے کہ پہلے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے۔اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيلٍ کے الفاظ اسی انداز

میں صرف دو بار آئے ہیں اور دونوں مقامات پر ان سے مراد ''عذابِ الٰہی کے پتھر'' ہیں نہ کہ انسانوں (یا قریش) کے پھینکے ہوئے پتھر۔

پہلی جگہ یہ الفاظ سورۂ ھود کی آیت 82 میں اس طرح آئے ہیں کہ؛

﴿فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝﴾ (ھود: 82)

''پھر جب ہمارا حکم آن پہنچا تو ہم نے اس (بستی) کی بلندی کو پستی بنا دیا اور ہم نے وہاں کھنگر کے پتھر برسا دیے۔''

یہ قومِ لوط پر عذابِ الٰہی کی کیفیت کا بیان ہے۔ اس بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ کے الفاظ واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے عذاب کے پتھروں کے لیے آئے ہیں۔ ان سے انسانوں کے پھینکنے ہوئے پتھر یہاں کسی صورت مراد نہیں لیے جا سکتے۔

دوسرے مقام پر یہی الفاظ سورۃ الحجر کی آیت 74 میں آئے ہیں:

﴿فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾

''پھر ہم نے اُس (بستی) کو زیر و زبر کر دیا اور اُن لوگوں پر کھنگر کے برسا دیے۔''

اس جگہ بھی ﴿ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴾ کے الفاظ انسانوں کے پھینکے ہوئے پتھروں کے مفہوم میں نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی صورت میں برسائے گئے اُن پتھروں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جن کے ذریعے قومِ لوط کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ بالکل یہی الفاظ ﴿ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴾ جب سورۃ الفیل میں بھی آئے ہیں تو ہم کیوں نہ ان سے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابرہہ کے لشکر پر عذاب کی صورت میں برسائے گئے پتھر مراد لیں جو اُن پر پرندوں کے ذریعے پھینکے گئے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس لشکر پر مسلط کر دیا تھا۔ جب یہاں قرآن کی تفسیر قرآن سے ہو سکتی ہے تو کیوں ان الفاظ کی دور از کار تاویلیں کی جائیں۔

7۔ حَاصِبٌ یعنی سخت آندھی:

غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ اصحابِ فیل کا لشکر تباہ کرنے میں دو عناصر کارفرما تھے: ایک قریش کی طرف سے پتھر پھینکنا اور دوسرے بعد میں اچانک سخت آندھی (حاصب) آ جانا، مگر یہ تاویل کئی لحاظ سے صحیح نہیں ہے۔

الف: اوّل یہ کہ اس آندھی (حاصب) کے آنے کا کوئی ذکر سورۂ فیل میں نہیں آیا ہے صرف پرندوں کے جھنڈ بھیجے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے کون سی تاویل اختیار کی جائے: وہ جسے قرآن بیان کرتا ہے یا وہ جسے قرآن بیان نہیں کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اصحابِ فیل کی تباہی میں آندھی (حاصب) کا عنصر شامل کرنا ایک غلط تاویل ہے اور یہ ایک من گھڑت افسانے سے زیادہ نہیں۔

ب: منیٰ کی پہاڑیوں سے قریش کا وادیٔ مُحسّر میں پتھر پھینک لینا یوں بھی ممکن نہیں، جو لوگ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، وہ ان دونوں وادیوں کی وسعت سے بخوبی واقف ہیں۔

ج: تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اگر یہ ممکن ہے کہ وہ بے جان ہوا میں اتنی طاقت پیدا کر سکتا ہے جس کے ذریعے کوئی لشکر تباہ ہو جائے تو کیا اللہ تعالیٰ سے یہ ناممکن ہے کہ وہ جاندار پرندوں کے پھینکے ہوئے سنگریزوں کے ذریعے کسی لشکر کو برباد کر سکے۔ کیا یہ بات آج ایٹمی دور کے انسان کی عقل سے بالاتر ہے کہ اللہ تعالیٰ بلندی سے پتھروں کو گرا کر اُن سے چھوٹے چھوٹے ایٹم بموں کا کام نہیں لے سکتا۔ افسوس ایسی انسانی عقل پر جو کہ ایک جگہ معجزے کا انکار کر دیتی ہو اور دوسری جگہ معجزے کا اقرار کر لیتی ہو۔

8۔ نصرتِ الٰہی کا قانون:

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اصحابِ فیل کے واقعے کو بھی اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ افراد کی جدوجہد ہوگی تو اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرے گا۔ اگر بندے کوئی

کوشش نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی اُن کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت نصرت و تائید بندوں کی کوشش کے ساتھ ہر حال میں مشروط نہیں ہے۔ قرآنِ مجید میں ایسے بکثرت واقعات موجود ہیں اور تاریخ اسلام بھی اس پر شاہد ہے کہ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے کمزور اور عاجز بندے کسی بوجھ اور ذمہ داری کو اُٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے تو وہ اپنے خاص فضل و کرم سے بندوں کو اُن کی سعی و کوشش کے بغیر ہی اپنی تائید و نصرت سے نوازتا ہے۔

مثال کے طور پر جب سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں ڈالا گیا تھا تو اُس وقت اُن کی کون سی سعی و کوشش تھی جس کے نتیجے میں وہ آتشِ نمرود سے محفوظ رہے؟ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کی وہ کون سی جدوجہد تھی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آتش کدے کو سرد کر دیا تھا۔ یا جب حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں چلے گئے تو ان کی وہ کون سی کوشش اور عملی جدوجہد تھی جس کے نتیجے میں ان کو وہاں سے نجات ملی؟ اگر یہ کہا جائے کہ اُنہوں نے اس مصیبت کے وقت دعا اور تسبیح کی تھی تو یہی دعا واقعہ اصحابِ فیل میں بھی موجود ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ عبدالمطلب اور دوسرے سردارانِ قریش نے خانہ کعبہ کے دروازے پر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ وہ اُن کو ابرہہ کے لشکر کے خطرے سے بچائے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی اور قریش کو اس آفت سے نجات دلائی۔

یا پھر جب حضرت محمد ﷺ مکہ سے ہجرت فرماتے وقت اپنے گھر سے نکل رہے تھے اور اس گھر کا محاصرہ شمشیر بردار جوانوں نے کر رکھا تھا تو اس وقت نبی ﷺ نے اپنے تحفظ کے لیے کون سی عملی کوشش فرمائی تھی جس کے نتیجے میں آپ ﷺ دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر گھر سے بحفاظت نکل گئے تھے۔

اور یہ تو انفرادی واقعات کی مثالیں تھیں۔ اجتماعی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت کا قانون صرف وہ نہیں جو غامدی صاحب نے سمجھ رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر فلسطین جا رہے تھے اور ان کے آگے بحیرۂ قلزم کی

موجیں اور پیچھے فرعون کی فوجیں تھیں تو اس وقت وہ کون سی عملی جدو جہد تھی جس کے نتیجے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سمندر کو بحفاظت پار کر گئے اور فرعون اپنے لشکروں سمیت غرق ہو گیا؟

غامدی صاحب اس واقعے کی جہت سے تاویل کریں گے کہ اُس وقت بحر قلزم کے مدو جزر کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو بسلامت پار اُتر گئے لیکن اندھے فرعون اور اس کے لشکروں کو سمندر کی اس صورتِ حال کا علم نہیں ہو سکا اور وہ مدو جزر کی زد میں آ کر غرق ہو گئے تھے۔ مگر یہ تاویل قرآن کے صریح الفاظ اور نصوص کے اس قدر خلاف ہے اور عقلی اعتبار سے اتنی بھونڈی ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں۔

9۔ تاریخ و کلام عرب کی شہادت:

خود تاریخ و کلامِ عرب کی شہادت بھی سورۂ فیل کی متفقہ اور مجموعہ علیہ تفسیر کی تائید کرتی ہے کہ پرندوں کی سنگ باری ہی سے ابرہہ کا لشکر تباہ ہوا تھا۔

نفیل بن حبیب، جو کہ قبیلہ خثعم سے تعلق رکھتا تھا اور جس نے ایک موقع پر ابرہہ کے لشکر کی رہنمائی بھی کی تھی، اُس موقع پر کہتا ہے کہ:

حَمِدْتُ اللّٰهَ إِذْ أَبْصَرْتُ طَيْرًا
وَخِفْتُ حِجَارَةً تُلْقَى عَلَيْنَا

”جب میں نے پرندوں کو دیکھا تو اللہ کی تعریف کی اور ان پتھروں سے ڈرا جو ہم پر پھینکے جا رہے تھے۔“

(محمود شکری آلوسی، بلوغ الارب، 1/545، مترجم ڈاکٹر پیر محمد حسن، لاہور، 1967ء)

اسی طرح عبداللہ بن قیس جو کہ قبیلہ بن عامر بن لوی بن غالب سے تھا، اُس نے اس واقعے کے بارے میں یہ اشعار کہے تھے:

كَادَهُ الْأَشْرَمُ الَّذِي جَاءَ
بِالْفِيلِ فَوَلَّى وَجَيْشُهُ مَهْزُومٌ

وَاسْتَهَلَّتْ عَلَيْهِمُ الطَّيْرُ
بِالْجَنْدَلِ حَتّٰى كَأَنَّهُ مَرْجُوْمٌ

”(ابرہہ) اشرم نے جو ہاتھی لے کر آیا تھا اس کعبے کے خلاف چال چلی مگر اس کی فوج کو شکست ہوگئی اور وہ پیٹھ دکھا کر لوٹ گیا۔ پرندوں نے اُن پر پتھروں سے ہلہ بول دیا اور اس کی حالت یہ ہوگئی کہ گویا اسے سنگسار کر دیا گیا ہے۔“

(بلوغ الارب، جلد اوّل، صفحہ 552)

10۔ اجماعِ اُمت کے خلاف:

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن و سنت کے جن تفسیری اُمور پر اجماعِ اُمت ہے، اُس کے خلاف کوئی تاویل جائز نہیں۔ ایسی ہر تاویل گمراہی اور ضلالت کے سوا کچھ نہیں۔ سورۂ فیل کی متفقہ اور مجمع علیہ تفسیر وہی ہے جو ہم اس مضمون کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں، اس کے ہوتے ہوئے محض اختلاف کے شوق میں نئی تفسیر کرنا ہرگز درست نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ چودہ برس سے پوری اُمت مسلمہ تو قرآنِ مجید کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی اور صرف آج کل کے غامدی صاحب جیسے نام نہاد دانشور اُسے سمجھتے ہیں۔ کیا عقل سلیم یہ مان سکتی ہے کہ سلف و خلف کے علمائے اسلام تو کتابِ مبین کی صحیح تفسیر نہیں کر سکتے اور آج کے وہ لوگ جن کا سرمایۂ افتخار ہی مغرب زدگی اور روشن خیالی ہے۔ جن کے اذہان مغرب سے مرعوب ہو کر اصول دین کو بگاڑنے میں سرگرم عمل ہیں۔ جو ”سبیل المؤمنین“ کی شاہراہ کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی پگڈنڈیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ جن کے جنونِ اختلاف نے ان کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے؛ وہ کتاب اللہ کی پہلی بار درست تفسیر فرما رہے ہیں؟

دراصل سورۂ فیل کا مرکزی مضمون اور موضوع قریش کو ہیرو بنا کر پیش کرنا اور اللہ تعالیٰ کو اُن کا محض معاون و مددگار ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ اس سورہ کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے نوعِ انسانی کے سامنے یہ حقیقت کھول کر بیان کی ہے کہ فی الواقع وہی قادرِ مطلق ہے۔ وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے جو چاہے کر سکتا ہے۔ سب کے

سامنے اصحابِ فیل کا واقعہ ہوا تھا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاہرہ تھی جس نے خانہ کعبہ کی حفاظت فرمائی کیوں کہ قریش کے لیے بیت اللہ کا دفاع کرنا ممکن نہ تھا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک کمزور اور حقیر مخلوق پر پرندوں کے ذریعے ایک بڑے طاقتور دشمن کو نیست و نابود کر دیا اور قریش کو بھی ہلاکت و بربادی سے بچا لیا۔ شرک کے پجاری اور اُن کے جھوٹے معبود سب بے بس تھے، مگر اس موقع پر صرف اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ تھی، جس نے اپنے گھر کو اور اہل مکہ کو ایک عظیم خطرے اور آفت سے محفوظ رکھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی قادرِ مطلق اور معبودِ حقیقی ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور بندوں کو صرف اُسی کی عبادت کرنی چاہیے۔

10۔ 'نظمِ کلام' کا نظریہ:

ہمارے ہاں 'نظم کلام' کا نظریہ سب سے پہلے مولانا حمید الدین فراہی نے پیش کیا۔ ان کی تقلید میں مولانا امین احسن اصلاحی اس نظریے کو لے کر آگے بڑھے جنھوں نے اپنی دو کتابوں 'مبادیٔ تدبر قرآن'، اور تفسیر 'تدبر قرآن' میں اس نظریے کا خوب پرچار کیا اور آج کل اس نظریے کے علمبردار غامدی صاحب ہیں۔

'نظم کلام' کے اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی ہر سورۃ کا ایک مرکزی مضمون یا موضوع، یا عمود ہوتا ہے۔ اس سورۃ کی تمام آیات اسی موضوع سے متعلق ہوتی ہیں۔ ہر سورۃ کے آغاز میں بالعموم ایک تمہید اور آخر میں ایک خاتمہ ہوتا ہے۔ پوری سورۃ باہم مربوط اور ایک کامل وحدت کی شکل میں ہوتی ہے۔

مگر یاد رہے یہ 'نظم کلام' اس چیز بھی بالکل مختلف ہے جسے عام طور پر سیاق وسباق کہا جاتا ہے۔

چنانچہ غامدی صاحب اس نظریے کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''قرآن کی ہر سورہ کا ایک متعین نظم کلام ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الگ الگ اور متفرق ہدایات کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس کا ایک موضوع ہے اور اس کی تمام آیتیں نہایت حکیمانہ ترتیب اور مناسبت کے ساتھ اس موضوع سے متعلق

ہوتی ہیں۔" (میزان، ص50، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

وہ چیز جو قرآن کو برہان قاطع بناتی اور تاویل کے تاویل اختلافات ختم کر کے امام فراہی کے الفاظ میں 'القرآن لا یحتمل الا تاویلا واحدا' (قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی) کی حقیقت اس سے متعلق ثابت کر دیتی ہے وہ تنہا نظم ہی ہے۔" (حوالہ بالا، ص51۔52)

"مدرسہ فراہی کے ائمہ نے اپنی تفسیروں میں اس نظم کو مبرہن کر دیا ہے اس کے بعد اب اس کے وجود وعدم وجود پر تو کسی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

(حوالہ بالا، ص52)

مگر اس 'نظم کلام' کے چند کرشمے دیکھیے:

1۔ سورۂ النصر جو کہ بالاتفاق مدنی سورہ ہے، غامدی صاحب پہلے تو اسے مکی قرار دیتے ہیں اور پھر اس میں سے یہ 'نظم کلام' برآمد کرتے ہیں کہ اس سورۂ کا مرکزی مضمون اور موضوع فتح کی خوشخبری ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سورۂ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے اس سورۂ (النصر) کے مقام سے واضح ہے کہ سورۂ کوثر کی طرح یہ بھی، ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلہ ہجرت و برأت میں آپ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔"

(البیان، ص252، طبع ستمبر 1998ء لاہور)

"سورۂ النصر کا مرکزی مضمون آپ کے لیے سرزمین عرب میں غلبۂ حق کی بشارت اور آپ کو یہ ہدایت ہے کہ اس کے بعد آپ اپنے پروردگار سے ملاقات کی تیاری کریں۔

"یہ عظیم پیش گوئی جس زمانے میں دی گئی، اس وقت کوئی شخص اس کے پورا ہو جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، لیکن تاریخ گواہی دیتی ہے کہ اس کے کم وبیش آٹھ سال بعد یہ اس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی کہ اس کے بعد کوئی شخص اسے جھٹلانے کا تصور نہ کر سکا۔"

(حوالہ بالا، ص255۔256)

حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ سورۃ النصر کے مدنی ہونے پر تمام مفسرین کرام کا اتفاق ہے اور اس پر بھی کہ اس کا مرکزی مضمون بشارت نہیں بلکہ نبی ﷺ کی وفات کا اعلان ہے۔

2۔ سورۃ الفیل کا عجیب وغریب ترجمہ وتفسیر غامدی صاحب یوں کرتے ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ○ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ○ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ○ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ○﴾ (الفیل : 1۔5)

''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا کیا؟ ان کی چال کیا اس نے اکارت نہیں کر دی؟ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے مسلط نہیں کر دیئے؟

(اس طرح کہ) تو پکی ہوئی مٹی کے پتھر انہیں مار رہا تھا اور اس نے انہیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔''

پھر اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

''ابرہہ جب نو ہاتھیوں اور ساٹھ ہزار کا لشکر لے کر بیت الحرام کو ڈھا دینے کی غرض سے مکہ پر حملہ آور ہوا، تو قریش کھلے میدان میں، اس کے مقابلے کی طاقت نہ پا کر منیٰ کے پہاڑوں میں چلے گئے اور وہیں سے انہوں نے اس لشکر جرار پر سنگ باری کی۔ ان کی یہ مدافعت، ظاہر ہے کہ انتہائی کمزور تھی۔ لیکن اللہ پروردگارِ عالم نے اپنی قوت قاہرہ اس میں شامل کر دی اور اس کے نتیجے میں ہوا کہ تیز وتند طوفان (حاصب) نے ابرہہ کی فوجوں کو اس طرح پامال کر دیا کہ وادی محصب میں پرندے دنوں ان کی نعشیں نوچتے رہے۔''

(البیان، ص239، 240 طبع ستمبر 1998ء لاہور)

ہم نے اس ترجمہ وتفسیر کی غلطی کو اپنی اسی کتاب کے اندر ایک مضمون کی شکل میں واضح

کر دیا ہے، وہاں دیکھ لیا جائے۔

3۔ سورۂ لہب کا ترجمہ وتفسیر غامدی صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ○ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ○ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ○ وَامْرَاَتُهٗ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ○ فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ○﴾

"ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوا۔ اس کا مال ہی اس کے کام آیا، اور نہ وہ (خیر) جو اس نے کمایا۔ یہ (شعلہ رو) اب زیادہ دن نہ گزریں گے کہ شعلہ زن آگ میں پڑے گا۔ اور (اس کے ساتھ) اس کی بیوی بھی۔ اس طرح کہ (دوزخ میں) وہ (اپنے لیے) ایندھن ڈھو رہی ہوگی، (لونڈیوں کی طرح) اس کے گلے میں بٹی ہوئی رسی ہوگی۔"

(البیان، ص 260۔ 261 طبع ستمبر 1998ء لاہور)

پھر اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں:

تاریخ گواہ ہے کہ ابولہب اور اس کے اعوان وانصار کے ہلاک ہو جانے کی یہ پیشین گوئی، اس کے کم وبیش دو سال بعد، غزوۂ بدر کے موقع پر، اس طرح حرف بہ حرف پوری ہوئی کہ پہلے ابولہب کے ساتھی، قریش کے بڑے بڑے سردار اس غزوہ میں ہلاک ہوئے، وہ خود اس جنگ میں شریک نہیں تھا، بلکہ اس نے اپنے ایک مقروض کو، اپنی جگہ اس وعدے کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ اس کے عوض میں وہ اس کا قرض معاف کر دے گا۔ لیکن خدا کے عذاب سے بچنے کی یہ تدبیر بھی کارگر نہیں ہوئی اور غزوۂ بدر کے کچھ ہی عرصہ بعد عدسہ کی بیماری میں مبتلا ہو کر، وہ اس رسوائی اور بے بسی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا کہ چھوت کے اندیشے سے، اس کے خاندان والوں، ساتھیوں، دوستوں، یہاں تک کہ اس کے بیٹوں نے بھی اس کی خبر گیری نہیں کی۔ مرنے کے بعد کئی دن تک اس کی لاش گھر ہی میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں نے طعنے دیے، تو اس کے بیٹوں نے کرایہ کے کچھ حبشیوں کی مدد سے، اسے مکہ

کے بالائی حصہ میں پھنکوا دیا اور دور ہی سے کچھ پتھر وغیرہ اس پر ڈال دیے۔

(حوالہ بالا،ص260۔261)

قارئین! پہلے تو اس سورت کا ترجمہ دیکھئے کہ کس طرح ابولہب کے ہاتھوں کو بازو بنایا گیا، پھر اس سے اعوان وانصار پیدا کر لیے اور آخر میں بیوی کو دوزخ میں ایندھن ڈھونے والی بنا دیا۔

یہ اسی 'نظمِ کلام' کے فلسفے کا شاخسانہ ہے کہ اس کے بعد ہر سورت میں آیات کا ترجمہ اور ان کی تفسیر دونوں ہی ایسے بے ڈھب پڑتے ہیں جو نہ صرف عربیت کی رو سے غلط ہوتے ہیں بلکہ تمام مفسرین اور امت مسلمہ کے اجماع کے بھی خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بجائے امت میں اتفاق واتحاد پیدا کرنے کے اس کے ذریعے امت کے اندر افتراق وانتشار پیدا ہوتا ہے۔

حالانکہ 'نظم کلام' کے اس فلسفے کا جواز یہی پیش کیا جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں قرآن مجید کی ہر آیت کا ایک ہی صحیح اور متعین مفہوم واضح ہوتا ہے اور مختلف اقوال کی بجائے ایک ہی درست تاویل ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود اس نظریے کے حاملین جب قرآنی آیات کا ترجمہ یا تفسیر کرنے لگتے ہیں تو خود ان میں کتنا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔

مولانا اصلاحی اور غامدی صاحب کے درمیان اختلافات:

اگرچہ مولانا اصلاحی اور غامدی صاحب دونوں ہی اس 'فلسفہ نظم قرآن' کے پرچارک ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے تاویل یعنی تفسیر کے تمام اختلافات دور ہو جاتے ہیں اور یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ:

القرآن لا يحتمل الا تاويلا واحدا . (قاله الفراهي)

''قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلوں کی ہرگز گنجائش نہیں ہے۔''

مگر نتیجہ پھر اسی قسم کے اختلافات کی صورت میں نکلتا ہے، جن کو دور کرنے کے لیے ان حضرات نے یہ سارا پاپڑ بیلا ہے۔

مثال کے طور پر یہ دونوں حضرات جب اپنے 'فلسفہ نظم کلام' کا اطلاق قرآنی آیات پر کرتے ہیں تو امت مسلمہ سے اختلاف تو ایک طرف رہا خود آپس میں اختلاف کرنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے سے مختلف نتائج نکالتے ہیں۔ گویا نظم کے نام پر بدنظمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی چند مثالیں ذیل میں دی جارہی ہیں:

(1)۔ وارثوں کے حق میں وصیت اور عدم وصیت:

مولانا اصلاحی کے نزدیک مورث صرف غیر وارث کے حق میں وصیت کر سکتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''مورثوں کو وصیت کی جو اجازت دی گئی ہے اس کا تعلق وارثوں سے نہیں ہے، جن کے باب میں خود خدا کی وصیت موجود ہے، بلکہ یہ غیر وارثوں کے لیے خاص ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ لا وصیت لوارث (وارث کے حق میں وصیت نہیں ہے)۔'' (تدبر قرآن، ج2، ص261، طبع 1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب وارثوں کے حق میں بھی وصیت کو جائز سمجھتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> اللہ کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا...... تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا ان میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو اس صورت میں بھی ان کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی...... مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ کے جو الفاظ ان آیتوں میں بار بار آئیں گے، ان سے مراد بھی ایسی ہی کوئی وصیت ہے جو وارثوں کے سوا کسی دوسرے کے حق میں ہو یا وارثوں کی کسی ضرورت کے لیے یا ان کی کسی خدمت کے صلے میں خود ان کے حق میں کی جائے۔

(میزان، ص525، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(2)۔ زکوۃ ایک مصرف 'اَلْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' (التوبہ:60) کے مفہوم میں اختلاف:

مولانا اصلاحی صاحب زکوۃ کے ایک مصرف 'اَلْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' کے بارے میں

اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقات کی وصولی اور ان کے حساب کتاب پر حکومت کی طرف سے مامور ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور ان کے دفاتر کے مصارف بھی اسی مد سے ادا ہوں گے۔" (تدبر قرآن، ج3، ص591 طبع 1983ء لاہور)

مگر دیکھئے غامدی صاحب اس سے کیا مراد لیتے ہیں؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"'العاملین علیھا' یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔" (میزان، ص351، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(3)۔ بیوہ کے لیے ایک سال تک کے لیے نان ونفقہ ہے یا نہیں:

مولانا اصلاحی کے نزدیک سورۃ البقرہ آیت 240 کا وہ حکم عارضی تھا جو بعد میں منسوخ ہوگیا اور جس میں بیوہ کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ کی ذمہ داری اس کے شوہر پر ڈالی گئی تھی۔

چنانچہ وہ اس بارے میں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے دیا گیا تھا، جب تک سورۃ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور سکونت کی وصیت کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہوگیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہوگیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہوگئی، بیوگان کے لیے بھی یہ منسوخ ہوگئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔" (تدبر قرآن ج1، ص555۔556 طبع مئی 1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب اس حکم کو غیر منسوخ مانتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"شوہروں کے لیے اللہ کا حکم کہ وہ اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی وصیت کر جائیں، اِلاّ یہ کہ وہ خود اپنی مرضی

سے شوہر کا گھر چھوڑ دیں یا اس نوعیت کا کوئی دوسرا قدم اٹھالیں۔''

(میزان،ص462،طبع سوم مئی2008ء لاہور)

(4)۔کیا شریعت میں کھانے پینے کی صرف چار چیزیں حرام ہیں یا زیادہ:

مولانا اصلاحی کے نزدیک شریعت میں کھانے کی صرف چار چیزیں ہی حرام نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی چیزیں حرام ہیں، چنانچہ وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بعض لوگ زیر بحث آیت (البقرہ: 173) کو اس کے موقع و محل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ان کے علاوہ کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے، اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لیے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں 'میۃ' کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت 3 میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر مزید بعض چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔'' (تدبر قرآن، ج1،ص414،طبع مئی1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ شریعت میں کھانے کی صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں۔اور وہ یہ ہیں:

''مردار، خون، سُور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔''

چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں کہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے (انسان کو) بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس معاملے میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔قرآن نے اسی بنا پر بعض جگہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ،اور بعض جگہ اِنَّمَا کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی

ہیں۔“ (میزان، ص632۔633، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(5)۔عورت کے لیے شرعی پردہ ہے یا نہیں؟

مولانا اصلاحی عورت کے لیے پردے کو ایک مستقل شرعی حکم مانتے ہیں مگر غامدی صاحب اسے شریعت کا حکم نہیں مانتے بلکہ اسے کبھی عہد رسالت کی ایک احتیاطی وقتی تدبیر کہتے ہیں اور کبھی اسے رسم ورواج اور تہذیبی روایت قرار دیتے ہیں۔

مولانا اصلاحی کا اس بارے میں موقف یہ ہے:

”قرآن نے اس 'جلباب' سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انہیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی 'جلباب' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقعہ کو اس زمانے کے دلدادگانِ تہذیب اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں لیکن قرآن مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے، جس کا انکار صرف برخود غلط لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ.... اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اول تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں، دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا کیا کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات کل کی نسبت ہزار درجہ زیادہ خراب ہیں، البتہ حیا اور عفت کے وہ

تصورات معدوم ہو گئے جن کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔"

(تدبر قرآن، ج6، ص269، 270، طبع 1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے، دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔"

(ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی 2002ء ص47، لاہور)

وہ مزید فرماتے ہیں:

"ان آیتوں میں 'اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ' کے الفاظ اور ان کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا، بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی جو اوباشوں اور تہمت تراشنے والوں کے شر سے مسلمان عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی۔"

(میزان، ص470، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(6)۔ ذمیوں سے جزیہ لینا جائز اور ناجائز:

مولانا اصلاحی ذمیوں سے جزیہ لینے کو جائز قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں 'جزیہ' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"ذمیوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جائے گا جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔"

(اسلامی ریاست، ص204، طبع 2006ء لاہور)

مگر غامدی صاحب نہ تو جہاد و قتال کے حکم کو مانتے ہیں، نہ غیر مسلموں کو ذمی بنانے اور ان سے جزیہ لینے کے حکم کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین

پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکم اور زبردست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔'' (میزان، ص601، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

(7)۔ تکفیر جائز یا ناجائز؟

مولانا اصلاحی تکفیر کو جائز قرار دیتے ہیں اور غامدی صاحب اسے ناجائز سمجھتے ہیں۔

چنانچہ مولانا اصلاحی قادیانیوں کے کفر کے بارے میں اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''بعض گمراہ فرقوں نے نبوت کے حرم میں نقب لگانے کے لیے اپنے جی سے نبوت کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جس نبوت کے ختم ہونے کا ذکر ہے وہ الگ چیز ہے اور جس نبوت کے مدعی وہ ہیں وہ دوسری چیز ہے۔ نبوت کی یہ تقسیم ان کی طبع زاد ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کا کوئی ذکر تو درکنار اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس تقسیم سے انہوں نے بظاہر اپنے کفر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ درحقیقت 'زیادۃ فی الکفر' ہے یعنی اپنے کفر کو انہوں نے اور زیادہ غلیظ بنا دیا ہے۔''

(تدبر قرآن، ج6 ص246، طبع 1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب کسی غیر نبی کو یہ حق نہیں دینا چاہتے کہ وہ کسی شخص یا گروہ کو کافر قرار دے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے...... یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں۔''

(ماہنامہ اشراق، دسمبر 2000ء ص54۔55، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ 'اہل نظم' اٹھے تو تھے اس دعوے اور نعرے کے ساتھ کہ امت مسلمہ کے تفسیری اختلافات مٹا کر ان کو ایک ہی تاویل پر مجتمع اور متحد کریں گے، مگر نتیجہ یہ نکلا

کہ آپس میں ہی اختلاف کرنے لگے اور امت مسلمہ کے اختلافات میں ایک اور نیا اختلاف پیدا کرنے کا موجب بن گئے۔ گویا یہ نظم بھی بدنظمی ہے۔

(8)۔ صفا اور مروہ کی سعی کے بارے میں اختلاف:

مولانا اصلاحی حج اور عمرے میں صفا اور مروہ کی سعی کو ایک واجب حکم کے طور پر مانتے ہیں، مگر غامدی صاحب اسے 'تطوع' یعنی نفل قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ مولانا اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن میں 'سعی' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "ہمارا خیال یہی ہے کہ یہاں سعی کا حکم ہے اور یہ حکم وجوب کے درجہ میں ہے۔" (تدبر قرآن، ج1، ص387، طبع 1983ء لاہور)

مگر غامدی صاحب اسے 'تطوع' قرار دے کر ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصّہ نہیں ہے، عمرہ اس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔"
>
> (میزان، ص388، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

ان حضرات کے اختلافات کی یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ ان کی ہی اصل تعداد بہت زیادہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ 'نظم کلام' کے نظریے کے تحت قرآن کی ایک ہی متفقہ تفسیر کرنے کا دعویٰ کرنے والوں نے امت کو سوائے ذہنی خلفشار کے کچھ نہیں دیا۔

11۔ 'سبع مثانی' اور 'نظم قرآن':

غامدی صاحب کے اکثر نظریات مسروقہ ہوتے ہیں جو انہوں نے دوسروں سے چرائے ہوتے ہیں مگر جن کو وہ اپنے 'دریافت کردہ' نظریات کے طور پر پیش کرنے کے عادی ہیں۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ ان کا کوئی نظریہ اور نام نہاد تفرد ایسا نہیں جو انہوں نے دوسروں سے چرایا نہ ہو۔

سبع مثانی اور نظم قرآن کے بارے میں بھی ان کا نظریہ دوسروں کی نقالی اور جگالی کے سوا کچھ نہیں ہے، کیونکہ یہی نظریہ اس سے پہلے مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں پیش کر چکے ہیں اور ان سے پہلے ان کے استاد مولانا حمید الدین فراہی اسی نظریئے کو اپنی نامکمل عربی تفسیر 'نظام القرآن' میں بیان کر چکے ہیں۔

چنانچہ سبع مثانی اور نظم قرآن کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''قرآن کی تمام سورتیں آپس میں توام بنا کر اور سات ابواب کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔ یعنی ہر سورۂ مضمون کے لحاظ سے اپنا ایک جوڑا اور مثنیٰ رکھتی ہے اور دونوں میں اسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت زوجین میں ہوتی ہے۔ اس سے مستثنیٰ چند سورتیں ہیں جن میں سے فاتحہ پورے قرآن کے لیے بمنزلہ دیباچہ اور باقی تتمہ وتکملہ یا خاتمہ باب کے طور پر آئی ہیں۔ پھر سات مجموعوں کی صورت میں، جنھیں ہم نے ابواب سے تعبیر کیا ہے، یہ سورتیں قرآن میں مرتب کر دی گئی ہیں۔ قرآن سے متعلق یہ حقیقت سورۂ حجر میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ﴾ (15۔87)

''اور ہم نے (اے پیغمبر)، تم کو سات مثانی دیے ہیں، یعنی یہ قرآن عظیم عطا فرمایا ہے۔''

(مثانی، مثنیٰ کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں: وہ چیز جو دو دو کر کے ہو) قرآن کے ان ساتوں ابواب میں سے ہر باب ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہو جاتا ہے۔''

پھر ان ابواب کی تفصیل یوں بتاتے ہیں کہ:

''پہلا باب فاتحہ سے شروع ہوتا اور مائدہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں فاتحہ مکی اور باقی چار مدنی ہیں۔

دوسرا باب انعام اور اعراف، دو مکی سورتوں سے شروع ہوتا ہے اور دو مدنی سورتوں، انفال اور توبہ پر ختم ہوتا ہے۔

تیسرے باب میں یونس سے مومنون تک پہلے چودہ سورتیں مکی ہیں اور آخر میں ایک سورۂ نور ہے جو مدنی ہے۔

چوتھا باب فرقان سے شروع ہوتا ہے، احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے آٹھ سورتیں مکی اور آخر میں ایک یعنی احزاب مدنی ہے۔ پانچواں باب سبا سے شروع ہوتا ہے، حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں تیرہ سورتیں مکی اور آخر میں تین مدنی ہیں۔

چھٹا باب ق سے شروع ہو کر تحریم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں سات مکی اور اس کے بعد دس مدنی ہیں۔

ساتواں، باب ملک سے شروع ہو کر ناس پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں آخری دو، یعنی معوذتین مدنی اور باقی سب مکی ہیں۔

اس کے بعد وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

> ''یہ قرآن کی ترتیب ہے۔ اسے اگر تدبر کی نگاہ سے دیکھئے تو سورتوں کے پس منظر اور زمانۂ نزول کو سمجھنے اور قرآن کے مخاطبین، بلکہ بحیثیت مجموعی سورتوں کے موضوع اور مدعا کی تعیین میں بھی جو رہنمائی اس سے قرآن کے طالب علم کو حاصل ہوتی ہے، وہ قرآن سے باہر کسی دوسرے ذریعے سے ہرگز حاصل نہیں ہوسکتی۔'' (میزان، ص 53، 54، 55 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ سورۂ الحجر کی جس آیت 87 سے یہ پورا نظریہ برآمد کیا گیا ہے اس کا اصل مطلب ہی وہ نہیں جو ان لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔

آیت مذکورہ میں مثانی، کا لفظ بھی آیا ہے جو دوسرے مقام پر قرآن کی ایک صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ.....﴾ (الزمر: 23)

''اللہ نے یہ بہترین کلام نازل کیا ہے جو ایسی کتاب ہے جس کے مضامین ملتے جلتے اور بار بار دہرائے گئے ہیں۔''

لفظ 'مثانی' کے لغوی معنی

غامدی صاحب اور ان کے شیوخ لفظ 'مثانی' کو مثنی کی جمع قرار دیتے اور اس سے یہ معنی نکالتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جو دو دو کر کے ہو۔ اور قرآن کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں۔

مگر عربی لغت میں 'مثانی' مثناۃ یا مثنیۃ کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں: دہرائی جانے والی چیز۔ چونکہ قرآن مجید میں مضامین کو بار بار دہرایا گیا ہے اس لیے اسے 'مثانی' کہا گیا ہے۔ چنانچہ مشہور امام لغت اپنی تفسیر الکشاف میں سورۃ الحجر کی آیت 87 کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

سبعًا: سبع اٰیات وهی الفاتحة......

المثانی: من التثنية وهی التكرير، لأن الفاتحة مما تكرر قراء تها فی الصلاة وغيرها...... الواحد مثناة او مثنية))

(الکشاف، تفسیر سورۃ الحجر آیت 87)

سَبْعًا: اس سے مراد سات آیتیں یعنی سورۃ الفاتحہ ہے۔

اَلْمَثَانِیْ: یہ تثنیہ سے بنا ہے جس کے معنی دہرانے کے ہیں کیونکہ سورۃ فاتحہ نماز وغیرہ میں دہرائی جاتی ہے...... اس کا واحد مثناۃ یا مثنیۃ ہے۔''

اسی طرح عربی زبان کے معتبر اور مستند لغت 'لسان العرب' میں ایک ماہر لغت فراء کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ 'مثانی' سے مراد دہرائے جانے والے مضامین کا مجموعہ یعنی قرآن ہے۔

"مثاني: اى مكررا اى كرر فيه الثواب والعقاب.

'مثانی' یعنی بار بار دہرایا ہوا کہ اس میں ثواب وعذاب کو بار بار دہرایا گیا ہے۔"

گویا پورا قرآن 'مثانی' ہے اس لیے کہ اس کے مضامین بار بار دہرائے گئے ہیں۔ لہٰذا سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ، سے قرآن کی سات آیتیں مراد ہیں اور پھر چونکہ امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۃ الفاتحہ سات آیتوں پر مشتمل ہے اس لیے قرآن کی ان سات آیتوں سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے اور جیسا کہ قرآن مجید کا حصہ بھی قرآن ہی کہلاتا ہے جیسا کہ سورۃ یوسف کو درج ذیل آیت میں 'قرآن' کہا گیا ہے:

﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ﴾ (یوسف: 3)

"(اے نبی!) ہم اس قرآن کی بدولت جو آپ کو وحی کیا ہے، آپ کو بہترین قصہ سناتے ہیں۔"

اس لیے سورۃ الفاتحہ قرآن عظیم بھی ہے اور سبع مثانی بھی۔

چنانچہ صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُعَلّٰى قَالَ: كُنْتُ اُصَلِّيْ فِي الْمَسْجِدِ فَدَعَانِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَلَمْ اُجِبْهُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اِنِّيْ كُنْتُ اُصَلِّيْ فَقَالَ: اَلَمْ يَقُلِ اللّٰهُ: "اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ" (الانفال: 24)؟ ثُمَّ قَالَ لِيْ: لَاُ عَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ اَعْظَمُ السُّوَرِ فِي الْقُرْاٰنِ قَبْلَ اَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ، ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِيْ فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ يَخْرُجَ قُلْتُ لَهٗ: اَلَمْ تَقُلْ: لَاُ عَلِّمَنَّكَ سُوْرَةً هِيَ اَعْظَمُ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ؟ قَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، هِيَ السَّبْعُ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنُ الْعَظِيْمُ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهٗ))

(صحیح بخاری، رقم 4474)

''حضرت ابو سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے آواز دے کر بلایا لیکن میں نے جواب نہ دیا (کیونکہ میں نماز پڑھ رہا تھا)۔ پھر نماز ختم کر کے میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! میں نماز پڑھ رہا تھا (اس لیے جلد حاضر نہیں ہو سکا) آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اللہ نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں بلائیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمہیں بتاؤں کہ قرآن مجید کی سب سے بڑی سورت کون سی ہے، اس سے پہلے کہ ہم مسجد سے نکلیں؟ پھر آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آپ مجھے قرآن کی سب سے بڑی سورت کے متعلق بتائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، یعنی سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔''

یہی مضمون ترمذی، رقم 2875 میں بھی ہے اور یہی مضمون نسائی، رقم: 914 میں بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ مؤطا اور مسند احمد میں بھی اسی مضمون کی احادیث موجود ہیں۔ اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ الفاتحہ ہی کو ''سبع مثانی اور قرآن عظیم'' قرار دیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح احادیث کی نص سے ثابت ہے کہ 'سبع مثانی' سے مراد سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہی بات حافظ ابن کثیر نے اپنی مشہور تفسیر میں سورۃ الحجر کی آیت 87 کی تشریح میں صحیح احادیث کا حوالہ دینے کے بعد لکھی ہے کہ:

((فھذا نص فی ان الفاتحۃ السبع المثانی والقرآن العظیم))

''یہ (احادیث) اس بارے میں نص ہیں کہ سورۃ فاتحہ ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔'' (تفسیر ابن کثیر، تحت تفسیر سورۃ الحجر آیت 87)

بالکل جیسے قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں صحیح حدیث صحیح بخاری، رقم 3360 کی نص سے ثابت ہے کہ اس میں لفظ 'ظلم' سے مراد 'شرک' ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ (الانعام: 82)

''جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم یعنی شرک سے آلودہ نہیں کیا صرف انہی کے لیے امن وسلامتی ہے اور وہی ہدایت پر ہیں۔''

یا جیسے قرآن مجید کی سورۃ الاحزاب کی آیت 40 میں 'خاتم النبیین' کے بارے میں صحیح حدیث (صحیح مسلم، رقم 5961) کی نص سے ثابت ہے کہ اس سے مراد ''آخری نبی'' ہیں:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب: 40)

''(اے لوگو!) محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور آخری نبی ہیں۔''

بلکہ خود مولانا حمید الدین فراہیؒ تسلیم کرتے ہیں کہ علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ 'سبع مثانی' سے مراد سورۃ فاتحہ ہے:

''اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ پر اپنا احسان عظیم جتاتے ہوئے فرمایا ہے:

((وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ))

''ہم نے تم کو سات دہرائی ہوئی اور قرآن عظیم دیا۔''

سلف سے لے کر خلف تک علماء کا اتفاق ہے کہ ''سبع مثانی'' سے مراد یہی سورۃ فاتحہ ہے۔'' (''مجموعہ تفاسیر فراہی'' ترجمہ از مولانا امین احسن اصلاحی، ص 79 مطبوعہ 1973ء لاہور)

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج تک کسی مفسر یا ماہر لغت نے 'مثانی' کا ترجمہ جوڑے جوڑے نہیں کیا بلکہ سب اس سے ''دہرائی جانے والی چیزیں'' مراد لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کے تمام اردو تراجم میں بھی اس کے یہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں

کہ 'مثانی' کے معنی 'جوڑے جوڑے' کرنا اور اس سے قرآن مجید کی سورتوں کے جوڑے بنانا عربیت اور لغت دونوں کے خلاف ہے۔ اسی طرح 'سبعا من المثانی' سے سورۃ الفاتحہ مراد لینے کی بجائے اس سے قرآن مجید کے 'سات ابواب' کا نظریہ برآمد کرنا محض ظن وتخمین اور قیاس آرائی پر مبنی ہے جو ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے مذموم کے ذیل میں آتا ہے۔

نظم قرآن کے نظریے کی حقیقت:

اب جب کہ یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ گیا کہ سورۃ الحجر آیت 87 کے الفاظ 'سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ' سے بالاتفاق سات آیات پر مشتمل سورۃ فاتحہ مراد ہے تو پھر ان الفاظ کی بنیاد پر قرآن مجید کی سورتوں کو توام اور جوڑا جوڑا کہنا اور پورے قرآن کے سات ابواب (گروپ یا زمرے) بنانا ایک من گھڑت نظریے اور من مانے فلسفے کے سوا اور کیا ہے؟

'اہل نظم' کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بھی ایک ایسی کتاب فرض کرلیا ہے جیسی کتابیں ہم خود مرتب کرتے ہیں۔ پھر جب وہ ہمارے اس خودساختہ انسانی تصنیفی معیار پر پوری نہیں اترتی تو قرآنی آیات وسُور کی تاویلیں اور معنوی تحریفیں کر کے بات بنانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر صورت حال یہ سامنے آتی ہے کہ ؏

کیا بنے بات جب بات بنائے نہ بنے

اصل میں ان لوگوں کے اندر کا چور ان کی مغرب سے مرعوبیت ہے اور مستشرقین (Orientalists) کے اس فضول اور لایعنی اعتراض کا جواب دینے کی بے کار کوشش ہے کہ قرآن مجید ایک بے ربط اور غیر مرتب کتاب ہے اور اس کے مضامین بھی منتشر اور بے ترتیب ہیں لہٰذا یہ اللہ کا کلام نہیں ہوسکتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی کتاب ہمارے وضعی اور بناوٹی طریقوں اور معیارات کی پابند نہیں ہے۔

اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کا جو حشر کیا، ان کی جو مرمت کی اور جس طرح ان کو مرتب اور مربوط بنایا، اہل نظم چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی قرآن مجید کے ساتھ ویسا ہی سلوک کریں۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے بس کی بات نہیں کہ وہ ایسا کرسکیں کیونکہ قرآن

کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ البتہ قرآن کی معنوی تحریف ہو سکتی ہے اور یہ نامبارک کام مسلمانوں کے گمراہ لوگ ہر زمانے میں کرتے رہے ہیں۔

غور کیجئے یہ 'اہل نظم' پہلے سے یہ تصور کر لیتے ہیں کہ لفظ 'مثانی' کے معنی 'جوڑے جوڑے' کے ہیں اور یہ کہ قرآن کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں مگر جب وہ اپنے اس خود ساختہ اصول کا اطلاق کرنے بیٹھتے ہیں تو قرآن کی پہلی سورت الفاتحہ ہی ان کے اصول کی فاتحہ پڑھنے لگتی ہے اور باقی سورتوں کا عدد 113 طاق ہے جس کے جوڑے نہیں بنتے۔ مگر یہ لوگ جھٹ سے پینترا بدل کر کہہ دیتے ہیں کہ سورۃ الفاتحہ 'جوڑا جوڑا' ہونے کے اصول سے مستثنیٰ ہے کیونکہ قرآن کا دیباچہ ہے جب کہ دیباچہ، باب، فصل وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا تعلق انسانوں کی ترتیب دی ہوئی کتابوں کے طریق تصنیف سے ہے اور اللہ تعالیٰ انسانوں کے وضعی طریق تصنیف کا نہ محتاج ہے اور نہ پابند۔ انسان جب کوئی کتاب لکھتا ہے تو مختلف مضامین ومقدمات کو ایک منطقی ترتیب دے کر ان پر الگ الگ بحث کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص فقہ کی کتاب لکھے گا تو پہلے طہارت کے مسائل یکجا لکھے گا، پھر عبادات سے متعلق امور کو ایک ہی مقام پر جمع کر کے لکھے گا اور پھر معاملات کو الگ کر کے تحریر کرے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی نزولی ترتیب ہو یا موجودہ تلاوت کی ترتیب، دونوں کے اندر انسانی کے وضعی طریق تصنیف کا شائبہ تک نہیں۔ آدم علیہ السلام کا قصہ ہو یا موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ، نماز کا حکم ہو یا زکوٰۃ کی تاکید، آپ کو یہ سب کہیں بھی یکجا نہیں ملیں گے اور ملنے نہیں چاہئیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، قدوری کی فقہ کی کتاب نہیں ہے۔ آپ اگر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں بھی دیباچہ، ابواب، فصول اور اختتامیہ ڈھونڈیں گے تو آپ کو یہ چیزیں وہاں نہیں ملیں گی اور اگر ان چیزوں کو آپ زبردستی اللہ کی کتاب میں ٹھونسیں گے تو یہ آپ کے اپنے ہی قیاسات ہوں گے اور اُلجھنوں کا ایک ایسا گورکھ دھندا ہوگا جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھے گا، پھر آپ کو کہیں مکی سورہ کو مدنی قرار دینا پڑے گا، کہیں الٓمٓ دو سورتوں کا نام ٹھہرے گا اور کہیں حٰمٓ کو سات سورتوں کا نام دینا پڑے گا، کہیں صحیح حدیث اور سنت کی

مخالفت کرنی پڑے گی، کہیں اقوال صحابہ وتابعین سے انحراف کرنا پڑے گا اور کہیں اجماعِ امت کی خلاف ورزی کرنی ہوگی۔ یوں آپ تفسیر بالرائے مذموم کا ایسا شاہکار تیار کر لیں گے جس کی حیثیت قیاسات اور وہم وگمان سے زیادہ نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ وہم وگمان کا حقیقت کے سامنے کوئی مقام نہیں۔

﴿إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ (یونس : 36)

''بے شک گمان حق ویقین کا بدل نہیں ہوسکتا۔''

'اہل نظم' کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید کے سات ابواب ہیں جن میں سے ہر باب ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہو کر ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔

حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو یہ اصول کی بات ہی نہیں بلکہ نری دھونس، من مانی، قیاس آرائی اور ایک طرح کی باطنیت ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے سات ابواب کو ثابت کرنے کے لیے جس سورت کو چاہتے ہیں مکی مان لیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں مدنی قرار دے لیتے ہیں۔ پھر جتنی تعداد میں چاہتے ہیں ہر باب کے شروع میں یا آخر میں مکی اور مدنی سورتوں کی کم و بیش تعداد فرض کر لیتے ہیں۔ اور اس سے ایک باب یا گروپ تشکیل دے لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورۂ النصر جو کہ بالاتفاق ایک مدنی سورہ ہے۔ مگر غامدی صاحب اسے مکی قرار دیتے ہیں تاکہ اپنے اصول موضوعہ کو سچا ثابت کر سکیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں اور کمال ہیرا پھیری کے انداز میں لکھتے ہیں کہ:

''سورۂ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے یہاں اس سورۂ کے مقام سے واضح ہے کہ سورۂ کوثر کی طرح یہ بھی، ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلہ ہجرت وبرأت میں آپ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔'' (البیان، ص252 طبع جنوری 2000ء لاہور)

قرآن فہمی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہلے سے قائم افکار ونظریات سے خالی

الذہن ہو کر قرآن کا مطالعہ کریں۔ مگر یہ طریقہ کہ آپ پہلے اپنے کچھ اصول بنالیں اور کچھ نظریات فرض کرلیں اور پھر ان کے مطابق قرآن کو ڈھالنے کی کوشش کریں تو معاف کیجئے اس طریقے سے آپ قرآن کو اپنے خیالات سمجھانے جارہے ہیں قران سے کچھ سیکھنے نہیں جا رہے۔ مگر اہل نظم یہی کچھ کرتے ہیں وہ مطالعۂ قرآن سے پہلے ہی اپنے گھڑے ہوئے سات ابواب کے مضامین اور موضوعات بھی اپنے قیاس سے متعین کر لیتے ہیں اور ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع یا عمود بھی ٹھہرا لیتے ہیں اور پھر اپنے ان تخیلات و قیاسات پر مبنی تفسیر کو قرآن مجید کے احکام ونصوص قرار دیتے ہیں اور دوسروں کو یہ حق دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ وہ ان سے اختلاف کا اظہار کرسکیں۔ چنانچہ غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''مدرسہ فراہی کے ائمہ نے اپنی تفسیروں میں اس نظم کو جس طرح مبرہن کر دیا ہے اس کے بعد اب اس کے وجود وعدم وجود پر تو کسی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہی۔'' (میزان، ص 52 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اہل نظم کا دعویٰ تو یہ تھا کہ اگر ان کے اصولِ موضوعہ کو کام میں لایا جائے تو قرآن مجید کے ہر مقام کی صرف اور صرف ایک تاویل وتفسیر ہو جاتی ہے۔ اور اس سے تفسیری اختلافات ختم ہو جاتے ہیں، مگر عملی طور پر جب ان لوگوں نے اپنے خودساختہ اصولوں کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنی چاہی تو دوسروں سے تو ان کا اختلاف ہونا ایک ناگزیر اور فطری امر تھا، خود آپس میں بھی اہل نظم نے قرآن آیات کی مختلف تاویلیں کر ڈالیں جس کے نتیجے میں نظم ملت کی بجائے انتشارِ امت پیدا ہوگیا۔ ان لوگوں کے باہمی اختلافات کی ایک جھلک اس کتاب کے اسی باب میں گزر چکی ہے۔

درحقیقت نظم قرآن کے اس نظریے کا ماخذ نہ تو قرآن مجید ہے، نہ حدیث وسنت ہے، نہ آثارِ صحابہ وتابعین ہیں اور نہ اجماعِ امت ہے۔ یہ ایک من گھڑت، غیر فطری اور خودساختہ نظریہ ہے جس سے امت مسلمہ میں افتراق وانتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہ نظم کے نام سے بدنظمی کا نظریہ ہے کیونکہ جن امور میں امت مسلمہ آج تک متفق چلی آرہی ہے ان میں بھی اس

نظریے کے پیروکار اپنی الگ راہ رکھتے ہیں۔

حاصل یہ کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ایسی کتاب ہے جو اپنی دعوت کا فطری اسلوب اور ایک خاص ترتیب رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کی مرتب کی ہوئی کتابوں کی طرح کی کوئی کتاب ہرگز نہیں ہے۔ وہ انسانی طریق ترتیب وتدوین سے بے نیاز ہے۔ اسے دیباچے، ابواب، فصول اور اختتامیے وغیرہ میں تقسیم کر کے سمجھنا اور انسانی معیار کاوش پر پرکھنا کوتاہ فہمی، گمراہی اور بدعت کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ ایک لمحے کے لیے بھی ہم ہرگز یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ قرآن کے اندر یہ ساتوں متعین ابواب اور ان کے مرکزی موضوعات اور عمودوں کی تعیین پر مبنی نظم قرآن کا کوئی ایسا پوشیدہ اور باطنی علم ہے جو نہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے جان سکے، نہ تابعین وتبع تابعین اس سے آگاہ ہوئے ہوں اور نہ تیرہ صدیوں تک کسی مفسر کو اس کی کانوں کان خبر ہوئی۔ پھر چودھویں صدی میں کوئی شخص ہندوستان میں پیدا ہو کر اچانک اس سربستہ راز کو کھولے اور انکشافات کرے۔

12۔ قرآن فہمی کی نادر مثالیں:

غامدی صاحب کی قرآن فہمی کا حال یہ ہے کہ وہ عربیت کے خلاف من مانی تفسیر بالرائے مذموم کا ارتکاب کرتے اور امت مسلمہ کے جلیل القدر مفسرین اور فقہا کے خلاف قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں۔

ذیل میں اس حوالے سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

1۔ ابولہب کے ہاتھ نہیں ٹوٹے تھے، غامدی تفسیر کے مطابق اس کے بازو ٹوٹ گئے تھے۔

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ﴾ (اللھب : 1)

''ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے۔'' (البیان ص260، ستمبر 1998ء)

2۔ سورہ آل عمران کی ایک آیت کا ترجمہ:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾

(آل عمران : 97)

''اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، ان پر اللہ کے لیے اس گھر کا حج ہمیشہ فرض رہا ہے۔'' (حوالہ بالا، ص375)

مذکورہ آیت کے ترجمے میں بغیر بریکٹ کے 'ہمیشہ' کا لفظ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

3۔ سورۃ البروج۔

سورۃ البروج میں ﴿قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِo النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِo﴾ کا یہ ترجمہ کیا ہے کہ:

''مارے گئے ایندھن بھری آگ کی گھاٹی والے۔'' (البیان ص157)

اور پھر اس کی تفسیر یوں فرمائی ہے کہ:

''یہ قریش کے ان فراعنہ کو جہنم کی وعید ہے جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے ظلم وستم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو دوزخ کی اس گھاٹی میں پھینک دیے جائیں گے جو ایندھن سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی آگ نہ کبھی دھیمی ہوگی اور نہ بجھے گی۔'' (البیان، ص157)

4۔ عاملین زکوٰۃ کون ہیں؟

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا، (التوبہ: 60) سے غامدی صاحب تمام سرکاری ملازمین مراد لیتے ہیں اور ان کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: نئی سطر العاملین علیھا یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔'' (میزان، ص351، طبع سوم مئی 2008ء)

حالانکہ تمام مفسرین اور فقہا اس سے وہ لوگ مراد لیتے ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم پر مقرر ہوں۔

5۔ آیت الکرسی کا اُلٹ ترجمہ۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ﴾ (البقرۃ: 255)

''نہ اس کو نیند آتی ہے نہ اونگھ لاحق ہوتی ہے۔'' (میزان، ص97، طبع سوم مئی 2008ء)

6۔ ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾ (حم السجدہ: 41)

''اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک بلند پایہ کتاب ہے۔''

(میزان، ص 154، طبع سوم، مئی 2008)

حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ ہے:

''اور بے شک یہ ایک زبردست کتاب ہے۔''

7۔ سورۃ الجمعہ کی ایک آیت کا ترجمہ۔

﴿...وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة: 2)

''اور انہیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' (میزان، ص 78، طبع سوم مئی 2008ء)

8۔ حج اور عمرے کی سعی تطوع ہے۔

سورۃ البقرہ آیت 158 کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔''

(میزان، ص 388، طبع سوم مئی 2008ء)

حالانکہ سعی واجب (یا فرض) ہے اور اس کے بغیر عمرہ نہیں ہوتا۔

9۔ کیا قرآن میزان ہے؟

غامدی صاحب نے سورۃ الشوریٰ کی ایک آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ﴾ (الشورىٰ: 17)

''اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری یعنی میزان نازل کی ہے۔''

اس طرح غامدی صاحب قرآن مجید کی ایک صفت میزان قرار دیتے ہیں اور یہ بات تمام مفسرین کے اتفاق کے خلاف ہے۔ کیونکہ کسی مفسر نے میزان کو قرآن کی صفت قرار نہیں دیا۔

10۔ اُمَّةً وَّسَطًا سے کیا مراد ہے؟

سورۃ البقرہ کی آیت 143 کے الفاظ اُمَّةً وَّسَطًا کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''ایک درمیان کی جماعت۔'' (میزان، ص550، طبع سوم مئی 2008ء)

اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس سے یہ مراد لی ہے کہ:

''سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو اسی بنا پر درمیان کی جماعت 'امۃ وسطا' قرار دیا ہے جس کے ایک طرف خدا اور اس کا رسول اور دوسری طرف 'الناس' یعنی دنیا کی سب اقوام ہیں۔'' (حوالہ بالا)

11۔ کیا سورۂ النصر مکی ہے؟

غامدی صاحب سورۂ النصر کو جو بالاتفاق مدنی ہے مکی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سورۂ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے یہاں اس سورۂ (النصر) کے مقام سے واضح ہے کہ سورۂ کوثر کی طرح یہ بھی، ام القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلہ ہجرت و براءت میں آپ ﷺ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔'' (البیان، ص252، مطبوعہ 2000ء)

12۔ غُثَآءً اَحْوٰی، کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟

غامدی صاحب نے سورۂ الاعلیٰ کی دو آیتوں کا یہ ترجمہ کیا ہے جو کہ اجماع مفسرین کے خلاف ہے:

﴿وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰیo فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰیo﴾ (الاعلیٰ: 5۔6)

''اور جس نے سبزہ نکالا، پھر اسے گھنا سرسبز و شاداب کر دیا۔'' (البیان، ص165)

حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے:

''اور جس نے سبز چارہ نکالا اور پھر اسے سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا۔''

13۔ 'جمال و کمال' کا کیسا دعویٰ؟

غامدی صاحب نے یہ دعویٰ بھی فرمایا ہے کہ قرآن مجید کی سورۂ الاحزاب کی آیت 35 میں جو دس (10) مومنانہ اخلاقی اوصاف بیان ہوئے ہیں پورے قرآن میں کہیں ان پر کوئی

اضافہ نہیں کیا گیا۔ صرف یہی اعلیٰ اخلاقیات ہیں اور دین کا سارا جمال و کمال بس یہی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دوسرے دعاوی کی طرح غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بے اصل اور غلط ہے کیونکہ قرآن مجید میں بہت سے دوسرے اعلیٰ اخلاقی اوصاف بھی مذکور ہیں جو کہ ہر انسان میں قرآن کو مطلوب ہیں۔ چنانچہ غامدی صاحب سورۃ الاحزاب کی آیت 35 لکھ کر اس کا یہ نامناسب سا ترجمہ تحریر کرتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (الاحزاب 33: 35)

''وہ مرد اور وہ عورتیں جو مسلمان ہیں، مومن ہیں، بندگی کرنے والے ہیں، سچے ہیں، صبر کرنے والے ہیں، اللہ کے آگے جھک کر رہنے والے ہیں، خیرات کرنے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے ہیں، ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔'' (میزان، ص 240، طبع سوم، مئی 2008ء)

اول تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب نے مذکورہ آیت کا درست ترجمہ نہیں کیا اس لیے ذیل میں ہم اسی آیت کا ترجمہ 'تدبر قرآن' سے پیش کرتے ہیں جو ان کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی کا ترجمہ ہے اور جو اس آیت کا صحیح ترجمہ ہے:

''اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبرداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی

اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں۔ ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔''

(تدبر قرآن، ج6 ص215 طبع 1983ء)

مذکورہ آیت کے حوالے سے غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی فرماتے ہیں کہ:

''انسان کے اخلاقی وجود کا حسن جب خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو اس سے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں یا قرآن کی رو سے ہونے چاہئیں، وہ یہی ہیں...... یہ دس چیزیں ہیں اور پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ دین کا جمال وکمال قرآن کے نزدیک یہی ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں کو اسی تک پہنچنے اور اسی کو پانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے آگے اگر کوئی درجہ ہے تو وہ نبوت کا درجہ ہے اور اس کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اخذ واکتساب کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ اللہ ہی نے جس کو چاہا ہے، یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے۔'' (میزان، ص240، 241 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب یہ دعویٰ فرما رہے ہیں کہ قرآن مجید میں صرف یہی دس اوصاف (اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، روزہ، حفظ فروج اور ذکر کثیر) بیان ہوئے ہیں جن سے انسانی اخلاق درجہ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی دین کا جمال وکمال بھی ہے اور قرآن نے ان دس اوصاف پر کسی اور ایسے اخلاقی وصف کا اضافہ نہیں کیا جس سے انسانی اخلاق کی تکمیل ہوتی ہو۔

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا یہ ادعا سراسر قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اور یہ ایک دعویٰ ہی ان کی قرآن فہمی کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں

ان دس اخلاقی اوصاف کے علاوہ بہت سے دوسرے اعلیٰ اخلاقی اوصاف بھی بیان ہوئے ہیں جن سے غامدی صاحب بے خبر ہیں۔ مثال کے طور پر چند مزید اخلاقی اوصاف دیکھیے جو قرآن مجید اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے:

1۔ تقویٰ:

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ (آل عمران : 102)

''اے ایمان والو! اللہ سے ایسے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک اسی کی فرمانبرداری کرو۔''

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (التوبة : 7)

''بے شک اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

2۔ شکر:

﴿وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ (البقرة : 152)

''اور میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔''

﴿وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (آل عمران : 144)

''اور اللہ شکر گزاروں کو اجر دے گا۔''

3۔ احسان:

﴿وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ (البقرة : 195)

''ہر حال میں احسان (بھلائی) کرو۔ بے شک اللہ احسان (بھلائی) کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

4۔ امانت داری:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ﴾ (المومنون : 8)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا خیال رکھنے والے ہیں۔''

5۔ایفائے عہد:

﴿وَ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل: 34)

''اور عہد کو پورا کرو۔ بے شک وعدے کی پوچھ ہوگی۔''

6۔توبہ:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ ....﴾ (التوبة: 112)

''توبہ کرنے والے......''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ....﴾ (البقرة: 222)

''بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

7۔عدل وانصاف:

﴿اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (المائدة: 8)

''ہر حال میں انصاف کرو یہی تقوے سے زیادہ قریب ہے۔''

﴿وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (الحجرات: 9)

''اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

8۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: 110)

''تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا۔تم نیکی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (التوبة: 112)

''نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے۔''

مذکورہ صفات عشرہ اور درجۂ نبوت:

رہا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ سورۂ الاحزاب کی آیت 35 میں مذکورہ صفات پا لینے

سے انسان کو وہ درجہ حاصل ہو سکتا ہے کہ جس کے بعد صرف نبوت کا ایک درجہ باقی رہ جاتا ہے تو یہ دعویٰ سراسر باطل اور بے بنیاد ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ سورۂ الاحزاب کی مذکورہ آیت میں تو تقویٰ، شکر، احسان، امانت داری، ایفائے عہد، توبہ واستغفار، عدل وانصاف اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا ذکر ہی نہیں جن کے بغیر تو کوئی اچھا مسلمان بھی نہیں کہلا سکتا چہ جائیکہ اسے نبوت سے قریب درجہ حاصل ہو جائے جو صرف صدیقین اور صحابہ کرام کے ساتھ خاص ہے اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کا درجہ آتا ہے۔



باب نمبر 3:

حدیث وسنت

1۔ سنت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

جس طرح منکرین حدیث معروف دینی اصطلاحات کا مفہوم بدلنے کی جسارت کرتے ہیں اسی طرح غامدی صاحب بھی یہی حربہ استعمال کر کے انکارِ حدیث کی راہ کھولتے ہیں۔ چنانچہ وہ سنت کی اصطلاح کا مفہوم بدلتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔قرآن میں اس کا حکم آپ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (النحل : 123)

''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

(میزان: ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی: ص 10، فروری 2005ء، لاہور)

اسلامی شریعت میں 'سنت' کی اصطلاح کا کیا مفہوم ہے؟ یہ اصطلاح چودہ صدیوں سے امت مسلمہ کے ہاں کن معنوں میں مستعمل ہے؟ اور غامدی صاحب اس اصطلاح سے اپنا کیا مفہوم نکال رہے ہیں اور اس بارے میں قرآنِ مجید کی جس آیت سے وہ دلیل پیش کر رہے ہیں وہ کہاں تک صحیح دلیل ہے؟ اس پر بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ سردست ہمیں ان کے اس

اندازِ بیان اور طرزِ کلام کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہے جو اُنہوں نے سنت کا مطلب بیان کرتے ہوئے اختیار فرمایا ہے کہ: ''سنت سے ہماری مراد یہ ہے......''

غامدی صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ 'سنت' ایک اسلامی شرعی اصطلاح ہے جو اپنا ایک مسلمہ اور متعین مفہوم رکھتی ہے۔ یہ دینی اصطلاح کسی کی ذاتی جاگیر نہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر اپنے جی سے جو چاہے اس سے مراد لیتا پھرے۔ معاف کیجئے، یہ اندازِ کلام اس طرح کا ہے جیسے کوئی سرپھرا شخص یوں دعویٰ کرے۔

- نماز (اقامت صلوٰۃ) سے ہماری مراد دین موسوی کی وہ روایت ہے۔
- روزے (صوم) سے ہماری مراد دین عیسوی کی وہ روایت ہے۔
- حج سے ہماری مراد دین سلیمانی کی وہ روایت ہے۔
- زکوٰۃ سے ہماری مراد دین داؤدی کی وہ روایت ہے۔
- صحیح حدیث سے ہماری مراد وہ خبر یا اطلاع ہے جو کبوتر یا ہُدہُد کے ذریعے موصول ہو۔
- مجتہد سے ہماری مراد ایسا شخص ہے جو انتہائی کوشش اور جدوجہد کے بعد ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ جائے۔
- فقہ سے ہماری مراد وہ علم ہے جو کسی شخص کو بگلے کی طرح پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر غور وفکر کرنے کے بعد حاصل ہو۔
- مفتی سے ہماری مراد وہ آدمی ہے جو سرکاری خرچ پر مفت حج کر کے آئے۔
- امیر المومنین سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ دولت مند ہو۔
- خلیفہ سے ہماری مراد لکھنؤ کا حجام ہے۔
- مسجد سے ہماری مراد قبرستان ہے۔

کیا ایسے سرپھرے شخص کے ان دعاوی کو کوئی معقول آدمی تسلیم کرسکتا ہے؟ کیا ایک مسلمان معاشرے میں اس طرح کے تلعب بالدین اور اسلامی اصطلاحات سے کھیل مذاق کی اجازت دی جاسکتی ہے؟ غامدی صاحب! ہوش کے ناخن لیں۔ آپ یہ لوگوں کو دین سمجھا

رہے ہیں یا اپنی ہوائے نفس کا اظہار فرما رہے ہیں؟ ع

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

دین کی اصطلاحات کے مسلمہ معانی و مفاہیم بدلنا ہمارے ہاں کے منکرین حدیث کی پرانی عادت ہے۔ مشہور منکر حدیث پرویز صاحب نے بھی بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اپنی تحریروں میں یہ حربہ اختیار کیا ہے۔ اُنہوں نے صلوٰۃ، زکوٰۃ، جنت، جہنم، جنات، آدم، ملائکہ، حتیٰ کہ اللہ و رسول کے مسلمہ اصطلاحی مطالب بدل ڈالے جس کے سبب متحدہ پاکستان کے ایک ہزار علمائے کرام اپنے دستخطوں کے ساتھ اُن پر کفر کا فتویٰ لگانے پر مجبور ہوئے۔

دینی اصطلاحات کے مسلمہ معنی و مفہوم کو بدل ڈالنا ایک عظیم گمراہی ہے، شرارت ہے، فتنہ ہے اور اِلحاد و زندقہ ہے۔ خود غامدی صاحب کے اُستاد اور اُستاذ الاستاذ جن کا شاگرد کہلانا وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور جن کی فکر کے وہ علمبردار بنتے ہیں، ایسی شنیع حرکت کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''اُمت کے جس تواتر نے قرآنِ کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے، اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے، دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جب سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہیں۔''

(مقدمہ تدبر قرآن: جلد اوّل، ص 29، مطبوعہ 1983ء)

پھر دینی اصطلاحات کے مطالب بدلنے کو مولانا اصلاحی منکرین حدیث کی جسارت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے، اس میں ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں،

صریحاً خود قرآنِ مجید کے انکار کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے، اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ اُن کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بھی ایک بالکل غلط چیز ہے۔" (مقدمہ تدبر قرآن، جلد اوّل، ص 29، مطبوعہ 1983ء)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک کسی دینی اصطلاح کے معنی بدلنے کا مطلب اس کا انکار ہے۔ اس بنا پر غامدی صاحب کا سنت کی اصطلاح کے معنی بدلنا سنت کا انکار ہے۔ اس لیے وہ اپنے استاد کے اُصول کے مطابق منکر حدیث وسنت قرار پاتے ہیں۔

آگے چل کر مولانا اصلاحی نے اس بارے میں اپنے اُستاد مولانا فراہی رحمہ اللہ کا یہ مسلک لکھا ہے کہ:

"ان دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ اپنے مقدمہ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور اُن سے جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں...... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام اُمت متفق ہے، اتنے پر قناعت کرو۔"

(مقدمہ تدبر قرآن: جلد اوّل ص 29، 30، مطبوعہ 1983ء)

میں نے اس مقام پر دانستہ طور پر مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کی تحریروں کے اقتباسات دیے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے غامدی صاحب پوری امت مسلمہ میں سے صرف انھی دو حضرات کو علما سمجھتے ہیں اور ان کو آسمان کا درجہ دیتے ہیں۔ باقی علمائے امت کو وہ خاک کے برابر سمجھتے ہیں جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب مقامات میں لکھا ہے:

''میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا لیکن امین احسن اور اُن کے استاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت''

(مقامات: صفحہ 57، 58، طبع دسمبر 2001ء، لاہور)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غامدی صاحب ان دونوں حضرات کے مسلک کے خلاف بھی اپنے کچھ ذاتی نظریات رکھتے ہیں اور محض مفاد کے حصول کے لیے ان حضرات سے اپنی شاگردی کا دعویٰ کرتے، ان سے نسبت جوڑتے اور ان کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ عورت کے پردہ، مجسمہ سازی، موسیقی، داڑھی، عورت کی امامت، جہاد، مسئلہ تکفیر، یاجوج ماجوج اور غیر مسلم سے عورت کا نکاح جیسے بیسیوں مسائل و اُمور ہیں جن میں شاگرد کا اپنے اُستادوں سے اختلاف ہے۔ پھر نہ صرف مسائل میں بلکہ اُصول دین میں بھی واضح اختلاف موجود ہے۔

اصل بحث:

غامدی صاحب نے سنت کی ابتدا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام سے کی ہے جبکہ سنت کی ابتدا تمام علمائے اُمت کے نزدیک سیّدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے ہوتی ہے، اسی لیے اسے سنت رسول ﷺ کہا جاتا ہے نہ کہ...... دین ابراہیمی کی روایت۔

سنت کا خود ساختہ مفہوم لینے کے لیے غامدی صاحب سورۃ النحل کی درج ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝﴾ (النحل: 123)

''پھر ہم نے (اے نبی ﷺ!) تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو جو یکسو تھے اور شرک کرنے والے نہ تھے۔''

مگر اس آیت سے غامدی صاحب نے جو استدلال کیا ہے، وہ قرآن کی معنوی تحریف کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ:

1۔ مذکورہ آیت میں بلاشبہ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ یعنی دین ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے کیونکہ مِلَّةَ کے معنی دین کے ہیں۔مگر اس آیت سے دین ابراہیم علیہ السلام کی روایت کیسے برآمد ہوگئی؟ اور یہ کس چڑیا کا نام ہے......؟ اس روایت کا مفہوم اس آیت کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟

2۔ مذکورہ آیت میں بے شک نبی ﷺ کو ملت ابراہیم یعنی دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے مگر اس آیت میں یہ بات کہاں ہے کہ اس کی پیروی کرتے ہوئے نبی ﷺ اس دین ابراہیم کی تجدید و اصلاح بھی فرمائیں، اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کردیں، اور پھر جو کچھ تیار ہو جائے، اسے اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمادیں؟''

یہ سارا مفہوم غامدی صاحب کے اپنے ذہن کی اُپج ہے جسے اُنہوں نے آیت کی طرف منسوب کردیا ہے۔انہوں نے اپنے ذاتی خیالات کو قرآنِ مجید کی عبارت میں پڑھنے کی بہت بُری مثال قائم کردی ہے جو ٹھیک مذموم تفسیر بالرائے اور قرآن کی معنوی تحریف ہے۔

قرآنی آیات کی معنوی تحریف کر کے ان سے اپنے من پسند نظریات برآمد کرنا دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب کی بھی عادت ہے۔اس حوالے سے ہم نے بہت سی مثالیں اپنی کتاب ''غامدی مذہب کیا ہے؟'' میں پیش کردی ہیں۔

آیت میں مِلَّةَ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی دین اور مذہب کے ہیں۔مشہور عربی لغت لسان العرب میں ہے:

''الملة: الدين كملة الاسلام والنصرانية واليهودية.''

(لسان العرب از ابن منظور: زیر مادّہ ملل)

''ملت کے معنی دین کے ہیں جیسے دین اسلام، نصرانیت (عیسائیت) کا دین، یہودیت کا دین۔''

قرآن مجید میں بھی مِلَّۃَ کا لفظ دین اور مذہب کے معنوں میں آیا ہے، مثال کے طور پر درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

1: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرہ : 120)

''اور یہودی اور عیسائی تجھ سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تو اُن کا مذہب اختیار نہ کرے۔''

2: قومِ شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ٥ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا﴾ (الاعراف : 89-89)

''اُس کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا: اے شعیب علیہ السلام! ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب علیہ السلام نے کہا: اگر ہم تمہارے مذہب سے بیزار ہوں تو کیا پھر بھی تمہاری بات مان لیں۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمہارے مذہب میں لوٹ آئیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچا چکا ہے۔''

3: ایک مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ اپنے بارے میں یہ کہیں:

﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ٥﴾ (الانعام : 161)

''کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے مجھے سیدھا راستہ بتا دیا ہے۔ وہی صحیح دین جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا جو کہ موحد تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔''

واضح ہوا کہ اس جگہ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ کا بدل ہے: دِيْنًا قِيَمًا اور اُس کا بدل ہے مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ اور تینوں کا مطلب ہے دین اسلام!

4: ﴿وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرٰهِمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ (البقرہ: 130)

''اور ایسا کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے منہ موڑے؟ سوائے اس شخص کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنالیا ہو۔''

مذکورہ آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مِّلَّةَ کے معنی دین اور مذہب کے ہیں مگر غامدی صاحب نے مِّلَّةَ إِبْرٰهِيمَ کے معنی ابراہیم علیہ السلام کا دین، لینے کی بجائے اس کے معنی دین ابراہیمی کی روایت کر کے دوسروں کو مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح وہ جس آیت سے اپنی سنت (دین ابراہیمی کی روایت) کا مفہوم کشید کرتے ہیں، اس میں سرے سے یہ معنی موجود ہی نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام کا دین تو ایک ہی تھا مگر شریعتیں الگ الگ تھیں، اس کی دلیل خود قرآن مجید میں ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ۭ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (المائدہ: 48)

''ہم نے تم میں سے ہر اُمت کے لیے الگ شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

غامدی صاحب کے اُستاد مولانا امین اصلاحی بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ تمام نبیوں اور اُن کی امتوں کے لیے ایک ہی دین تھا لیکن ہر ایک کی شریعت الگ الگ تھی۔ چنانچہ وہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ''مختلف اُمتوں کی شریعت کے اختلاف کی حکمت'' کے عنوان کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

''جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر اُمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ

الگ مقرر فرمائے تاکہ یہ چیز اُمتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے۔''

(تدبر قرآن: جلد دوم، ص 535، مطبوعہ 1983ء، لاہور)

قرآن نے یہ حقیقت کئی مقامات پر واضح کی ہے کہ تمام انبیائے کرام کا ایک ہی دین تھا۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ سیّدنا محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لیے وہی دین مقرر ہے جو سیّدنا نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا دین تھا اور اسی دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ: 13)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور اے نبی ﷺ! اسی دین کی وحی ہم نے آپ ﷺ کی طرف کی ہے اور اسی پر چلنے کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

ایک اور مقام پر اٹھارہ انبیائے سابقین (نوح، ابراہیم، اسحٰق، اسمٰعیل، یعقوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، ایوب، زکریا، یحییٰ، الیاس، الیسع، یونس، لوط اور عیسیٰ علیہم السلام) کا ذکر کر کے نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ ان کی ہدایت یعنی دین کی پیروی کریں۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الانعام: 89-90)

''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب دی، حکومت بخشی اور نبوت عطا کی۔ اب اگر یہ لوگ (مکے والے قریش) ہماری نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں تو ہم نے

ان کی بجائے ایسے لوگ مقرر کر دیے ہیں جو ان نعمتوں کی ناشکری کرنے والے نہیں۔ (اے نبی ﷺ!) پہلے نبیوں کو بھی اللہ نے ہدایت بخشی، لہٰذا آپ ﷺ بھی ان کی ہدایت (دین) کی پیروی کریں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ صرف ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ تمام انبیائے کرام کی ہدایت اور دین کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ سب کا دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے جو سراپا ہدایت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح اور سچا دین بھی صرف اسلام ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: 19)

''بے شک اللہ کے نزدیک (سچا) دین صرف اسلام ہے۔''

بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ آخرت میں صرف دین اسلام مقبول دین ہوگا اور اس کے سوا کوئی اور دین مقبول نہ ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (آل عمران: 85)

''اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ شخص آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔''

تمام انبیائے کرام کا دین اسلام رہا اور سب کی تعلیمات میں درج ذیل اُمور مشترک تھے۔ وجودِ باری تعالیٰ، عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت و رسالت، عقیدۂ آخرت، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتب پر ایمان، ایک اللہ کی عبادت (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی وغیرہ)، حقوق العباد (جیسے والدین سے حسن سلوک) اور اچھے اخلاق (جیسے سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا وغیرہ)

گویا سب کے ہاں اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال یکساں تھے، لیکن سب کی شریعتیں جدا جدا تھیں۔ حتیٰ کہ قبلہ تک مختلف تھا جس کی طرف نماز پڑھنے سے ان کی نماز درست ہو سکتی تھی:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ (البقرہ: 148)

"اور ہر مذہبی گروہ کا اپنا ایک قبلہ ہے جس کی طرف منہ کر کے وہ عبادت کرتا ہے مگر تم لوگ نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔"

ان تمام تصریحات کے بعد یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ سورۃ النحل کی مذکورہ آیت میں سیّدنا محمد ﷺ کو جس دین ابراہیمی کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ وہی دین ہے جو تمام انبیائے کرام کا مشترکہ دین ہے۔ اس میں صرف دین ابراہیمی کی خصوصیت یا تخصیص نہیں ہے کیونکہ قرآن میں دوسرے انبیائے کرام کا ذکر کر کے ان کی ہدایت اور دین کی اقتدا اور پیروی کرنے کا حکم بھی نبی کریم ﷺ کو دیا گیا ہے۔ مگر غامدی صاحب دین ابراہیمی کو جو تمام انبیائے کرام کا دین ہے اس کو پہلے دین ابراہیمی کی روایت کا نام دیتے ہیں اور پھر اسے سنت کا قرار دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ سیّدنا محمد ﷺ کی بعثت کے وقت مکے میں دین ابراہیمی کی کون سی روایت موجود تھی جس کی پیروی کا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا تھا؟ وہاں تو قریش کی وہ حالت تھی جسے دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے اور وہ لوگ تو شرک، بت پرستی، گمراہی اور اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ جاہلیت کے جو معاشرے توحید کا بنیادی عقیدہ چھوڑ چکے تھے، اس کے ہاتھوں میں دین ابراہیمی کی کون سی روایت اپنی اصل حالت میں محفوظ تھی؟ جو قوم سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے سیدھے سادے اور واضح عقیدۂ توحید کی حفاظت نہیں کرسکی تھی اُس کے ہاتھوں میں دین ابراہیمی کی کون سی روایات محفوظ رہ گئی تھیں؟ اگر دین ابراہیمی کی روایت سے مراد یہ ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا جو دین چلا آرہا تھا تو یہ بات حقیقت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ ان کا دین اپنی اصلی صورت میں سیّدنا محمد ﷺ کے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ تاریخ عرب سے واقف کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس اس بات کا دعویٰ ہرگز نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے بتائے ہوئے دین میں جب بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور قوم اصل دین کو فراموش کر بیٹھتی ہے تو اس دین کی یاد دہانی کے لیے نئے نبی کی بعثت ہوتی ہے، لیکن اگر پہلے نبی کے دین کی روایت اپنی اصلی حالت میں موجود اور محفوظ ہوتو پھر کسی نئے نبی

کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیّدنا محمد ﷺ کی بعثت کے وقت نہ صرف ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بگاڑ آ چکا تھا بلکہ اُن کے بعد آنے والے انبیائے کرام سیّدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو بھی لوگ بھلا بیٹھے تھے جبھی تو اس کی دعوت وتبلیغ کے لیے سیّدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا۔

اب اگر غامدی صاحب کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے دین کی روایت اجماع اور تواتر کے ساتھ عرب کے دورِ جاہلیت میں بھی موجود تھی تو ایسی صورت میں سیّدنا محمد ﷺ کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

پھر سورۃ النحل کی مذکورہ آیت میں سیّدنا محمد ﷺ کو سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا، کیونکہ ایک تو ان دونوں انبیا کی شریعتیں الگ الگ ہیں، دوسرے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کا عرب میں کوئی وجود نہ تھا جس کی پیروی کا حکم نبی کریم ﷺ کو دیا جاتا۔ بلکہ آپ ﷺ کو اپنی الگ شریعت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن نبی ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الجاثیہ: 18)

”پھر ہم نے آپ ﷺ کو دین کی ایک الگ شریعت پر قائم کیا لہٰذا آپ ﷺ اسی پر چلیں اور اُن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔“

اس لیے یہ بات قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ نبی ﷺ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ ﷺ دین ابراہیمی کی روایت میں پہلے وحی یا اجتہاد سے تجدید واصلاح فرمائیں، پھر اس میں کچھ اضافے کر دیں اور آخر میں اسے اپنے ماننے والوں پر دین کی حیثیت سے جاری فرماتے ہوئے اس کا نام سنت رکھ دیں۔

غامدی صاحب کو ہمارا چیلنج ہے کہ وہ سنت کی جو تعریف فرما رہے ہیں اور اس کا جو مفہوم

مراد لے رہے ہیں، سنت کی یہی تعریف اور یہی مفہوم وہ پوری اُمت میں سے کسی ایک محدث، فقیہ یا مجتہد کے ہاں دکھا دیں اور اگر ان کی اس نادر فکر اور نرالے اجتہاد سے امت کا کوئی صاحب علم متفق نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو وہ اسلامی اصطلاحات کے مفاہیم بگاڑنے کا ٹھیکہ نہ لیں۔ خود گمراہ نہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ سبیل المؤمنین اور اجماعِ امت کی راہ اختیار کریں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ چونکہ غامدی صاحب:

1. سنت کی ابتدا سیّدنا محمد ﷺ سے ماننے کی بجائے سیّدنا ابراہیم علیہ السلام سے مانتے ہیں۔
2. سنت کو تنہا نبی کریم ﷺ کی روایت قرار دینے کی بجائے دو انبیائے کرام (سیّدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیّدنا محمد ﷺ) کی مشترکہ روایت قرار دیتے ہیں۔
3. سنت کی اسلامی اصطلاح کی متفقہ اور مسلّمہ اجماعی تعریف اور مفہوم...... یعنی شریعت کے وہ احکام جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر (خاموش تائید) کے ذریعے ثابت ہوں...... کو چھوڑ کر اس کی وہ من گھڑت اور خود ساختہ تعریف کرتے ہیں اور اس سے اپنا من پسند مفہوم نکالتے ہیں۔

اس لیے وہ بھی منکرین حدیث کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں اور ہمارے زمانے کے منکرین حدیث اب اُن کو اپنی صف میں پا کر بڑی مسرت کا اظہار کرتے پھرتے ہیں۔

2۔ کیا احادیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا اہتمام نہیں کیا گیا؟

دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب کا بھی دعویٰ ہے کہ حدیث کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دین کا حصہ نہیں۔ یہ دین سے الگ کوئی غیر اہم شے ہے۔ دین کا کوئی عقیدہ اور عمل اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر احادیث کی کچھ اہمیت ہے اور یہ بھی دین کا حصہ ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا خود کوئی اہتمام کیوں نہ فرمایا۔

چنانچہ وہ اپنی مشہور ''ڈنڈی مار'' کتاب ''میزان'' میں 'مبادیٔ تدبر حدیث' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم انہیں ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ (ایک خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی، لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور نہیں۔) دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔ حدیث سے متعلق یہی دو حقائق ہیں جن کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔"

(میزان: ص 68، طبع دوم اپریل 2002ء، لاہور)

ذیل میں ہم سب سے پہلے غامدی صاحب کی اس پُر فریب اور مغالطہ انگیز تحریر کا تجزیہ کریں گے اور پھر اس پر جامع تبصرہ کیا جائے گا۔ [1]

مغالطہ انگیزی اور فریب دہی:

1۔ اہل علم جانتے ہیں کہ حدیث کے اصطلاحی مفہوم میں خبر متواتر (اخبارِ متواترہ) بھی شامل ہوتی ہے، لیکن مذکورہ عبارت کے ذریعے غامدی صاحب نے اخبارِ متواترہ کو حدیث کے اصطلاحی مفہوم سے نکالنے اور اسے محض اخبارِ آحاد کے مفہوم میں محدود کر دینے کے لیے لکھ دیا ہے کہ اس سے صرف وہی روایتیں مراد ہیں:

"جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں۔"

---

[1] "میزان" کے نئے ایڈیشن طبع سوم مئی 2008ء میں "دو باتیں...... سے لے کر...... ناگزیر ہے کہ اس" ...... تک کی پوری عبارت حذف کردی گئی ہے تاکہ ممکنہ تنقید سے بچا جاسکے۔ (مصنف)

اس طرح غامدی صاحب نے اپنے قارئین کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے اصطلاح تو محدثین سے لی ہے مگر اُسے اپنے ذاتی معنی پہنا کر پیش کر دیا ہے۔

دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب بھی اس بات کے عادی ہیں کہ وہ معروف دینی اور شرعی اصطلاحیں تو علمائے اسلام سے لیتے ہیں مگر ان اصطلاحوں کے مفاہیم بدل کر انہیں اپنے من پسند معنی پہناتے ہیں۔ یہی حرکت انہوں نے سنت کی دینی اصطلاح کے بارے میں بھی کی ہے اور وہ اس کے اصطلاحی مفہوم کو چھوڑ کر اپنا یہ اختراعی مفہوم مراد لیتے ہیں کہ

> ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔'' (میزان: ص 14، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

اسی طرح دیگر دینی اصطلاحات کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ شرعی اصطلاحوں کے اصلی مفاہیم سے انکاری ہیں مگر انہی اصطلاحات کے استعمال پر مُصر بھی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ؎

منکرِ مَے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

''شراب کا مخالف بھی ہونا اور شرابیوں جیسے رنگ ڈھنگ بھی اختیار کرنا۔''

2۔ غامدی صاحب نے مذکورہ عبارت کے ذریعے اپنے قارئین کو دوسرا یہ دھوکا اور مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے کہ اُنہوں نے شروع ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ وہ آگے چل کر جن جن باتوں کا دعویٰ کریں گے اور جو کچھ اپنے جی سے بیان کریں گے، وہ از خود اتنی واضح اور مبنی بر حقیقت ہوں گی کہ کوئی صاحبِ علم نہ تو اُن سے اختلاف کر سکتا ہے اور نہ اُن کو ماننے سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے؟ جبکہ اُن کے کسی دعویٰ کو تسلیم کرنا کسی صاحبِ علم پر لازم نہیں اور وہ غامدی صاحب کی کسی بھی احمقانہ بات سے اختلاف کا حق رکھتا ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سوا ہر شخص سے

اختلاف کی گنجائش ہے اور اس حوالے سے قرآن وسنت کی نصوص کی تصریحات موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا غامدی صاحب معصوم عن الخطا ہیں کہ اُن کی کسی بات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں؟ یا وہ وحی کی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں کہ ان سے دوسرے اہل علم کو اختلاف کی مجال نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کس برتے پر اپنے خیالات اور دعاوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ

''یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم اُنہیں ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔''

گویا ہر صاحب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ غامدی صاحب کے رطب ویابس پر آمنا وصدقنا کہے، ورنہ اُسے صاحب علم ہونے کے اعزاز سے محروم ہونا پڑے گا۔

3۔ مذکورہ تحریر کے ذریعے غامدی صاحب تیسرا یہ مغالطہ اور دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ پہلے تو وہ جوش میں آ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

''رسول اللہ ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔''

لیکن پھر اُن کو جلد یہ خیال آتا ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ تو کسی عام پڑھے لکھے آدمی کو بھی ہضم نہیں ہوگا، اس لیے انہوں نے اس عبارت کے نیچے فٹ نوٹ میں دبے لفظوں کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ:

''ایک خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے (حدیث کو) دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی۔''

پھر چونکہ اس حوالے سے اُن کے اپنے مذکورہ بیان کی تردید کا پہلو نکلتا تھا، اس لیے پھر پینترا بدل کر آگے عبارت میں یہ اضافہ کر دیا کہ:

''لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔''

غامدی صاحب نے ان الفاظ کا اضافہ کر کے نبی کریم ﷺ کے اس عظیم الشان خطبہ

حجۃ الوداع کی تعلیمات اور احکام کی اہمیت گھٹانے کی سعیٔ نامراد فرمائی ہے۔ وہ خطبہ جو حضور ﷺ نے لاکھوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کے سامنے دیا اور جو انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور ہے اور جو دین اسلام کا مکمل پیغام ہے۔ غامدی صاحب اُسے یہ کہہ کر ٹھکرا رہے ہیں کہ:

''لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔''

آخر کیا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فرامین و احکام کی یہی حیثیت ہے کہ ان کو مذکورہ گستاخانہ الفاظ میں بیان کیا جائے؟

4۔ مذکورہ حوالے کے ذریعے غامدی صاحب نے دوسروں کو چوتھا یہ مغالطہ اور فریب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آگے اسی فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں کہ

''اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور نہیں۔''

ان الفاظ سے غامدی صاحب دوسروں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار ہیں جو تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص بخاری اور مسلم کی متفق علیہ اور صحیح احادیث کو کچھ اہمیت نہ دیتا ہو اور اُن کو ماننے سے انکاری ہو، وہ تاریخ کے کسی مستند ماخذ کو کیسے مان کر دے گا؟ جس آدمی کا نظریہ یہ ہو کہ:

''کسی چیز کو بھی خواہ وہ حدیث کی اُمہات کتب بخاری و مسلم اور مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہی میں کیوں نہ بیان ہوئی ہو، آپ کی نسبت سے ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے۔'' (ملاحظہ ہو غامدی صاحب کی کتاب 'میزان': ص 62، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

تو کیا جو آدمی بخاری اور مسلم کی صحیح روایات کو نہیں مانتا، وہ ابن خلدون اور طبری کی کتب تاریخ کو مان لے گا؟ جو شخص اجماعِ قطعی سے ثابت شدہ شرعی احکام کو تسلیم نہیں کرتا، وہ طبقاتِ ابن سعد اور تاریخ مسعودی کو کیسے تسلیم کر لے گا؟

قارئین کرام! میں اصل موضوع پر بحث کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر غامدی صاحب کے اندازِ بیان کے دجل وفریب کا پردہ چاک کر رہا ہوں تو اس سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ میں آپ کو اس شخص کے طریق واردات سے آگاہ کر دوں جو ''زخرف القول غرورا'' کے مصداق اپنے مخاطب کو فریب دینے کا عادی اور دجالی کمالات رکھتا ہے۔

نبی کریم ﷺ اور حفاظت حدیث:

اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔ غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔''

ہمارا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو احادیث سننے، ان کو حفظ کرنے اور ان کی کتابت وتحریر کرنے کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں دعا فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ نے حفظ اور کتابت دونوں ذرائع سے کام لیتے ہوئے احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ واشاعت کا اہتمام فرمایا۔

پھر چونکہ احادیث کا زیادہ حصہ عمل سے متعلق تھا۔ اس لیے ﴿اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔'' کے قرآنی حکم کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جیسے حضور ﷺ کو کوئی کام کرتے دیکھا، اُسے ویسے ہی کرنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ نسل در نسل آگے چلتا گیا۔ اس طرح فعلی احادیث کا کثیر ذخیرہ عملی طور پر اُمت کو منتقل ہو گیا جو آج تک اُمت مسلمہ میں جاری و ساری ہے۔ اس کے علاوہ حدیث کی حفاظت اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

1۔ سنن ابوداؤد (کتاب العلم) میں سیّدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

((سمعت رسول الله ﷺ يقول: نَضَّر الله امرءً سمع منا حديثاً فحفظه حتى يبلغه......)) (سنن ابوداؤد:3660)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ اُس شخص کو تروتازہ رکھے جو ہم سے حدیث سنے، پھر اُسے یاد اور محفوظ رکھے اور پھر اُسے دوسروں تک پہنچا دے......''

گویا اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ایسے ہر صحابی کے حق میں دعا فرمائی ہے جو آپ سے حدیث سن کر اُسے یاد رکھے اور پھر دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔

2۔ اسی طرح جامع ترمذی میں بھی سیّدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

((نَضَّر اللہ امرأً سَمِعَ منا حدیثًا فحفظه حتی یبلغه غیره......))

(جامع ترمذی:2656)

''اللہ اُس آدمی کو تروتازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سن کر یاد کر لی اور اُسے دوسرے تک پہنچا دیا......''

3۔ جامع ترمذی ہی میں ایک اور حدیث سیّدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

((نضر اللہ امرأً سمع منا شیئًا فبلّغه کما سمعه، فرُبَّ مبلغ أوعٰی من سامع .)) (ترمذی:2657)

''اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے مجھ سے کچھ سنا۔ پھر جیسے اُس نے سنا تھا ویسے ہی دوسروں تک اسے پہنچا دیا۔ ممکن ہے جسے بات پہنچائی جائے وہ پہلے سننے والے سے بھی زیادہ اُسے یاد رکھنے والا ہو۔''

4۔ جامع ترمذی میں ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((نضر اللہ امرء سمع مقالتي فوعاها وحفظها وبلغها......))

(رقم:2658)

''اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری کوئی بات سنی، پھر اُسے یاد

رکھ کر محفوظ کر لیا اور اُسے کسی اور تک پہنچا دیا۔''

اس کے علاوہ اسی مضمون کی احادیث سیّدنا معاذ بن جبل، سیّدنا جبیر بن مطعم اور سیّدنا ابو درداء رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

5۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیّدنا ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ

((ولیبلغ الشاھد الغائب .)) (صحیح بخاری:104و صحیح مسلم:3304)

''اور ضروری ہے کہ جو یہاں حاضر ہے، وہ اُس تک (میری باتیں) پہنچا دے جو یہاں حاضر نہیں ہے۔''

6۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((فلیبلغ الشاھد الغائب .)) (صحیح بخاری:1741)

''پس لازم ہے کہ جو یہاں پر حاضر ہے، وہ اُس تک جو یہاں حاضر نہیں ہے، (میری باتیں) پہنچا دے۔''

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ ارشادات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں بار بار دُعا بھی فرمائی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حفاظتِ حدیث:

نبی کریم ﷺ کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں اور ان کے احکام کی تعمیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ یاد کر لیا، اُسے لکھ کر محفوظ کیا، اس پر خود عمل کیا اور اسے دوسروں لوگوں تک پہنچا دیا۔

ذیل میں ہم چند مکثرین (بکثرت روایت کرنے والے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بیان کریں گے کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ہزاروں احادیث سن کر یاد

کرلیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچایا:

① سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے 5374 حدیثیں حفظ کر کے اُمت تک منتقل کیں۔

② سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے 2630 حدیثیں یاد کیں اور پھر ان کو امت تک پہنچایا۔

③ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے 2286 حدیثیں زبانی یاد کر کے محفوظ کیں اور پھر ان کو امت کے حوالے کیا۔

④ اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے 2210 حدیثیں یاد کرنے کے بعد دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔

⑤ سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے 1660 حدیثیں حفظ کرنے کے بعد اپنے شاگردوں تک منتقل کیں۔

⑥ سیّدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے 1540 حدیثیں یاد کیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔

⑦ سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے 848 حدیثیں حفظ کیں اور ان کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔

جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیثیں لکھیں اور ان کے مجموعے (صحیفے) مرتب کیے یا املا کرائے اُن کی تعداد پچاس کے قریب ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ سیّدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کا صحیفہ جسے 'صحیفہ ابوزبیر' بھی کہا جاتا ہے۔

2۔ صحیفہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

3۔ صحیفہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ

4۔ صحیفہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما

5۔ صحیفہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ

6۔ صحیفہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ

7۔ صحیفہ سیّدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ

8۔ صحیفہ سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ

9۔ صحیفہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ

10۔ صحیفہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، جو صحیفہ ہمام بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ساری تفصیل جان لینے کے بعد بھی کیا کوئی معقول شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔''

کیا اخبارِ آحاد دین کا حصہ نہیں؟

غامدی صاحب پہلے تو یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ

''اس (حدیث) سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے درجے کو نہیں پہنچتا۔''

اور پھر اس دعویٰ کی بنا پر خود ہی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''اس کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اِضافہ نہیں ہوتا۔''

اب ہم پہلے ان کے دعوے پر گفتگو کریں گے اور آخر میں ان کے نکالے ہوئے نتیجے پر تبصرہ کریں گے۔

کیا حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس بات پر تمام محدثین اور فقہائے اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ خبر متواتر، جو حدیث ہی کی ایک قسم ہے، اس سے علم یقین حاصل ہوتا ہے۔

غامدی صاحب جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا تو وہ ایک ایسی بات کرتے ہیں جس کا اہل علم میں سے کوئی بھی قائل نہیں اور اجماع امت کے مقابلے میں غامدی صاحب کی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے؟

پھر اس بات پر تمام محدثین عظام اور فقہائے کرام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اخبارِ آحاد کا درجہ اگرچہ اخبار متواترہ سے کچھ کم ہے، تاہم جب وہ صحیح ہوں تو وہ بھی دین میں حجت

اور دلیل ہوتی ہیں اور ان سے بھی ہر طرح کے شرعی احکام اخذ ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی مسلمان اپنے وارث کے حق میں مالی وصیت نہیں کرسکتا اور نہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرسکتا ہے۔ یہ دونوں مسلمہ اجماعی شرعی احکام ہیں مگر یہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد سے ثابت ہیں۔ اگر اخبارِ آحاد کو دین سے نکال دیا جائے تو پھر دین اسلام کے 90 فیصد حصے کو بھی دین سے خارج کرنا پڑے گا اور مسلمہ اسلامی احکام و تعلیمات کو چھوڑنا پڑے گا۔

اور ہم یہ بات پورے حزم و احتیاط سے بیان کر رہے ہیں، ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اخبارِ آحاد ترک کرنے سے ہمیں پورا دین ترک کرنا پڑے گا اور اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے، کیونکہ ہمارا کلمۂ اسلام (کلمہ طیبہ اور شہادتین) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد ہی سے ثابت ہے، ان کے سوا اس کلمے کا اثبات کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ یہ کلمہ نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ غامدی صاحب کی بتائی ہوئی سنت کی فہرست میں شامل ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اس کلمے کے اقرار ہی سے کوئی شخص دین کے دائرے میں داخل ہوتا اور اس کے انکار سے وہ دین کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہی کلمہ اسلام اور کفر میں امتیاز اور حدِ فاصل ہے۔ اسی کو پڑھنے سے آدمی مسلمان ہوتا اور اسے چھوڑنے سے وہ کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ کلمہ ہمارے دین کی اساس ہے مگر اس کا ثبوت بھی صرف اخبارِ آحاد سے ملتا ہے۔

خود قرآنِ مجید ہمیں اخبارِ آحاد کی بنیاد پر شرعی فیصلے کرنے کا مجاز قرار دیتا ہے۔ وہ ہمیں ایک، دو یا چار معتبر اور عادل ﴿ذَوَا عَدْلٍ﴾ مسلمانوں کی خبر پر یقین کرنے کا پابند کرتا ہے اور ان کی گواہی پر حدود جاری کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے نتیجے میں شرعی طور پر کسی مجرم کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے، کسی کو پھانسی پر چڑھا کر قتل کیا جاسکتا اور کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاسکتے ہیں۔ پھر جب قرآنِ مجید نے اپنے نظامِ عدل و انصاف کی بنیاد غیر متواتر شہادتوں اور اخبارِ آحاد پر رکھی ہے تو قرآن کے مقابلے میں کوئی مسلمان یہ کہنے کی جسارت کیسے کرسکتا

ہے کہ کسی حدیث کو حدیث رسول ﷺ یا حکم رسول ﷺ ماننے کے لیے تواتر کی شرط ضروری ہے اور یہ کہ ایک، دو یا چار معتبر اور عادل راویوں کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے اُسے علمِ یقین حاصل نہیں ہو پاتا۔ جب کہ اسلام میں صرف ایک معتبر اور عادل شخص (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی شہادت پر رؤیت ہلال ثابت ہو جاتی ہے جس کے بعد شرعی طور پر مسلمانوں کے لیے دوسرے دن روزہ رکھنا (یا نہ رکھنا) لازم ہو جاتا ہے۔

اخبارِ آحاد میں سے ایک متفق علیہ غریب حدیث ہے کہ "انما الأعمال بالنیات......" ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔'' (صحیح بخاری:1) ہر مسلمان اس فرمانِ نبوی ﷺ سے واقف ہے۔ اس حدیث کے صرف ایک ہی راوی سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں، لیکن ساری اُمت اسے صحیح اور درست مانتی ہے اور فقہائے اسلام اس سے مسائل کا استنباط کرتے اور استدلال میں پیش کرتے ہیں۔

افسوس کہ غامدی صاحب ایک طرف تو حدیث وسنت کو ماننے کے لیے تواتر کی شرط لگاتے ہیں اور اس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں صحیح احادیث کو ناقابلِ اعتماد اور غیر یقینی ٹھہرانے لگتے ہیں اور دوسری طرف اگر ان کو کوئی ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت روایت بھی مل جائے جو اُن کی خواہش اور ہوائے نفسانی کے مطابق ہو تو اُسے وہ بلا تامل مان لیتے اور اسے دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کردیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل حدیث جو بالاتفاق موضوع اور من گھڑت ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

((رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر.))

(السلسلة الضعيفة والموضوعة للالباني: 2460)

''ہم جہادِ اصغر (قتال فی سبیل اللہ) سے جہادِ اکبر (جہاد بالنفس) کی طرف واپس لوٹے ہیں۔''

تو دیکھئے ایسی بے اصل اور موضوع روایت کو غامدی صاحب کس طرح متواتر بھی مانتے ہیں، اس سے اُن کو علمِ یقین بھی حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس سے استدلال بھی فرماتے

ہیں۔ چنانچہ وہ جہاد کے اسلامی تصور کو مسخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں میں جہاد کا لفظ اپنے لغوی مفہوم میں بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دین کی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا تو اُسے بھی جہاد کہا گیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں سربراہِ ریاست کی حیثیت سے یہود و نصاریٰ اور دوسرے مشرکین عرب کو دین کی دعوت پیش کی تو اسے بھی جہاد کا عنوان دیا۔ ایک غزوہ سے واپسی پر اپنے ساتھیوں کو عام زندگی میں تقویٰ اور راست روی کی روش اختیار کرنے کی نصیحت کی تو اسے قتال فی سبیل اللہ کے مقابلے میں جہادِ اکبر قرار دیا۔ چنانچہ ان معنوں میں دین کی سربلندی کے لیے کئے گئے کسی بھی کام کو جہاد کہا گیا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔'' (ملاحظہ ہو: ماہنامہ اشراق شمارہ دسمبر 1993، ص 18)

یہ ہے غامدی صاحب کی احادیث کے بارے میں اصول پرستی، تحقیق انیق اور ان پر تدبر کرنے کی اصل حقیقت، جس کا وہ ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں۔

3۔ کیا حدیث دین کا حصہ نہیں ہے؟

حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کا تصور یہ ہے کہ اس سے عام طور پر اخبارِ آحاد ہی مراد ہوتی ہیں اور ان سے نہ تو دین کا کوئی عقیدہ، عمل یا حکم ثابت ہوتا ہے اور نہ یہ دین کا حصہ ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں اُن کا یہ تصورِ حدیث ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں حدیث کی حجیت ختم ہو جاتی ہے جبکہ حدیث و سنت دین میں حجت ہے۔ اس سے نہ صرف اخبارِ آحاد مراد ہوتی ہیں بلکہ اس میں احادیث متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث سے دین کے عقائد، اعمال اور احکامات بھی ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ وہ حدیث کی اہمیت اور حجیت کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبارِ آحاد جنھیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم

حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔''

(میزان ص15، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اُصول ومبادی: ص 11، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے۔

2۔ حدیث اور دین الگ الگ چیزیں ہیں۔

3۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔

4۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عمل ثابت نہیں ہوتا۔

اب ہم ان تمام اُمور پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

1۔ کیا حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے؟

علم حدیث کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں اخبارِ متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ غامدی صاحب کی روشن خیالی ہے کہ وہ حدیث کو صرف اخبارِ آحاد میں محصور ومحدود قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی ''ربع صدی پر محیط دینی تحقیق کے ساتھ ساتھ کبھی چند لمحے اس پر بھی صرف کرتے کہ علم حدیث کی کوئی متداول کتاب مثلاً ''مقدمۃ ابن الصلاح'' اور ''نخبۃ الفکر'' ہی دیکھ لیتے تو اُن کو یہ معلوم ہو جاتا کہ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح میں اخبارِ متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔

اُمت کے کسی فقیہ یا محدث نے آج تک حدیث سے صرف اخبارِ آحاد مراد نہیں لیں اور نہ کسی نے اخبارِ متواترہ کو حدیث سے خارج قرار دیا ہے۔ یہ اعزاز صدیوں بعد صرف غامدی صاحب کو حاصل ہوا ہے جنہوں نے تمام محدثین اور فقہا کے برخلاف صرف اخبارِ آحاد کو حدیث سمجھا ہے اور اخبارِ متواترہ کو حدیث کے زمرہ سے نکال باہر کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے کئی بار واضح کیا ہے کہ غامدی صاحب کا طریق واردات یہ ہے کہ وہ

اصطلاحات تو علمائے اسلام کی استعمال کرتے ہیں مگر ان کے معانی اپنے جی میں گھڑ لیتے ہیں اور اس طرح خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وحی، کتاب، سنت، تواتر، فطرت، اِجماع، معروف، منکر اور عرف جیسی بہت سی اسلامی اصطلاحات کے مَن گھڑت معنی لے کر اُنہوں نے دوسروں کو مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ غامدی صاحب نے اخبارِ متواترہ کو حدیث کے زمرے سے خارج کر کے ہمارے نزدیک انکارِ حدیث کا ارتکاب کیا ہے۔

2۔ کیا حدیث اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں؟

غامدی صاحب نے حدیث اور دین کو دو الگ الگ چیزیں سمجھ رکھا ہے۔ اُن کے نزدیک حدیث دین سے خارج کوئی شے ہے، جس سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ گویا حدیث کے بغیر بھی دین مکمل ہے اور حدیث دین سے زائد کوئی چیز ہے۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث کے بغیر دین کا تصور صرف منکرین حدیث کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی اس 'ایجاد' کے 'موجد' نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے ایک مستشرق 'جوزف شاخت' نے اپنی ایک کتاب میں یہ جھوٹا دعویٰ کیا تھا اور اسی کی نقالی میں ہمارے ہاں کے منکرین حدیث یہ کہتے پھرتے ہیں کہ حدیث دین سے کوئی الگ شے ہے۔

اہل اسلام حدیث وسنت کے بغیر اسلام کو مکمل نہیں سمجھتے، کیونکہ اسلام نام ہی قرآن و حدیث کے مجموعے کا ہے۔ اگر حدیث کو اسلام سے خارج کر دیا جائے تو جو کچھ باقی بچے گا، وہ صحیح اسلام نہیں ہوگا بلکہ ناقص اور اُدھورا اسلام ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ناقص اور ادھورا اسلام مقبول نہیں ہے۔

3۔ کیا حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کے جو عقائد صرف حدیث سے ثابت ہیں، وہ اُن سب کے منکر ہیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی عقائد کی بنیاد صرف احادیث پر ہے اور وہ صرف حدیث ہی سے ثابت ہیں جیسے:

1۔ تقدیر پر ایمان: تقدیر پر ایمان لانا حدیث جبریل علیہ السلام سے ثابت ہے اور اس حدیث میں جو اُمور بیان ہوئے ہیں، اُن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین قرار دیا ہے "یعلمکم دینکم" (صحیح مسلم: حدیث 9) لہٰذا تقدیر پر ایمان لانا دین کا حصہ ہے اور اُن امور میں سے ہے جن پر ایمان لائے بغیر کسی مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ مگر غامدی صاحب فرما رہے ہیں کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ تقدیر پر ایمان لانا کوئی الگ عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ توحید کے عقیدہ کی فرع ہے تو پھر عقیدۂ آخرت کو عقیدۂ توحید کی فرع قرار دینے میں کون سا امر مانع ہے۔ وہ بھی تو توحید ہی کے عقیدے کی فرع ہے، لیکن اُس کی ایک مستقل حیثیت ہے اسی طرح تقدیر پر ایمان لانے کا عقیدہ بھی اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث جبریل علیہ السلام میں اس کو الگ اور مستقل حیثیت سے بیان فرمایا ہے اور اس عقیدے کے بغیر کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

عقیدۂ توحید کے علاوہ بہت سے عقائد احادیث ہی کی بنیاد رکھتے ہیں، مثال کے طور پر

2۔ قبر کا عذاب۔ (صحیح بخاری: حدیث 1372)

3۔ قبر میں فرشتوں کا آنا اور مردے سے سوال و جواب کرنا۔ (صحیح بخاری: 1338)

4۔ یہ عقیدہ کہ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ (صحیح بخاری: 1)

5۔ ختم نبوت کا عقیدہ اور مدعی نبوت کا واجب القتل ہونا۔

(صحیح بخاری: 3535، سنن ابی داؤد: 4252)

6۔ یہ عقیدہ کہ گناہ گار مؤمن دوزخ کی سزا پانے کے بعد بالآخر جنت میں جائیں گے۔

(صحیح بخاری: 7440)

7۔ عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اُٹھایا جانا (رفع عیسیٰ علیہ السلام)، اور ان کا دوبارہ قیامت کے

قریب دنیا میں تشریف لانا (نزولِ عیسیٰ علیہ السلام) (صحیح بخاری:2222)

8۔ نیک اعمال کو وسیلہ بنانے کا عقیدہ۔ (صحیح بخاری:2215)

9۔ آخرت میں پل صراط کا ہونا (جَسْــر) جس پر سے سب انسانوں کو گزرنا پڑے گا پھر جو لوگ جنت کے مستحق ہوں گے، وہ اسے عبور کر کے جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی اسے پار نہ کر کے جہنم میں گر جائیں گے۔ (صحیح بخاری:7440)

10۔ (رحمت کے) فرشتے اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں تصاویر اور کتے موجود ہوں۔ (صحیح بخاری:3225)

11۔ نبی کریم ﷺ کی شفاعت کبریٰ جب آخرت میں وہ سجدہ ریز ہو کر اپنی اُمت کے لیے شفاعت کریں گے اور وہ مقبول شفاعت ہوگی۔ (صحیح بخاری:4712)

12۔ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ (صحیح مسلم:2996)

یہ اور اس طرح کے بہت سے مسلمہ اسلامی عقائد ہیں جو صرف حدیث سے ثابت ہوتے ہیں۔ اب اگر غامدی صاحب کے اس نظریے کو درست مان لیا جائے کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا تو ہمیں بہت سے مسلمہ اسلامی عقائد کو ترک کرنا پڑے گا اور ہم غامدی صاحب کی خاطر اسلام کے مسلمہ عقائد چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ ایسا کرنا عین گمراہی ہے۔

4۔ کیا حدیث سے دین کا کوئی عمل ثابت نہیں ہوتا؟

غامدی صاحب کے خیال میں حدیث سے دین کا کوئی عمل یا حکم ثابت نہیں ہوتا، لیکن اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حدیث سے دین اسلام کے عقائد ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح اس سے دینی اعمال و احکام بھی ثابت ہوتے ہیں۔

پھر جس طرح حدیث سے ثابت شدہ عقائد کا انکار کفر اور گمراہی ہے، اسی طرح حدیث سے ثابت شدہ اعمال و احکام کا انکار بھی کفر اور گمراہی ہے۔ جو شخص بھی حدیث سے ثابت شدہ عقائد و اعمال کا منکر ہے، علمائے اسلام کے نزدیک وہ کافر اور گمراہ ہے۔ ذیل میں ہم

چند ایسے دینی اعمال واحکام بیان کرتے ہیں جو صرف حدیث کی بنیاد پر ثابت ہیں:

1۔ مرتد کے لیے سزائے قتل۔ (صحیح بخاری:6878)

2۔ شادی شدہ زانیوں کے لیے رجم یعنی سنگساری کی سزا۔ (صحیح بخاری:6824)

3۔ شراب نوشی پر سزا۔ (صحیح مسلم:1706)

4۔ مردوں کے لیے داڑھی بڑھانا۔ (صحیح بخاری:5893)

5۔ عورتوں کے لیے خاص ایام میں نماز کا معاف ہونا۔ (صحیح بخاری:306)

6۔ کسی کی منگنی پر دوسرے کا منگنی نہ کرنا۔ (صحیح بخاری:5144)

7۔ کسی کے سودے (بیع) پر دوسرے کا سودا نہ کرنا۔ (صحیح بخاری:2139)

8۔ مردوں کے لیے سونے کا استعمال کا حرام ہونا۔ (سنن ترمذی:1720)

9۔ مردوں کے لیے ریشم کا لباس پہننے کی ممانعت وحرمت۔ (صحیح بخاری:5833، ترمذی:1720)

10۔ شہید کی میت کو غسل نہ دینا اور اُسے کفن نہ پہنانا۔ (صحیح بخاری:1347، سنن ابی داود:3133)

11۔ کسی مسلمان مرد کے لیے اپنی پھوپھی، بھتیجی یا خالہ، بھانجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کا حرام ہونا۔ (صحیح بخاری:5109)

12۔ پالتو گدھے، کچلی والے درندے اور پنجے والے شکاری پرندوں کا گوشت حرام ہونا۔ (صحیح بخاری:3155)

13۔ نمازِ تراویح۔ (صحیح بخاری:1147)

14۔ نمازِ استسقا (صحیح بخاری:1005)

15۔ نمازِ کسوف (صحیح بخاری:1041)

16۔ کسی نبی کو اُس جگہ دفن کرنا جہاں اُس کی وفات ہوئی ہو۔ (سنن ترمذی:1018)

17۔ مختلف قسم کے اموال پر زکوۃ کے نصابات (دیکھئے کتب حدیث)

18۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا۔ (صحیح ابن حبان:1802)

19۔ مریض کی عیادت کرنا۔ (صحیح بخاری:1240)

20۔ مردہ مچھلی کا حلال ہونا۔ (صحیح بخاری:4362)

21۔ جوتا پہنتے وقت پہلے دائیں پاؤں میں جوتا پہننا اور اُتارتے وقت پہلے بائیں پاؤں سے جوتا اُتارنا۔ (صحیح بخاری:5856)

22۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت دعا کرنا اور مسجد سے باہر نکلتے وقت دعا کرنا۔ (صحیح مسلم:713)

23۔ نومولود کو گھٹی دینا۔ (صحیح بخاری:5467)

24۔ حج مبرور کی جزا جنت ہے! (صحیح بخاری:1773)

25۔ وضو میں موزوں اور جرابوں پر مسح کرنا۔ (صحیح بخاری:205، سنن ابی داؤد:146)

یہ اور اس طرح کے سینکڑوں دینی اعمال و احکام ہیں جو صرف صحیح حدیث سے ثابت ہوتے ہیں اور ان کو دینی اعمال و احکام یا سنت سے خارج سمجھنا (جیسا کہ غامدی صاحب سمجھتے ہیں) اسلام سے ناواقفیت اور پرلے درجے کی حماقت ہے۔

البتہ یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ کسی حدیث کو صرف اسی صورت میں قبول کیا جائے گا جب وہ صحیح طور پر ثابت ہو۔ ضعیف اور موضوع قسم کی کسی حدیث سے دین کا کوئی حکم یا عمل ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

حدیث کی اہمیت اور حجیت ایک مسلمہ دینی امر ہے اور غامدی صاحب دین کے مسلمات ہی کے منکر ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے نزدیک نہ صرف منکر حدیث ہیں بلکہ منکر دین بھی ہیں۔ حدیث سے محرومی پورے دین سے محرومی ہے۔ دین ایک اکائی ہے اور اس کے کسی ایک جزو کا انکار اس کے کل کا انکار ہے۔ آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اسلام کے بعض عقائد و اعمال کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں آپ کو یا تو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کو تسلیم کرنا ہوگا یا سب کو ترک کرنا ہوگا۔ آدھا، پونا، تہائی اور دو تہائی اسلام ایک بے معنی چیز ہے۔ دین اسلام میں اگر آپ حدیث کو چھوڑ دیں گے تو آپ کو پورے دین اسلام سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور کوئی مسلمان بقائمی ہوش وحواس اپنے آپ کو دین سے محروم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔

غامدی صاحب کو سوچنا چاہیے کہ حدیث کے بارے میں وہ اپنا عجیب وغریب نظریہ

اختیار کرنے کے بعد کہاں کھڑے ہیں؟ دائرۂ اسلام کے اندر یا دائرۂ اسلام کے باہر؟ کیونکہ دائرۂ اسلام کے اندر تمام اہل اسلام، اسلام کے بیشتر عقائد اور اعمال و احکام حدیث ہی سے لیتے ہیں جبکہ غامدی صاحب حدیث سے کوئی عقیدہ یا عمل یا حکم لینے ہی کے منکر ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اپنی مشہور کتاب 'الفاروق' میں لکھتے ہیں کہ:

''اخبار آحاد کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو اصول تھا اس کی بنا صرف تحقیق حق تھی، اس زمانے کے آزاد خیالوں کی طرح نفس کی پیروی مقصود نہ تھی کہ جس حدیث کو چاہا صحیح مان لیا اور جس کو چاہا غلط کہہ دیا۔''

(الفاروق ص330، طبع لاہور)

قرآن میں کئی مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے کا حکم موجود ہے۔ جو حدیث کی پیروی کا دوسرا نام ہے:

1۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ (محمد: 33)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور ان (دونوں کی نافرمانی کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

2۔ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر: 7)

''رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اُس سے رُک جاؤ۔''

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان کو واجب الاطاعت قرار دیتی ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ ہر صحیح حدیث کو ماننا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

3۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا گیا کہ جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کر لی تو اُس

نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرلی۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: 80)

''جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرلے، اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرلی۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ چونکہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے اور اس میں اخبارِ متواترہ شامل نہیں۔

2۔ حدیث اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں اور حدیث کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

3۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔

4۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عمل اور حکم ثابت نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہماری رائے میں غامدی صاحب اپنے مذکورہ بالا نظریات رکھنے کی بنا پر منکر حدیث قرار پاتے ہیں اور ان کا شمار منکرین حدیث میں ہوجاتا ہے، کیونکہ حدیث کے بارے میں اُن کا نظریہ پوری امت مسلمہ کے تصورِ حدیث کے خلاف ہے۔

4۔ کیا سنت کا تعلق صرف عمل سے ہے؟

غامدی صاحب جن مختلف طریقوں سے حدیث کا انکار کرتے ہیں اُن میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ پہلے حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں اور حدیث کو سنت سے الگ کردیتے ہیں۔ پھر سنت کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط لگاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سنت کو چند اعمال (ستائیس 27 اعمال) میں محصور و محدود مانتے ہیں اور آخر میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین صرف قرآن کا اور سنت کے ان چند اعمال کا نام ہے۔ ان کے سوا اور کوئی چیز دین نہیں ہے۔ اس طرح وہ حدیث کو دین سے خارج کرکے منکرین حدیث کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں اور دین کا ایک نیا ایڈیشن تیار کرکے متجددین کے گروہ سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو

کرنے کی ہیں۔علم وعقیدہ، تاریخ، شانِ نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کے ساتھ دنیا میں جزا و سزا کا جو معاملہ کیا، قرآن میں اسے ''سنۃ اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔لہٰذا علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے۔اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں، اس دائرے سے باہر کی چیزیں اس میں کسی طرح شامل نہیں کی جاسکتیں۔''

(میزان،ص58،طبع سوم2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی،ص65،طبع دوم،فروری2005ء، لاہور)

اپنے اس اصول کی بنا پر غامدی صاحب نے سنت کے تمام اعمال کو جمع کیا ہے جن کی کل تعداد ستائیس (27) ہے اور پھر ان میں قرآن کو شامل کرکے وہ اپنے گھر کا دین مکمل کرلیتے ہیں۔اس طرح اُن کا کل دین صرف قرآن پر اور درج ذیل (27) اعمال پر، جن کو وہ سنت کہتے ہیں، مشتمل ہے۔ان کے علاوہ اور کسی چیز کو خواہ وہ صحیح حدیث یا کوئی اور سنت ہی کیوں نہ ہو، اُسے وہ دین کے طور پر نہیں مانتے۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ سے یہ دین (اسلام) آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

(1) قرآن مجید (2) سنت

(میزان،ص13،طبع سوم،مئی2008، لاہور)

اس کے بعد سنت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے

والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں آپ کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روایت بھی اُسی کا حصہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (النحل: 123)

''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا، وہ یہ ہے:

عبادات:

(1) نماز۔ (2) زکوٰۃ اور صدقہ فطر۔ (3) روزہ واعتکاف۔ (4) حج وعمرہ۔ (5) قربانی اور ایامِ تشریق کی تکبیر۔

معاشرت:

(1) نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔ (2) حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب۔

خورد ونوش:

(1) سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ (2) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم وآداب:

(1) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے موقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل

کے بال صاف کرنا۔ (8) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (9) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (13) غسلِ جنابت۔ (14) میت کا غسل۔ (15) تجہیز و تکفین۔ (16) تدفین۔ (17) عید الفطر۔ (18) عید الاضحیٰ۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔''

(میزان، ص 14، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

قرآن اور سنت کی یہ مخصوص تشریح کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

''دین لاریب، انہی دو صورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار و آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔''

(میزان، ص 15، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

1۔ کیا سنت صرف اعمال کا نام ہے؟

اب ہم غامدی صاحب کے اس تصورِ سنت پر تبصرہ کریں گے۔

جب غامدی صاحب صرف اعمال ہی کو سنت سمجھتے ہیں اور قرآن اور ستائیس (27) اعمال پر مشتمل سنت کے اس پیکیج ہی کو پورا دین قرار دیتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے بعد ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں صحیح احادیث کا انکار ہو جاتا ہے جن کو امت مسلمہ آج تک سنت اور دین کا حصہ سمجھ کر ان پر عمل کرتی رہی ہے کیونکہ امتِ مسلمہ کے نزدیک

سنت کی اصطلاح کا مفہوم درج ذیل ہے:

"فامّا السّنة فهی اقوال النبی ﷺ وافعاله وتقريراته وصفاته ."

(اصول الفقه الاسلامی، لدکتور وهبه زُهیلی ج1، ص 449)

''سنت نام ہے نبی ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات وتائیدات اور صفات کا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سنت کی اصطلاح کا مسلمہ مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جو نبی کریم ﷺ کے قول، فعل یا تقریر (خاموش تائید) یا صفات سے ثابت ہوں جیسے:

1: "إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات ." (صحیح بخاری: 1)

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

2: "اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَان ." (صحیح بخاری، : 24، صحیح مسلم، : 59)

''حیا ایمان کا حصہ ہے۔''

3: "اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ ." (سنن ابی داؤد، 4252، صحیح بخاری: 3535)

''میں خاتم النّبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

4: "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ ." (ابو داؤد: 2870)

''وارث کے لیے وصیت نہیں ہو سکتی۔''

5: "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ." (ابن ماجه : 224)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

6: "وَعُوْدُوا الْمَرِيْضَ ." (صحیح بخاری: 1240)

''اور مریض کی عیادت کرو۔''

7: "نُهِيْنَا اَنْ نُحِدَّ اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثٍ اِلَّا بِزَوْجٍ ." (صحیح بخاری: 1279)

''ہمیں تین دن سے زیادہ میت کا سوگ کرنے سے منع کیا گیا ہے سوائے شوہر کے سوگ کے۔''

8: "حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيْرِ وَالذَّهَبِ عَلٰى ذُكُوْرِ أُمَّتِيْ ."

(ترمذی: 1720، صحیح بخاری: 5833

"میری اُمت کے مردوں کے لیے ریشم اور سونا پہننا حرام کیا گیا ہے۔"

9: "لَا يَبِيْعُ اَحَدُكُمْ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ ." (صحیح بخاری: 2139، صحیح مسلم: 3454)

"کسی کے سودے پر سودا نہ کرو۔"

10: "لَا يَخْطِبْ عَلٰى خِطْبَةِ اَخِيْهِ ." (صحیح بخاری: 2139، صحیح مسلم: 3454)

"کسی کی منگنی پر منگنی نہ کرو۔"

11: "كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ، فَزُوْرُوْهَا ." (صحیح مسلم: 2260)

"میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔"

12: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ ." (ابوداؤد: 5128)

"جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔"

13: "لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ ."

(صحیح بخاری: 7158، صحیح مسلم: 4490)

"دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا غصے کی حالت میں ہرگز فیصلہ نہ کرے۔"

14: "إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ اَصَابَ فَلَهٗ اَجْرَانِ ."

(صحیح بخاری: 7352، صحیح مسلم: 4487)

"جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور درست اجتہاد کرے تو اس کے لیے دگنا اجر ہے۔"

15: "لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ ." (صحیح بخاری: 5671، صحیح مسلم: 6819)

"تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔"

16: "أُذْكُرُوْا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ ." (ابوداؤد حدیث: 4900، ترمذی: 1019)

"مردوں کی خوبیاں بیان کرو۔"

17: "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ." (صحیح بخاری: 893)

''تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کے ماتحت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

18: "اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ." (ترمذی: 1424)

''جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو حدود سے بچانے کی کوشش کرو۔''

19: "اَلْعَيْنُ حَقٌّ." (صحیح بخاری: 5740، صحیح مسلم: 5701)

''نظر لگ جاتی ہے۔''

20: "اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَاِنِّيْ حَرَّمْتُ الْمَدِيْنَةَ."

(صحیح مسلم: 3317، صحیح بخاری: 1867)

''بیشک ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو حرام قرار دیا اور میں نے مدینے کو حرام قرار دیا۔''

اس کے برخلاف غامدی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف اعمال کو سنت مانتے ہیں اور پھر سنت کو فقط ستائیس (27) اعمال میں محصور و محدود کر لیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں مذکورہ بالا جیسی مسلمہ ہزاروں قولی و فعلی سنتوں کا اور سینکڑوں مسنون دعاؤں کے سنت ہونے کا انکار کر کے وہ منکرین حدیث کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

2۔ سنت سے کیا مراد ہے؟

غامدی صاحب سنت کا اصطلاحی مفہوم بدلنے کے لیے اُس کی لغوی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کے ساتھ دنیا میں جزا و سزا کا جو معاملہ کیا، قرآن میں اسے ''سنۃ اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔'' (میزان، ص 58، طبع سوم 2008ء، لاہور)

اوّل تو اصول حدیث میں سنت کی اصطلاح کی لغوی بحث کرنا اور اسے دلیل بنانا ہی

بنیادی طور پر بے محل ہے۔لیکن غامدی صاحب نے اس کی جو نادر لغوی تحقیق فرمائی ہے اس کا جائزہ لینا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔

انہوں نے بغیر کسی معتبر لغت کا حوالہ دیے یہ دعویٰ کیا ہے کہ لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔حالانکہ یہ معنی عربی میں لفظ سنت کے نہیں بلکہ لفظ موّطا کے ہیں۔سنت کے اصل لغوی معنی طریقے اور حالت کے ہیں۔

عربی زبان کے نہایت مستند لغت ''لسان العرب'' میں سنت کے لفظ کی درج ذیل وضاحت کی گئی ہے:

"وقد تكرر في الحديث ذكر السُّنَّة وما تصرف منها، والأصل فيه الطريقة والسِّيرَة، واذا أُطْلقت في الشرع فإنما يراد بها ما أَمَرَ به النبيُّ ﷺ، وَنهى عنه ونَدَب اليه قولًا وفعلًا مما لم يَنْطق به الكتابُ العزيز، ولهذا يقال في أدلة الشرع: الكتابُ والسُّنَّةُ أَي القراٰن والحديث."

(لسان العرب از ابن منظور، تحت سنن جلد 13، ص 225)

''حدیث کے حوالے سے سنت اور اُس سے متعلقہ امور کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اصل میں اس (سنت) کے معنی طریقے اور حالت کے ہیں۔شرعی طور پر اس لفظ کا اطلاق ایسے امور پر ہوتا ہے جن کے بارے میں کتاب عزیز یعنی قرآن تو خاموش ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں قولی یا فعلی طور پر کوئی حکم دیا، یا جس سے منع فرمایا، یا جسے پسند فرمایا۔یہی وجہ ہے کہ مصادرِ شریعت کے لیے کتاب و سنت کے الفاظ بولے جاتے ہیں جن کا مطلب ہوتا ہے قرآن وحدیث۔''

اس سے معلوم ہوا کہ عربی لغت میں سنت کے معنی غامدی صاحب کے دعویٰ کے مطابق پٹے ہوئے راستے کے نہیں ہیں بلکہ طریقہ اور حالت کے ہیں۔

غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی بھی سنن (سنت کی جمع) سے مراد ضابطے اور قاعدے لیتے ہیں۔ "پٹے ہوئے راستے" مراد نہیں لیتے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیت 137 ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ "تم سے پہلے بہت سی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں پس تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا" کی تفسیر کرتے ہوئے لفظ سنن (سنت کی جمع) پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سنن سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برومند اور کامیاب کرتا ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام وقوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔" (تدبر قرآن، جلد 2، ص 178، طبع مئی 1983ء، لاہور)

اس سے واضح ہے کہ سنت کے لغوی معنی قاعدے طریقے اور ضابطے کے ہیں اور یہ قاعدے طریقے اور ضابطے اعمال کا نام نہیں ہے بلکہ اقوال اور علمی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ خود پٹا ہوا راستہ بھی کوئی عملی چیز نہیں ہوتا جسے غامدی صاحب سنت کو عمل ثابت کرنے کے لیے دلیل بنا رہے ہیں۔

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ سنت کے ذریعے بہت سے اسلامی عقائد اور ایمانیات ثابت ہوتے ہیں جیسے تقدیر پر ایمان لانا۔ قبر کا عذاب ہونا، ختم نبوت کا عقیدہ، آخرت میں نبی کریم ﷺ کی شفاعت کبریٰ، فرشتوں کا نور سے پیدا ہونا وغیرہ سب عقائد وایمانیات سنت ہی کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد صرف سنت پر ہے۔

اسی طرح کسی غیر مسلم کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کے لیے اُسے کلمہ طیبہ لا الہ الا

اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دلانا صرف اور صرف سنت ہی سے ثابت ہے اور یہ ایمانیات میں سے بھی ہے، اقوال میں سے بھی ہے اور یہ علمی نوعیت کی چیز بھی ہے۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ سنت کا تعلق صرف اعمال سے ہوتا ہے اور علمی نوعیت یا ایمانیات کی کوئی چیز اس سے مراد نہیں لی جا سکتی۔

5۔ کیا سنت کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر شرط ہے؟

سنت کا شرعی و اصطلاحی مفہوم چھوڑ کر غامدی صاحب پہلے تو اپنے جی سے اُس کا ایک نرالا مفہوم گھڑ لیتے ہیں اور پھر اس کے ثبوت کے لیے انوکھی شرطیں عائد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت کا ثبوت خبر واحد سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا ثبوت کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہوتا ہے، کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور اُن کے عملی تواتر سے، کبھی امت کے اجماع سے، کبھی امت کے اجماع سے اخذ کرکے اور کبھی امت کے اجماع سے قرار پا کر اور کبھی قرآن کے ذریعۂ ثبوت کے برابر ذریعۂ ثبوت سے۔

چنانچہ وہ اپنے اس موقف کو بیان کرتے ہوئے پہلے سنت کی تعریف لکھتے ہیں کہ:

1۔ ''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔''

(میزان، ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 10، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

قارئین کرام! سنت کی یہ تعریف دین کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں ہے اور اُمت مسلمہ کے اہل علم میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

2۔ پھر آگے چل کر ہم سنت کی وہ تعریف لکھیں گے جو اہل علم کے ہاں مسلم ہے۔ اس سنت کے ثبوت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار

سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔'' (میزان، ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی ص 11، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

3۔ اسی بات کو وہ دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں کہ:

''قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے اور جس طرح وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور قولی تواتر سے اُمت کو ملا ہے، اسی طرح یہ اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے۔'' (میزان، ص 60، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 67، طبع فروری 2005ء، لاہور)

4۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔'' (میزان، ص 60، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی، ص 67، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

5۔ ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں کہ:

''ثبوت کے اعتبار سے اس (سنت) میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح اُمت کے اجماع سے ثابت ہے، یہ بھی اسی طرح اُمت کے اجماع ہی سے اخذ کی جاتی ہے۔'' (میزان، ص 62، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 70، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

① سنت خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتی۔

② ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔

③ سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور یہ ہر دور میں اُمت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔

اب ہم ان نکات کا علمی جائزہ لیں گے۔

1۔ کیا سنت خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتی؟

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ سنت خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت نہیں ہوتی اس کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر شرط ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ سنت خبر واحد سے ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ آج تک امت کے معتمد اور ثقہ اہل علم میں سے کسی نے سنت کے ثبوت کے لیے تواتر کی شرط عائد نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ سنت کیا پورا دین خبر واحد سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین کی حدیث جبریل علیہ السلام خبر واحد ہے اور اس میں پورا دین بیان کیا گیا ہے جس کی تصدیق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

یہ حدیث جبریل علیہ السلام صحیح بخاری میں اس طرح روایت ہوئی ہے کہ:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ: مَا الْإِيمَانُ؟ قَالَ الْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَبِلِقَائِهِ وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ. قَالَ: مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ: الْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ. قَالَ: مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ. قَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ: مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَأُخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا: إِذَا وَلَدَتِ الْأَمَةُ رَبَّهَا وَإِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْإِبِلِ الْبُهْمُ فِي الْبُنْيَانِ، فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ ﴿إِنَّ

اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ الْآيَةَ ثُمَّ أَدْبَرَ . فَقَالَ: رُدُّوهُ، فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا . فَقَالَ: هٰذَا جِبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ .))

(صحیح بخاری: حدیث 50)

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ایک دن نبی کریم ﷺ لوگوں کے سامنے تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، فرشتوں پر، قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہونے پر، اللہ کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا یقین رکھو۔ اُس نے مزید سوال کیا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ پھر اُس نے عرض کیا: یارسول اللہ! احسان کیا ہے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس نے سوال کیا: یارسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: جس سے سوال کیا گیا ہے وہ بھی سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ البتہ میں تم کو قیامت کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں۔ جب لونڈی اپنا آقا جنے گی اور جب اونٹوں کے سیاہ فام چرواہے بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں گے۔ قیامت کا علم ان پانچ غیب کی باتوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ ﷺ نے آیت تلاوت فرمائی: ''قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی کو یہ خبر ہے کہ کس جگہ اس کو موت آنی ہے۔'' (لقمان:34) پھر وہ شخص پیٹھ پھیر کر چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے واپس بلاؤ۔'' مگر وہ

نہ ملا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو لوگوں کو اُن کا دین سکھانے آئے تھے۔''

صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث صحیح مسلم: 97 میں بھی موجود ہے

اس سے معلوم ہوا کہ پورا دین تو خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہوسکتا ہے مگر اس سے غامدی صاحب کی کوئی سنت ثابت نہیں ہوسکتی۔

پھر اسی خبر واحد (اخبار آحاد) سے ہمیں وہ کلمہ طیبہ نصیب ہوتا ہے جس کے پڑھنے کے بعد ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور جسے چھوڑ دینے سے ہم غیر مسلم قرار پاتے ہیں۔

اس کے علاوہ تمام علمائے اسلام کے نزدیک سینکڑوں سنن (سنتیں) اور اُن کے احکام ایسے ہیں جو خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ایک یہ ہیں:

1۔ وضو میں موزوں پر مسح کرنا (مسح علی الخفین)۔

2۔ شہید کی میّت کو نہ تو غسل دینا اور نہ اُسے کفن پہنانا۔

3۔ اذان کا طریقہ۔

4۔ نماز کی حالت میں قہقہے سے نماز اور وضو دونوں کا ٹوٹ جانا۔

5۔ عورت پر جمعہ کی نماز کا فرض نہ ہونا۔

6۔ مسلمان کی میت پر نماز جنازہ پڑھنا۔

7۔ ماں کی عدم موجودگی میں میت کی دادی کو وراثت میں سے چھٹا حصہ (4) دینا۔

8۔ وارث کے حق میں وصیت کا ناجائز ہونا۔

9۔ مرتد کے لیے قتل کی سزا (حد) ہونا۔

10۔ شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی سزا (حد) ہونا۔

11۔ مفتوح پارسیوں (مجوسیوں) سے جزیہ لینا۔

12۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد قریش کی حکمرانی کا حق ہونا۔

13۔ نبی کریم ﷺ کی جس جگہ وفات ہوئی آپ ﷺ کا وہیں مدفون ہونا۔

14۔ مردوں کے لیے ریشم اور سونے کا استعمال ممنوع ہونا۔

15۔ مدینہ منورہ کا حرم ہونا۔

16۔ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت مقاماتِ سجود پر سجدہ کرنا۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار شرعی احکام اور سنن ہیں جو خبر واحد سے ثابت ہیں۔

2۔ کیا قرآن اور سنت کے ثبوت میں کوئی فرق نہیں؟

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے قرآن اور سنت میں کوئی فرق نہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ دونوں کے ثبوت میں فرق ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید امت کے تواتر سے ثابت ہے جب کہ سنت کے لیے صحیح حدیث کا ہونا کافی ہے اور صحیح حدیث ایک یا دو ثقہ اور عادل راویوں سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

موطا امام مالک رحمہ اللہ میں ہے کہ ایک شخص کی وفات کے بعد اُس کی دادی سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنی میراث طلب کرنے کے لیے آئی تو آپ نے فرمایا:

((مَالَكِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ شَيْئٌ، وَمَا عَلِمْتُ لَكِ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ شَيْئًا، فَارْجِعِيْ حَتّٰى أَسْأَلَ النَّاسَ.)) (مؤطا امام مالک)

''تیرے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حق موجود نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تیرا کوئی حق مجھے معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا تم ابھی واپس چلی جاؤ تاکہ میں دوسرے لوگوں سے دریافت کرلوں۔''

اس کے بعد سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے دریافت فرمایا تو سیّدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اُن کی موجودگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میّت کی دادی کو چھٹا حصہ (4) دلایا تھا۔ اس پر سیّدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا کیا اُس وقت تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ اس کے بعد جب سیّدنا محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کی تائید کردی تو سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو میراث کا (4) چھٹا حصہ دلایا۔''

مذکورہ حدیث خبر واحد بھی ہے کہ اس کے صرف دو راوی ہیں لیکن اس سے نبی کریم ﷺ کی سنت ثابت ہوتی ہے جس پر خلیفہ اوّل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے سنت سمجھ کر اس پر عمل فرمایا اور آج تک اہل علم اس پر متفق ہیں کہ میت کے ترکے میں سے والدہ کی عدم موجودگی میں دادی کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور یہ سنت ثابتہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ سنت کا ثبوت خبر واحد (اخبار آحاد) سے ہو جاتا ہے اور اس کے لیے اجماع، تواتر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ قرآن کا ثبوت خبر واحد (اخبار آحاد) سے نہیں ہوتا اس کے لیے امت کا تواتر ضروری ہے۔

3۔ سنت کے بارے میں غامدی صاحب کی فکری تضاد بیانی:

سنت کے ثبوت کے حوالے سے غامدی صاحب کی مذکورہ ابتدائی چاروں تحریروں میں اُن کی ذہنی قلابازیاں اور فکری تضاد بیانیاں ملاحظہ ہوں کہ وہ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

1۔ سنت کا ثبوت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہوتا ہے۔

پھر دوسرے لمحے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں:

2۔ سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور اُن کے عملی تواتر سے ثابت ہوتی ہے۔

پھر تیسرے لمحے یہ فرمانے لگتے ہیں کہ:

3۔ سنت امت کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔

اور چوتھے لمحے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

4۔ سنت امت کے اجماع سے اخذ کی جاتی ہے۔

اب ان چاروں میں سے اُن کے کس موقف کو صحیح سمجھا جائے؟ جبکہ اجماع اور چیز ہے اور جسے تواتر کہا جاتا ہے وہ دوسری چیز ہے اور ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جسے غامدی صاحب ایک چیز قرار دے رہے ہیں۔ اگر سنت کے ثبوت کے لیے تواتر کی شرط عائد کر دی جائے تو پھر امت کو دین اسلام کے نوے (90) فی صد احکام و تعلیمات سے محروم ہونا پڑے گا کیونکہ وہ صرف اور صرف خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہیں۔ اب نوے 90

فی صد دین چھوڑ کر اُس کے صرف 10 فی صد کو لے کر غامدی صاحب کا گزارہ تو ہوسکتا ہے مگر امت مسلمہ اپنے دین کے نوے (90) فی صد حصے سے نہ تو دست بردار ہوسکتی ہے اور نہ اُس کے صرف دس فی صد حصے پر قناعت کرسکتی ہے۔

4۔ دینی اصطلاحات کے ساتھ مذاق کا روّیہ:

غامدی صاحب اپنی لفاظی کے ذریعے دوسروں کو مغالطہ اور فریب دینے کے عادی ہیں ہم اُن کے اس طریق واردات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ معروف دینی اصطلاحیں تو امت سے لیتے ہیں مگر ان کے مطالب و مفاہیم اپنے جی سے گھڑتے ہیں اس طرح وہ خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

زیر بحث موضوع کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی مذکورہ عبارات کے ذریعے دینی اصطلاحات کے بارے میں دوسروں کو کئی مغالطے اور فریب دینے کی سعی فرمائی ہے۔

اُنہوں نے سنت، حدیث، اجماع اور تواتر جیسی دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدل کر خلط مبحث پیدا کردیا ہے۔ سنت کی اصطلاح ہی کو لیجیے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ سنت سے مراد نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات (خاموش تائیدات) اور صفات ہیں۔

"اَمَّا السُّنَّةُ: فَهِيَ اَقْوَالُ النَّبِيِّ ﷺ وَاَفْعَالُهُ وَتَقْرِيرَاتُهُ وَصِفَاتُهُ."

(اصول الفقہ الاسلامی از الدکتور وہبہ زُہیلی، ج1، ص449 طبع دمشق)

لیکن غامدی صاحب سنت کی من مانی تعریف کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔"

(میزان، ص14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص10، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اسی طرح وہ حدیث کی معروف دینی اصطلاح کو محض اخبار آحاد میں محدود کرکے اُس

کو دین سے خارج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔''

(میزان، ص طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول ومبادی ص 68، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

اسی طرح وہ ایک اور مقام پر حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔''

(میزان ص 15، طبع سوم مئی 2008، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 11، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ امت کی معروف شرعی اصطلاحات کے معنی اپنے جی سے گھڑ کر خلقِ خدا کو گمراہ کریں۔

دینی اصطلاحات کے معنی بدلنے کے بارے میں خود غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

''منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی

ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔" (تدبر قرآن جلد اوّل، ص 29، مطبوعہ 1983ء، لاہور)

اب غامدی صاحب ذرا اپنے اُستاد صاحب کے اس آئینے میں دیکھ کر بتائیں کہ کیا وہ وہی حرکت نہیں کر رہے جو منکرین حدیث کیا کرتے ہیں؟ اگر اُن کے استاد و امام صاحب کے فتویٰ کے مطابق منکرین حدیث اس قصور پر کہ وہ قرآنی اصطلاحات کے مفہوم میں ترمیم و تغیر کرتے ہیں، منکرین قرآن ٹھہرتے ہیں تو کیا غامدی صاحب سنت اور حدیث کی اصطلاحات کے مفہوم میں تغیر و تبدل کرنے کے بعد منکر سنت اور منکر حدیث نہیں ٹھہرتے؟

ہم کہتے ہیں کہ امت کی معروف دینی اور شرعی اصطلاحات کے مفاہیم و مطالب کو بدلنا حماقت بھی ہے اور شرارت بھی، مغالطہ انگیزی بھی ہے فتنہ انگیزی بھی، فریب وہی بھی ہے خیانت کاری بھی، ڈھٹائی بھی ہے اور بے شرمی بھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شیخین کی اصطلاح موجود ہے اور علم حدیث میں امام بخاری اور امام مسلم کو شیخین کہا جاتا ہے (جبکہ فقہ حنفی میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کو شیخین کہا جاتا ہے) اب اگر کوئی شخص تاریخ اسلام کے شیخین کو علم حدیث کے شیخین قرار دے لے اور علم حدیث کے شیخین کو تاریخ اسلام کے شیخین ٹھہرائے تو ایسے آدمی کا کیا علاج؟ کیا پھر اُسے ٹی وی پر لوگوں کو دین سکھانے کے دھندے پر لگایا جائے یا کسی شفا خانہ امراضِ دماغی میں داخل کرایا جائے؟ اور پھر جب وہ اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کر دے کہ سیّدنا ابوبکر صدیق اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہما نے صحیحین مرتب کی تھی اور امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ مسلمانوں کے بالترتیب پہلے اور دوسرے خلیفہ ہو گزرے ہیں تو خدارا بتایئے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ؏

بسوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی ست

6۔کیا حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا؟:

غامدی صاحب نت نئے حربوں کے ذریعے حدیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔کبھی حدیث اور سنت میں تفریق پیدا کرتے ہیں۔کبھی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ اور حدیث دو الگ الگ اور مختلف چیزیں ہیں۔کبھی فرماتے ہیں حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ،عمل اور حکم ثابت نہیں ہوتا۔کبھی ارشاد ہوتا ہے سنت خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت نہیں ہوسکتی اس کے لیے تواتر شرط ہے۔اس طرح وہ مختلف حیلوں بہانوں سے حدیث کی اہمیت گھٹاتے اور اسے دین اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

ہم اُن کے ایک اور نرالے اصول حدیث کا علمی جائزہ لیں گے جس کو وہ فہم حدیث اور تدبر حدیث کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں مگر اس سے اُن کا اصل مقصد اور مدعا بھی انکارِ حدیث ہے۔اُن کا وہ نرالا اصول حدیث یہ ہے کہ:

''حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔''

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔دین میں قرآن کا جو مقام ہے وہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔نبی کریم ﷺ نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا،اس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔لہٰذا حدیث کے بیشتر مضامین کا تعلق اس سے وہی ہے جو کسی چیز کی فرع کا اُس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے۔اصل اور متن کو دیکھے بغیر اس کی شرح اور فرع کو سمجھنا ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔حدیث کو سمجھنے میں جو غلطیاں اب تک ہوئی ہیں،ان کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے۔عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل،عذابِ قبر اور شفاعت کی روایتیں،''اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ'' اور ''مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ'' جیسے احکام اسی لیے اُلجھنوں کا باعث

بن گئے کہ انہیں قرآن میں ان کی اصل سے متعلق کر کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حدیث کے فہم میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کی بیشتر اُلجھنیں بالکل صاف ہوجاتی ہیں۔" (میزان، ص 64، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 27، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث فہمی کے لیے ایک اصول یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا۔

2۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ حیثیت سے جو کام کیا اُس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ قرآن ہے۔

3۔ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذابِ قبر اور شفاعت کی روایتیں، اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ اور مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ جیسے احکام علمائے اسلام کے لیے اُلجھنوں کا باعث اس لیے بن گئے کہ انہوں نے فرع (حدیث) کو اصل (قرآن) سے متعلق کر کے سمجھنے کا "اصول حدیث" نہیں اپنایا تھا۔

4۔ حدیث کو سمجھنے میں اب تک بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔

اب ہم ان چاروں نکات پر تفصیلی جائزہ لیں گے۔

1۔ کیا حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا؟:

فہم حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا...... تو یہ ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس کا مقصد انکارِ حدیث کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ علمائے اسلام کے ہاں یہ اصول تفسیر تو مسلمہ ہے کہ قرآن کو حدیث کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ اس سے قرآن کے مجمل احکام کی وضاحت ملتی ہے مگر آج تک اہل

علم میں سے کسی نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا بھی کوئی اصول حدیث ہے اور یہ کہ قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں نماز کا حکم اس طرح دیا گیا ہے کہ:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (النور: 56)

''اور نماز قائم کرو۔''

قرآن کے اس مجمل حکم کو احادیث کی روشنی میں اس طرح سمجھا جائے گا کہ اس سے مراد دن رات میں پانچ مخصوص اوقات...... فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی فرض نمازیں مراد ہیں جن میں بالترتیب دو، چار، چار، تین اور چار فرض رکعات پڑھی جائیں گی اور ان نمازوں کے پڑھنے کا مسنون طریقہ ہے جو تکبیر تحریمہ سے لے کر قیام، رکوع، سجود، اور قعدہ اخیرہ کے بعد دائیں بائیں سلام پھیرنے تک کا ہے۔ اس طرح حدیث کی روشنی میں قرآن پاک کے مجمل حکم ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (اور نماز قائم کرو) کا اصل منشا اور صحیح مدعا سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں قرآن مجید میں حکم ہے کہ:

﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (النور: 56)

''اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

قرآن مجید کے اس مجمل حکم کو حدیث کی روشنی میں اس طرح سمجھا جائے گا کہ زکوٰۃ سے مراد وہ مخصوص مال ہے جسے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے مقررہ نصاب کے مطابق اُس کے مستحق لوگوں کے لیے نکالتا ہے۔ یہ زکوٰۃ سونے اور چاندی (نقدی)، مال تجارت، زرعی پیداوار اور مویشی وغیرہ پر دی جاتی ہے۔ سونے کا نصاب $7\frac{1}{2}$ تولے اور چاندی کا نصاب $52\frac{1}{2}$ تولے ہے۔ ان دونوں پر ڈھائی فی صد ($2\frac{1}{2}\%$) یعنی چالیسواں حصہ کے حساب سے سالانہ زکوٰۃ ادا ہوگی۔ نقدی اور مالِ تجارت کے لیے بھی یہی شرح ہے۔ زرعی پیداوار میں سے بعض پر عشر اور بعض پر نصف عشر ادا کیا جائے گا اور اس کے

لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ یہ فصل کٹنے پر فرض ہو جاتا ہے۔ مویشیوں میں سے اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری پر ان کی مختلف تعداد کے لحاظ سے نصاب کے مطابق سالانہ زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا احادیث کی ان تفصیلات کی روشنی میں قرآن کے اس مجمل حکم ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (اور زکوٰۃ ادا کرو) کو سمجھا جائے گا۔

اسی طرح قرآن مجید کے دوسرے احکامات کو احادیث کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

لیکن اگر غامدی صاحب کے بنائے ہوئے اس اصول حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے نتیجے میں نوے فی صد (90%) احادیث صحیحہ کا انکار کرنا پڑے گا کیونکہ وہ قرآن کی روشنی میں سمجھی نہیں جاسکتیں اس لیے کہ وہ قرآن میں موجود ہی نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر درج ذیل صحیح احادیث ایسی ہیں جن کو قرآن میں تلاش نہیں کیا جاسکتا مگر یہ ایسی ہیں جن کو علمائے اسلام چودہ سو برس سے مانتے آرہے ہیں اور امت مسلمہ ان پر عمل پیرا رہی ہے۔

1۔ مردوں کے لیے ریشم اور سونے کا حرام ہونا۔
2۔ پالتو گدھے کے گوشت کا حرام ہونا۔
3۔ کتے کا گوشت حرام ہونا۔
4۔ مرتد کے لیے قتل کی سزا ہونا۔
5۔ شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگ ساری) کی حد (سزا)۔
6۔ شراب، مردہ جانور اور بتوں کی تجارت کا حرام ہونا۔
7۔ عورت کے لیے خاص ایام میں نمازیں نہ پڑھنا اور بعد میں اُن کی قضا نہ کرنے کا حکم۔
8۔ حیض کی حالت میں بیوی سے بوس و کنار کی اجازت ہونا۔
9۔ شہید کی میّت کو غسل نہ دینا اور اُس کو کفن نہ پہنانا۔
10۔ قرآن پڑھنے کے دوران اُس کے بعض مقامات پر سجدۂ تلاوت کرنا۔
11۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا۔

12۔ مردہ مچھلی کا حلال ہونا۔
13۔ وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا۔ (مسح علی الخفین)
14۔ کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کا بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں ہونا حرام ہے۔
15۔ قاتل شخص کا مقتول کی وراثت سے محروم ہونا۔
16۔ وارث کے حق میں وصیت کا ناجائز ہونا۔
17۔ ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنے کی ممانعت۔
18۔ مسلمان اور کافر کا ایک دوسرے کے لیے وارث نہ ہونا۔
19۔ شراب نوشی پر سزا ہونا۔
20۔ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ کا حرم ہونا۔
21۔ ذمی (غیر مسلم اقلیت) کے حقوق۔
22۔ مریض کی عیادت کرنا۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار احادیث ہیں جن کو امت مانتی اور ان پر عمل کرتی ہے حالاں کہ ان کا ثبوت قرآن مجید سے نہیں ملتا۔

اب اگر غامدی صاحب کے بنائے ہوئے اصول حدیث کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ایسی بے شمار احادیث کا انکار کرنا پڑے گا کیونکہ جب کوئی شخص ان احادیث کو قرآن میں نہیں پا سکے گا تو لامحالہ وہ ان کا انکار کر کے منکر حدیث ہو جائے گا یا پھر غامدی صاحب کے اس گھڑے ہوئے مذکورہ اصول حدیث ہی پر لعنت بھیجے گا کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط واطاعت کا حکم دیا ہے۔ (النساء:59)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اور صحیح حدیث میں کبھی تضاد یا تناقض نہیں ہوتا کیونکہ دونوں کا سر چشمہ ایک ہی ہے اور وہ وحی الٰہی ہے۔ لہٰذا جو حدیث قرآن کے خلاف ہوگی وہ صحیح حدیث ہرگز نہیں ہو سکتی۔ البتہ موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ قرآن کے خلاف ہوتی ہے۔

اسی طرح غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا

یا متن اور اُس کی شرح کا تعلق ہے تو مذکورہ بالا احادیث کے احکام اگر فرع ہیں تو ان کی اصل کہاں ہے اور اگر وہ شرح ہیں تو اُن کا متن قرآن مجید میں کہاں موجود ہے؟ پھر اگر یہ دونوں چیزیں وہاں نہ مل سکیں اور یہ کبھی نہیں مل سکتیں تو کیا پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ غامدی صاحب کے بتائے ہوئے اصول حدیث کے مطابق ایسی تمام احادیث ناقابل اعتبار ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمیت پوری امت مسلمہ ان سب روایات کو مان کر چودہ سو برس سے گمراہی میں بھٹک رہی ہے؟ العیاذ باللہ!

2۔ کیا نبی کریم ﷺ کے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے؟:

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے کیونکہ:

1۔ یہ حقیقت اہل علم سے ہرگز پوشیدہ نہیں ہے کہ قرآن مجید بجائے خود کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ بنیادی طور پر ہدایت کی کتاب ہے اور اس میں تاریخی واقعات واحوال ضمنی طور پر آئے ہیں جن کا مقصد عبرت اور سبق آموزی ہے۔

یہ درست ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت کے کچھ پہلو اجمالی طور پر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں لیکن یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سارے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے اور جو نبوی کام قرآن میں نظر نہ آئے تو اس سے انکار کر دیا جائے کہ یہ آپ ﷺ کا پیغمبرانہ کام نہیں ہے۔

اگر غامدی صاحب کے اس دعوے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو امت مسلمہ کو نبی کریم ﷺ کی سیرت کے بہت سے واقعات کا انکار کرنا پڑے گا اور احادیث صحیحہ کے بہت بڑے ذخیرہ سے محروم ہونا پڑے گا۔

مثال کے طور پر درج ذیل پیغمبرانہ کاموں کی تاریخ قرآن مجید میں موجود نہیں ہے:

1۔ قرآن مجید کی نزولی ترتیب کے بعد موجودہ تلاوت کی ترتیب قائم کرنا۔

2۔ کاتبین وحی کے ذریعے قرآن مجید کی کتابت کرانا۔

3۔ وضو میں پاؤں دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کرنا۔

4۔ فرض نمازوں سے پہلے اذان اور اُس کا طریقہ۔

5۔ فرض نمازوں کی رکعات کا تعین۔

6۔ سری اور جہری نمازوں میں فرق کرنا۔

7۔ سجدہ سہو اور اُس کا طریقہ۔

8۔ حالت حیض میں بیوی سے بوس وکنار کی اجازت دینا۔

9۔ حج کے لیے میقات (مواقیت) کی تعین۔

10۔ میت کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم۔

11۔ دعا کے وقت ہاتھ اُٹھانا۔

12۔ درجنوں بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط بھیجنا اور اُن پر مہر ثبت کرنا۔

13۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت حبشہ کی اجازت دینا۔

14۔ نجاشی کا مسلمان ہونا اور اُس کی وفات پر آپ ﷺ کا اُس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا۔

15۔ رسول اللہ ﷺ کا 27 غزوات میں شرکت فرمانا۔

16۔ خطبہ حجۃ الوداع۔

تو کیا ان جیسے بے شمار پیغمبرانہ امور کا صرف اس لیے انکار کردیا جائے گا کہ ان کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ قرآن نہیں ہے اور یہ قرآن میں موجود نہیں ہیں اس لیے یہ سب غلط اور بے اصل ہیں۔ غامدی صاحب ہوش کے ناخن لیں وہ کیسے دعاوی کرتے ہیں۔

3۔ کیا عہد رسالت کے بعض احکام امت کے لیے اُلجھن کا باعث بن گئے؟:

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذابِ قبر، شفاعت کی روایتیں، "أُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ" اور "مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" جیسے احکام امت کے لیے اُلجھنیں بن گئیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام امور غامدی صاحب کی اپنی کھوپڑی کے لیے تو اُلجھنیں ہوسکتی ہیں مگر یہ سب چیزیں امت مسلمہ اور علمائے اسلام کے دل و دماغ میں کبھی اُلجھنیں نہیں رہیں بلکہ ہمیشہ بالکل واضح رہی ہیں اور اب ہم ان امور پر بھی تفصیلی بحث کریں گے جن کو غامدی صاحب اُلجھنیں قرار دیتے ہیں:

1۔ عہد نبوی میں شادی شدہ زانیوں پر رجم یعنی سنگساری کی حد جاری کی گئی اور غیر شادی شدہ زانیوں کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ بتایئے اس بارے میں کون سی اُلجھن ہے؟

2۔ یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ صحیحین کے علاوہ سیرت ابن ہشام میں بھی موجود ہے۔ اس شخص نے دوسری شرارتوں کے علاوہ نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی تدبیریں اور سازشیں کی تھیں جس کے نتیجے میں ایک صحابی سیّدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر اُسے قتل کر دیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے کہ:

''فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے شکایت کی اور آپ ﷺ کی مرضی سے سیّدنا محمدؓ بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بہ مشورہ رؤسائے اوس جا کر اُس (کعب بن اشرف) کو ربیع الاوّل 3ھ میں قتل کر دیا۔''

(سیرت النبی ﷺ، جلد اوّل، ص233، طبع لاہور)

مورخ اسلام اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے لکھا ہے کہ:

''جب کعب بن اشرف کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو ایک صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے اس شریر کے قتل کی اجازت لینے کے بعد کئی اور دوستوں کو ہمراہ لیا اور اس کے گھر جا کر اس کو قتل کیا۔''

(تاریخ اسلام از اکبر شاہ خاں، جلد اوّل، ص176، طبع لاہور)

بتایئے اس واقعے میں کیا اُلجھن ہے؟

3۔ عذابِ قبر کے بارے میں صحیح اور مستند احادیث موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مجرموں

کے لیے دوزخ کے قید خانے کی اصل سزا سے پہلے اُن کو عالم برزخ کی حوالات میں رکھنے کی حالت ہے۔ بتایئے اس میں کیا اُلجھن ہے؟ جبکہ خود قرآن مجید میں بھی عذابِ قبر کے بارے میں واضح اشارہ موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (المؤمن:46)

''ان لوگوں کو (عالم برزخ میں) صبح و شام دوزخ کی آگ کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالا جائے۔''

4۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آخرت میں مسلمان گناہ گاروں کے لیے نبی کریم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ قرآن مجید سے بھی اس شفاعت کے حق میں دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت ہو سکے گی جیسا کہ آیت الکرسی میں ہے کہ:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾ (البقرہ:255)

''ایسا کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے۔''

اس میں ﴿اِلَّا بِاِذْنِہٖ﴾ کا استثنا موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی جناب میں شفاعت ممکن ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِہٖ﴾ (یونس:3)

''اُس (اللہ) کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔''

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت ہو سکتی ہے اور احادیث صحیحہ کے مطابق نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ ہی کی اجازت سے اپنی امت کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔ بتایئے اس میں کیا اُلجھن ہے۔

5۔ حدیث ''اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ'' (مجھے حکم دیا گیا کہ میں (کافر) لوگوں سے

جنگ کروں) صحیحین میں موجود ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کفار کے خلاف جہاد و قتال کا حکم دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق آپ ﷺ نے کفار کے خلاف عملی طور پر جہاد و قتال کیا ہے اور یہ قرآن مجید کا حکم بھی ہے۔ بتایئے اس میں کیا اُلجھن ہے؟

6۔ "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ " (جو شخص اپنا دین بدل ڈالے تو اُسے قتل کردو) اور اسی مضمون کی چند اور صحیح احادیث میں بھی مرتد کی سزا کا قانون بیان ہوا ہے۔ اس قانون کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نافذ کیا ہے اور اس پر اُمت مسلمہ کا اجماع قطعی موجود ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ بتایئے اس میں کیا اُلجھن ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ غامدی صاحب منکر حدیث ہیں اور وہ اُلجھنوں کے نام سے بھی صحیح احادیث کی غلط تاویلیں کرتے اور اُن کا انکار کرتے ہیں اور یہ بھی اُن کا ایک طریق واردات ہے۔ جو وہ اپنی "میزان" نامی کتاب کے ذریعے ڈنڈی مار کر استعمال کرتے ہیں۔ ؎

عدل کا جس کے بہت چرچا سنا تھا ہم نے
اُس کے انصاف کے بھی کتنے ترازو نکلے

4۔ کیا حدیث کو سمجھنے میں اب تک غلطیاں ہوئی ہیں؟:

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ حدیث کو سمجھنے میں اب تک غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس کا مطلب بھی ظاہر ہے کہ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، خیر القرون کے سلف صالحین اور ان کے بعد صدیوں تک امت مسلمہ کے محدثین، فقہا اور مجتہدین بیچارے ساری عمر یہ حسرت اپنے دلوں میں لیے اسی انتظار میں دنیا سے رخصت ہو گئے کہ کب جاوید غامدی (اصل میں سکے زئی) پنجاب کے پیر کریاں نامی گاؤں (پاک پتن) میں جنم لیں اور پھر ان سب کو حدیث پر غور و تدبر کرنے کے صحیح اصول سکھائیں تاکہ حدیث کو سمجھنے میں کسی قسم کی غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کیا آج کوئی معقول آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ پوری امت مسلمہ تو آج تک حدیث کو

سمجھنے میں غلطیاں کرتی چلی آ رہی ہے اور وہ خود حدیث کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کی جیب میں ایسے اصول حدیث رکھے ہیں جو آسمان سے نازل ہوئے ہیں اور خود اس پر الہام ہوتا ہے جس میں کسی غلطی کا کوئی شائبہ تک نہیں؟ اس طرح کا دعویٰ کرنا علمیت کی نہیں جہالت کی دلیل ہے۔

اگر امت مسلمہ چودہ صدیوں سے حدیث کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی تو جناب غامدی کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ حدیث کو جو کچھ سمجھتے ہیں وہی حرفِ آخر ہے۔ کیا وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں؟ یا اُنہیں اپنے بارے میں معصوم عن الخطا ہونے کا زعم ہے؟

ان کی حدیث فہمی کا حال جاننے کے لیے ایک مثال ہی کافی ہے۔

صحیح احادیث کے مطابق شادی شدہ زانی کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے اور اسی پر اجماع امت ہے۔ مگر انہی احادیث کو جب غامدی صاحب اپنے خانہ ساز حدیث کے اصولوں کی روشنی میں سمجھتے ہیں تو ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں رجم یعنی سنگساری کی حد کسی شادی شدہ شخص کے جرم زنا کی سزا نہیں ہے بلکہ یہ بدمعاشی کی سزا ہے۔ حالاں کہ رجم سے متعلق احادیث صحیحہ سے ایسا نتیجہ نکالنا بجائے خود بدمعاشی ہے۔

اسی طرح کا سلوک وہ دوسری تمام احادیث سے کرتے ہیں اور ان کو دین سے خارج سمجھتے ہیں اور اُن سے ثابت شدہ کسی عقیدے، عمل اور حکم کو ضروری اور واجب الاطاعت تسلیم نہیں کرتے۔ کیا یہ انکارِ حدیث نہیں ہے؟

7۔ کیا حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص یا تحدید نہیں ہو سکتی؟:

غامدی صاحب کے انکارِ حدیث کا سلسلہ بہت طولانی ہے۔ وہ فہم حدیث کے لیے اپنے من گھڑت اصول رکھتے ہیں جن کا نتیجہ انکار حدیث کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ حدیث اور سنت کی مسلمہ اصطلاحات کا مفہوم بدلنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ حدیث کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے ثبوت کے لیے اپنی طرف سے اجماع اور تواتر کی شرائط عائد کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں

فرمایا تھا۔ حدیث وسنت کے بارے میں اُن کے ہاں بہت سے کھلے تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔

انکارِ حدیث کے حوالے سے وہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص وتحدید واقع ہونے کو بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا۔ دین میں ہر چیز کے ردّ وقبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔'' (میزان، ص 25، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول ومبادی، ص 24، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اپنے اس دعوے کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید وتخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید وتخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔'' (میزان، ص 35، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 36، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ دین میں ہر چیز کے ردّ وقبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا۔

2۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید وتخصیص نہیں ہوسکتی۔

3۔ اگر قرآن کے کسی حکم میں حدیث سے تحدید وتخصیص مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ اور مشکوک ہوجاتا ہے۔

اب ہم غامدی صاحب کے ان دعاوی کا علمی جائزہ لیں گے۔

1۔ کیا دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی آیات بینات کی روشنی میں ہوگا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن مجید ہی ان کے اس دعویٰ کی تردید کر دیتا ہے۔ وہ ہر معاملے کے فیصلے کے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں دین کے ہر معاملے کا فیصلہ قرآن اور حدیث وسنت کی روشنی میں کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾

(النساء: 59)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اُن کی جو تم میں سے اہل اختیار ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔''

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ اہل ایمان کے درمیان کسی بھی مسئلے کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے اللہ و رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے ہر معاملے میں ردّ و قبول کا فیصلہ قرآن اور حدیث وسنت کی روشنی میں ہوگا نہ کہ صرف قرآن کی روشنی میں۔

چنانچہ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ:

"فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ" کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔" (تدبر قرآن، جلد 2، ص 325، طبع 1983ء، لاہور)

پھر مولانا اصلاحی نے اس آیت کی مزید تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانون اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنت رسول ﷺ کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (پس اس کو اللہ و رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی تک کے لیے محدود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہی تھا اور آیت خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی سنت ہی ہے جو آپ ﷺ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔" (تدبر قرآن، جلد 2، ص 326، طبع 1983ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا، ایک بے اصل اور غلط دعویٰ ہے جو قرآن مجید کے بھی خلاف ہے، سنت کے بھی خلاف ہے، اجماعِ صحابہ و اجماعِ امت کے بھی خلاف ہے اور خود اُن کے اپنے استاد کے موقف کے بھی خلاف ہے۔

2۔ کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہو سکتی ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے بہت سے احکام کی تحدید اور تخصیص ہوئی ہے اور اہل علم کے ہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حدیث سے قرآنی حکم کی تحدید کی مثالیں:

حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے کئی احکام میں تحدید واقع ہوئی ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ الّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَ اهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡهِنَّ سَبِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا﴾ (النساء: 34)

''اور جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ، ان سے ہم بستری چھوڑ دو اور (اس پر نہ مانیں تو) انہیں مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام تراشی نہ کرو۔ بے شک اللہ سب سے برتر اور بہت بڑا ہے۔''

اس آیت کے الفاظ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (اور ان بیویوں کو مارو) مطلق تھے اور یہ مارنا ہر طرح کا مارنا اور زخمی کرنا ہو سکتا تھا لیکن حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم میں یہ تحدید (تقیید) ہو گئی ہے کہ صرف ایسی مار جائز ہے جو اتنی تکلیف دہ نہ ہو کہ اُس سے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((فَاضۡرِبُوۡهُنَّ ضَرۡبًا غَیۡرَ مُبَرِّحٍ .)) (صحیح مسلم: حدیث 2950)

''پس تم ان کو اتنا مار سکتے ہو جو ایسا تکلیف دہ نہ ہو کہ اس سے ان کے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید ہو سکتی ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ خود غامدی صاحب نے اپنے اسی مزعومہ اصول حدیث کے خلاف حدیث کے ذریعے قرآن کی مذکورہ آیت کے حکم وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (اور ان بیویوں کو مارو) کی تحدید مانی ہے کہ اس سے مراد صرف ایسی سزا ہے جو پائیدار اثر نہ چھوڑے۔ چنانچہ وہ اپنی

ڈنڈی مار کتاب ''میزان'' اور ''قانون معاشرت'' میں لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ نے اس کی حد غیر مبرح کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کہ پائیدار اثر چھوڑے۔''

(میزان، ص 423، طبع سوم 2008ء لاہور)

(قانونِ معاشرت، ص 30، طبع اوّل مئی 2005ء، لاہور)

دین کے بارے میں ایسے کھلے تضاد کا حامل ہونا صرف غامدی صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔ جو خود ایک اصول بناتے اور پھر خود ہی اسے توڑ ڈالتے ہیں۔

2۔ قرآنی حکم میں حدیث کے ذریعے تحدید کی دوسری مثال یہ ہے:

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ﴾ (البقرہ: 222)

''اور وہ آپ ﷺ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہیں وہ ایک گندگی ہے لہٰذا اس میں بیویوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ جاؤ۔''

اس آیت میں یہ حکم ہے کہ ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ (پس تم بیویوں سے اُن کے حیض کی حالت میں الگ رہو) یہ الگ رہنا ایک مطلق حکم ہے جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایسی حالت میں بیویوں سے الگ تھلگ رہو، اُن کو کسی الگ مقام پر رکھو، ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دو اور ان سے میل جول نہ رکھو۔

لیکن اس بارے میں صحیح احادیث سے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید ثابت ہے کہ ایسی حالت میں بیویوں سے صرف مباشرت منع ہے اس کے سوا سب کچھ جائز ہے۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تحدید ہوسکتی ہے خود غامدی صاحب حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید کو مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''انہی (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی حیض کی حالت میں ہوتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے قریب آنا چاہتے تو ہدایت کرتے کہ حیض کی جگہ پر تہ بند باندھ لے، پھر قریب آ جاتے۔'' (بخاری: حدیث 296)

(میزان، ص 433، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(قانون معاشرت، ص 43، طبع اول، مئی 2005ء لاہور)

اس طرح غامدی صاحب پہلے اپنا یہ اصول حدیث بتاتے ہیں کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید نہیں ہوسکتی اور پھر اپنے اس اصول کی خود ہی خلاف ورزی کرتے ہوئے حدیث کے ذریعے قرآن کے احکام کی تحدید ثابت کرنے لگتے ہیں۔

حدیث سے قرآنی احکام میں تخصیص کی مثالیں:

حدیث کے ذریعے کسی قرآنی حکم میں تخصیص کا واقع ہونا اہل علم کے نزدیک ایک ثابت شدہ اور مسلمہ امر ہے۔ جیسے

1۔ تخصیص کی پہلی مثال:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾

(النساء: 11)

''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ (وراثت میں) ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اولاد ہر حال میں اپنے والدین کے ترکے کی وارث ہوگی۔ بیٹے کو بیٹی سے دگنا حصہ ملے گا۔

لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ:

((لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا .)) (سنن ابی داود، کتاب الدیات، حدیث: 4564)

''قاتل وارث نہیں ہوسکتا۔''

اس لیے اگر کوئی بدبخت لڑکا اپنے باپ کو قتل کر دے گا تو مذکورہ حدیث کے حکم کے

مطابق وہ اپنے مقتول باپ کی میراث سے محروم ہو جائے گا۔

قرآن کا حکم عام تھا کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے ترکے کا وارث ہوگا مگر حدیث نے قاتل بیٹے کی تخصیص کردی کہ وہ اپنے باپ کے ترکے کا وارث نہیں ہوسکتا۔ یہی اسلامی شریعت ہے اور اہل علم کا اسی پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قاتل کو مقتول کی وراثت سے محروم کر دیا جائے گا۔

اس طرح حدیث نے قرآن کے ایک حکم عام میں گویا تخصیص کردی ہے۔

2۔ تخصیص کی دوسری مثال:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرہ: 275)

''اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

مذکورہ آیت ہر طرح کی تجارت کو حلال ٹھہراتی ہے کیونکہ اس میں عموم پایا جاتا ہے۔

لیکن صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ:

((اِنَّ اللّٰـهَ وَرَسُوْلَهٗ حَرَّمَا بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْاَصْنَامِ .)) (صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث:2236)

''بے شک اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے۔ اب اگر قرآن کے حکم کو دیکھا جائے تو ہر قسم کی تجارت حلال ہے کیونکہ قرآنی الفاظ میں عموم ہے۔ لیکن قرآن کے اس حکم عام میں حدیث کے ذریعے سے یہ تخصیص ہوئی ہے کہ شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے اور قرآن میں جس تجارت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اُس میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت شامل نہیں ہے۔

اب اگر غامدی صاحب کے بتائے ہوئے اس اصول حدیث کو مانا جائے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص نہیں ہوسکتی تو پھر مذکورہ صحیح حدیث کا انکار کرنا پڑے گا

اور اسلام میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت بھی حلال ماننی پڑے گی جو غامدی صاحب کی خودساختہ شریعت میں تو حلال ہوسکتی ہے مگر اسلامی شریعت میں حلال نہیں ہوسکتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص کو نہ ماننا محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔

3۔ کیا حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہونے سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہوجاتا ہے؟

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اگر حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص یا تحدید مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہوجاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآنی احکام میں تخصیص اور تحدید واقع ہونے سے قرآن مجید کا فرقان ہونا قطعاً مشتبہ نہیں ہوجاتا بلکہ اس سے قرآنی احکام کی وضاحت ہوجاتی ہے اور ان کا صحیح مدعا اور منشا معلوم ہوجاتا ہے جیسا کہ اُوپر کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کو میزان کہا گیا ہے تو یہ بالکل ایک غلط اور بے اصل بات ہے۔ قرآن نے اپنی صفت میزان کہیں بھی بیان نہیں فرمائی۔ امت کے معتمد اور ثقہ اہل علم میں سے کسی نے کبھی بھی میزان کو قرآن کی صفت قرار نہیں دیا۔

اسی طرح حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم میں تخصیص یا تحدید ہونے سے اُس کا فرقان ہونا بھی کسی طرح مشتبہ یا مشکوک قرار نہیں پاتا۔ فرقان بلاشبہ قرآن کا صفاتی نام ہے اور قرآن سے ثابت بھی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے احکام مجمل طور پر بیان ہوئے ہیں اور حدیث ان کی تفصیل اور تشریح کرتی ہے۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے بہت سے مجمل احکام کی وضاحت ہوتی ہے اور اس سے قرآن کا فرقان ہونا کسی طرح مشتبہ یا مشکوک نہیں ہوجاتا۔ یہ غامدی صاحب کا محض وہم ہے اور وہم کا کوئی علاج نہیں۔

پرویز صاحب اور غامدی صاحب میں مماثلت:

غامدی صاحب اور پرویز صاحب (مشہور منکر حدیث جس کے خلاف ایک ہزار علمائے پاکستان نے کفر کا فتویٰ دیا تھا) میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور ان دونوں میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے جیسے:

1۔ دونوں ہی کھانے کی صرف چار چیزوں کو شرعی طور پر حرام مانتے ہیں۔

2۔ دونوں ہی قرآن مجید کی معنوی تحریف کرتے ہیں۔

3۔ دونوں ہی حدیث کو دین کا حصہ نہیں مانتے۔ (مقام حدیث ص 7،8)

4۔ دونوں ہی حدیث کی حجیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

5۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ حدیث کی حفاظت اور اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔

6۔ دونوں ہی اجماع امت کو حجت نہیں مانتے۔

7۔ دونوں ہی قرآن مجید کی حدود اور سزاؤں کو آخری اور انتہائی سزائیں کہتے ہیں۔

8۔ دونوں ہی مرتد کی سزائے قتل کے منکر ہیں۔

9۔ دونوں ہی شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگساری) کی حد کو نہیں مانتے۔

10۔ دونوں ہی زکوٰۃ کی شرح اور نصاب کو حتمی تصور نہیں کرتے۔

11۔ دونوں ہی خود کفر کی زد سے بچنے کے لیے کسی کی تکفیر کے قائل نہیں۔

12۔ دونوں ہی عورت کے شرعی پردے کے منکر ہیں۔

13۔ دونوں ہی جہاد کے حکم کے منکر ہیں۔

14۔ دونوں ہی دینی اصطلاحات کے معنی بدلتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث بالخصوص پرویزی حلقے کے لوگ غامدی صاحب کو اپنا ہی بندہ قرار دیتے ہیں۔



باب نمبر 4:

عبادات

1۔ کیا تیمّم کا حکم پہلی امتوں میں بھی موجود تھا؟:

تیمّم کے لفظی معنی قصد وارادہ کرنے کے ہیں۔ شریعت میں تیمّم سے مراد ہاتھوں کو مٹی پر مار کر منہ اور ہاتھوں پر پھیرنا ہے۔

تیمّم کا ثبوت قرآن، حدیث وسنت اور اجماع امت تینوں سے لتا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ تیمّم کی اجازت صرف حضور ﷺ کی امت مسلمہ کے ساتھ خاص ہے۔ اس سے پہلے کسی امت کی شریعت میں تیمّم جائز نہ تھا۔

لیکن غامدی صاحب کے علم ونظر کا افلاس ملاحظہ ہو کہ وہ یہ باطل دعویٰ کرتے ہیں کہ نماز کی طرح تیمّم کا حکم بھی پہلے نبیوں اور ان کی تمام امتوں میں موجود تھا اور قرآن مجید نے صرف اس کی یاددہانی کرائی ہے۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں 'نماز کے شرائط' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''نماز کے لیے جن چیزوں کا اہتمام ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

نماز پڑھنے والا نشے میں نہ ہو۔

وہ اگر عورت ہے تو حیض ونفاس کی حالت میں نہ ہو۔

وہ باوضو ہو اور حیض ونفاس یا جنابت کے بعد اس نے غسل کر لیا ہو۔

سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں، یہ دونوں مشکل ہو جائیں تو وہ تیمّم کر لے

قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز کے لیے کھڑا ہو۔

نماز کے لیے یہ چیزیں ہمیشہ ضروری رہی ہیں۔ تاہم عرب کے لوگ چونکہ سیدنا

اسماعیل علیہ السلام کے بعد صدیوں تک انبیاء علیہم السلام کی ہدایت سے محرومی کے باعث اس طرح کے بعض معاملات میں متنبہ نہیں رہے تھے، اس لیے قرآن نے ان کی تذکیر کے لیے ان میں سے زیادہ تر چیزیں پوری وضاحت کے ساتھ خود بیان کر دی ہیں۔

(میزان، ص 282، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے خیال میں تیمّم کا حکم بھی پہلی امتوں میں موجود تھا لیکن ان کا یہ خیال بالکل غلط اور بے اصل ہے کیونکہ یہ حدیث وسنت اور اجماع امت کے خلاف ہے۔

صحیح بخاری میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُوْرًا، فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ، وَاُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ، وَاُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً)) (صحيح بخاری، رقم 335)

"مجھے پانچ (خصوصیات) ایسی عطا کی گئیں جن میں سے کوئی ایک بھی مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ دشمن پر رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی جب کہ ابھی وہ ایک مہینے کی مسافت پر ہو۔ میرے لیے ساری زمین مسجد اور پاکیزہ چیز حلال کیا گیا جب کہ مجھ سے پہلے وہ کسی کے لیے بھی حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا حق دیا گیا۔ ہر نبی کسی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا لیکن مجھے تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔"

اس کے علاوہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ: اُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَنُصِرْتُ

بِالرُّعْبِ، وَأُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ، وَجُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ طَهُوْرًا وَّ مَسْجِدًا، وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّةً، وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ))

(صحیح مسلم، رقم 1167)

''مجھے چھ چیزوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی: مجھے جوامع الکلم (مختصر مگر جامع کلمات) دیے گئے، رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی، میرے لیے مال غنیمت حلال ہوا، میرے لیے ساری زمین پاکیزہ چیز اور مسجد بنا دی گئی، مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور میرے بعد نبیوں کا آنا ختم کر دیا گیا۔''

ان احادیث کی بنا پر اس بات پر اجماع امت ہے کہ تیمّم کا حکم صرف امت مسلمہ کے ساتھ خاص ہے اور پہلی امتوں میں اس کی اجازت نہ تھی۔

اس بارے میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

((التیمم من خصائص الامة الاسلامیه شرع فی غزوة بنی المصطلق فی السنة السادسة من الهجرة))

(الدکتور وہبۃ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج 1، ص 407، طبع بیروت)

''تیمّم (کا حکم) امت مسلمہ کی خصوصیات میں سے ہے جو چھ (6) سال ہجری میں غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر مشروع ہوا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا یہ خیال ہرگز درست نہیں کہ تیمّم کی اجازت پہلے انبیائے کرام کی شریعتوں میں بھی تھی۔

2۔ کیا نماز غیر عربی زبان میں بھی جائز ہے؟

ہر مسلمان جانتا ہے کہ نماز عربی زبان میں پڑھی جاتی ہے۔ امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی اور یہ کہ نماز کے دوران میں کسی اور زبان میں بات چیت کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

لیکن غامدی صاحب یہ بے اصل دعویٰ کرتے ہیں کہ نماز کے اندر کی تسبیحات اور دعائیں غیر عربی زبان میں بھی ہو سکتی ہیں اور اس سے نماز نہیں ٹوٹتی۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں کہ:

''نماز کے لیے شریعت کے مقرر کردہ اذکار یہی ہیں۔ ان کی زبان عربی ہے اور نماز کے اعمال ہی کی طرح یہ بھی اجماع اور تواترِ عملی سے ثابت ہیں۔ ان کے علاوہ نماز پڑھنے والا جس زبان میں چاہے، تسبیح و تحمید اور دعا و مناجات کی نوعیت کا کوئی ذکر اپنی نماز میں کر سکتا ہے۔'' (میزان، ص 293، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

لیکن غامدی صاحب کا یہ دعویٰ غلط اور بے بنیاد ہے کہ نماز میں تسبیحات اور دعائیں غیر عربی زبان میں بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ نماز میں دعا صرف عربی زبان ہی میں مانگنے پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے۔

((يَكُوْنُ الدُّعَاءُ بِالْعَرَبِيَّةِ بِاِتِّفَاقِ الْفُقَهَاءِ))

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، الدکتور وھبۃ زحیلی، ج 1، ص 723 طبع دمشق)

''اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ نماز کے اندر ہر دعا عربی زبان میں مانگی جائے گی۔''

3۔ امام کی غلطی کی اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

اہل علم جانتے ہیں کہ امام کی غلطی پر اصلاح کے لیے 'سبحان اللہ' کہنا صرف مردوں کے ساتھ خاص ہے اور عورتوں کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر تالی جیسی آواز پیدا کریں گی۔

مگر غامدی صاحب چونکہ کسی بھی دینی معاملے میں ہیرا پھیری اور باطل تاویلیں کرنے سے باز نہیں آتے، اس لیے وہ ایسے موقع پر عورتوں کے لیے بھی 'سبحان اللہ' کہنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''امام غلطی کرے اور اس پر خود متنبہ نہ ہو تو مقتدی اسے متنبہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ 'سبحان اللہ' کہیں گے۔ عورتیں اپنی آواز بلند کرنا پسند نہ کریں تو نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر متنبہ کر دیں۔''

(میزان، ص 325، طبع مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب امام کی غلطی پر عورتوں کی طرف سے سبحان اللہ کہنے کو جائز سمجھتے ہیں جو اس حدیث کے بالکل خلاف ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے 'سبحان اللہ' کہنے کو صرف مردوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور عورتوں کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ ایسے موقع پر 'سبحان اللہ' کہیں بلکہ ان کے لیے دوسرا طریقہ ہے۔ وہ حدیث یہ ہے:

((اَلتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ))

(بخاری رقم 1203، ترمذی رقم 369، ابوداود رقم 939، نسائی رقم 1211)

''سبحان اللہ، کہنا مردوں کے لیے ہے اور عورتوں کے لیے تالی جیسی آواز پیدا کرنا ہے۔''

4۔ کیا عورت کی امامت جائز ہے؟

غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ نماز میں عورت بھی مردوں کی امامت کرا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ماہنامے 'اشراق' میں لکھتے ہیں کہ:

''عورت مردوں کی امامت کرا سکتی ہے۔'' (ماہنامہ اشراق، مئی 2005ء ص 35 تا 46)

لیکن عورت کا مردوں کی امامت کرنا بالاتفاق ناجائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبے کے دوران میں فرمایا:

((لَا تَؤُمَّنَّ امْرَأَةٌ رَجُلًا)) (ابن ماجه، رقم ١٠٨١)

''کوئی عورت کسی مرد کی امامت نہ کرائے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ عورت مردوں کی امامت کرا سکتی ہے، نہ صرف حدیث کے خلاف ہے بلکہ اجماعِ امت کے بھی خلاف ہے۔ البتہ عورت عورتوں کی امامت کرا سکتی ہے جیسا کہ ابوداؤد میں حدیث رقم 592 موجود ہے۔

5۔ رویت ہلال کا مسئلہ:

غامدی صاحب حدیث و سنت سے ثابت رویت ہلال کے شرعی حکم کو بھی نہیں مانتے۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ شریعت میں کسی قمری مہینے (رمضان یا شوال وغیرہ) کو شروع کرنے کے لیے چاند دیکھنے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے افق پر چاند کی پیدائش اور موجودگی ہی کافی ہے خواہ وہ نظر نہ بھی آ رہا ہو۔

چنانچہ وہ اپنے ماہنامے اشراق میں لکھتے ہیں کہ:

''مہینے کی تعین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا...... علم کی ترقی نے یہی صورت انتیس کے بارے میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اب ہم پوری قطعیت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے چاند کی پیدائش کب ہوگی...... گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع و غروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اسی طرح قمری مہینوں کی تعین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔'' (اشراق جنوری 2009ء، شذرات، ص3، لاہور)

لیکن ہم غامدی صاحب کی اس رائے کو صحیح احادیث اور اجماعِ امت کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ احادیث صحیحہ میں مسلمانوں کو رویت ہلال کا پابند کیا گیا ہے۔ قمری مہینہ 29 یا 30 دن کا ہو سکتا ہے اور 29 کو چاند دیکھ کر ہی رمضان کے آغاز یا عید الفطر ہونے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ فقہائے اسلام نے احادیث ہی کی بنیاد پر مہینے کی تعین کے لیے رویت ہلال یعنی چاند دیکھنے کو مناط یا علت قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قمری مہینے کے آغاز کا دار و مدار

چاند دیکھنے پر ہوتا ہے۔

مطلع صاف ہونے کی صورت میں اگر 29 شعبان کو چاند نظر آ جائے تو اگلے دن رمضان المبارک کا پہلا روزہ ہوگا۔ اگر 29 شعبان کو باوجود مطلع صاف ہونے کے چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے 30 دن پورے کیے جائیں گے۔ اسی طرح اگر 29 رمضان المبارک کو چاند دکھائی دے گا تو اگلے روز شوال کی پہلی تاریخ اور عید الفطر ہوگی اور اگر مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہیں آیا تو 30 روزے پورے کیے جائیں گے۔ اسی طرح 29 کو مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں چاند دکھائی نہ دینے سے بھی 30 دن پورے کرنے ہوں گے۔

رویت ہلال سے متعلق چند صحیح احادیث یہ ہیں:

1۔ ”إِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَصُوْمُوْا وَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَافْطِرُوْا ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهُ .“ (صحیح بخاری، حدیث 1900، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

(صحیح مسلم حدیث 2517، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

”جب چاند دیکھو تو روزہ رکھو، اور جب چاند دیکھ لو تو افطار کرو یعنی روزہ چھوڑ دو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن پورے کر لو۔“

2۔ ”صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهِ وَافْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهِ فَإِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَاكْمِلُوْا .“

(صحیح بخاری، حدیث: 1909، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، حدیث: 2499، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

”چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ختم کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔“

3۔ بخاری اور صحیح مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ ، وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ ، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهُ .“ (صحیح بخاری، حدیث: 1906) (صحیح مسلم: حدیث: 2498)

”جب تک نیا چاند نہ دیکھ لو، روزے رکھنا شروع نہ کرو اور نہ روزے رکھنا ختم کرو جب تک نیا چاند نہ دیکھ لو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن پورے کرو۔“

4۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ فَإِذَا رَءَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا، وَإِذَا رَءَيْتُمُوْهُ فَأَفْطِرُوْا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ." (صحیح مسلم، حدیث:2503)

''مہینہ انتیس دنوں کا بھی ہوتا ہے۔ پھر جب تم نیا چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو، اور جب تم چاند دیکھ لو تو روزے چھوڑ دو، لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو پھر تیس دن پورے کرو۔''

5۔ صحیح مسلم میں سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِذَا رَءَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا، وَإِذَا رَءَيْتُمُوْهُ فَأَفْطِرُوْا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَصُوْمُوْا ثَلَاثِيْنَ يَوْمًا." (صحیح مسلم:2514)

''جب تم نیا چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو، اور جب تم پھر نیا چاند دیکھو تو روزہ چھوڑ دو، پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن کے روزے پورے کرو۔''

صحیحین کی ان واضح صحیح احادیث کو جو شخص بھی کھلے ذہن کے ساتھ پڑھے گا اُسے یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ چاند دیکھ کر رمضان المبارک شروع کریں اور چاند دیکھ کر ہی عید الفطر منائیں۔ گویا رویت ہلال سنت سے ثابت شدہ حکم ہے اور اہل علم کا اسی پر اتفاق ہے۔

غامدی صاحب کا فکری تضاد اور ان کی ذہنی قلابازی ملاحظہ ہو کر وہ دوسری جگہ اپنی کتاب 'میزان' میں اعتراف کرتے ہیں کہ رمضان کی ابتدا ٹھیک چاند دیکھنے سے ہونی چاہیے اور اس کا اختتام بھی چاند دیکھنے ہی پر ہونا چاہیے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''روزے کا یہ قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے۔ اور قرآن مجید نے بھی بڑی حد تک اس کی تفصیل کر دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل سے اس کی جو توضیحات ہوئی ہیں، وہ ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

1۔ رمضان کی ابتدا بھی چاند دیکھنے سے ہونی چاہیے اور اس کا خاتمہ بھی اسی پر ہونا چاہیے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے، چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور اسے دیکھ کر افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کرلو۔'' (میزان، ص 369، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اب ہم غامدی صاحب کی اس نرالی منطق کا جائزہ لیتے ہیں جو وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

''گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع وغروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔'' (اشراق، جنوری 2009ء، ص 3، لاہور)

ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں گھڑی ایجاد ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس پورے عرصے میں آج تک اہل علم میں سے کسی نے غامدی صاحب کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اب چونکہ گھڑی ایجاد ہو چکی ہے لہٰذا نمازوں کے لیے سورج کے طلوع وغروب کو دیکھنا فضول اور بے کار ہے۔ یہ نرالا تخیل صرف غامدی صاحب جیسے متجدد اور منکر حدیث ہی کی کھوپڑی میں آیا ہے جو کسی اور کو آج تک نہیں سوجھا؟ اگر سوجھا ہے تو اس کا نام بتایا جائے۔

﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

غامدی صاحب گھڑی کی ایجاد کی خوشخبری سنا کر مسلمانوں کو سورج کے طلوع وغروب کے ذریعے وقت معلوم کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں لیکن اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

- دنیا میں ہر مسلمان نمازی گھڑی نہیں خرید سکتا۔
- وہ گھڑی سے وقت معلوم کرنا نہیں جانتا۔
- وہ ہر لحہ گھڑی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔
- اُسے کہیں ایسی گھڑی نہیں مل سکتی جو کبھی نہ رکتی ہو، آگے پیچھے نہ ہو جاتی ہو، خراب نہ ہوتی ہو، اس کے سیل (Cell) ہمیشہ چلنے والے ہوں اور جو یہ بتائے کہ میں صبح کے 4 بجا رہی ہوں یا شام کے۔ صبح وشام کا تعین بہر حال سورج ہی کے طلوع وغروب کا مرہونِ منت ہے۔

ممکن ہے آیندہ غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کردیں بلکہ فتویٰ دے دیں کہ چونکہ ٹیپ ریکارڈر ایجاد ہو چکا ہے لہٰذا اب مؤذن ہر نماز کے لیے اذان کہنے کا پابند نہیں رہا۔ وہ بس بٹن دبا کر اذان والی کیسٹ چلا دیا کرے کیونکہ اس سے بھی اذان کا مقصد تو بہر حال پورا ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سائنسی ایجادات سے دینی احکام پر عمل کرنے کے لیے مدد تو لی جاسکتی ہے مگر ان کے ذریعے سرے سے دینی احکام کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ رویت ہلال کے لیے دوربین (Telescope) وغیرہ سے مدد لی جاسکتی ہے مگر کسی رصدگاہ (Observatory) کی معلومات کے ذریعے رویت ہلال کا شرعی تقاضا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں سعودی عرب کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے جس سے فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے۔

الغرض ہماری رائے میں حدیث وسنت سے ثابت رویت ہلال (چاند دیکھنے) کے شرعی حکم کا انکار کرنے کے بعد غامدی صاحب منکر حدیث قرار پاتے ہیں۔

6۔ زکوٰۃ کا نصاب اور اس سے استثنیٰ (Exception):

غامدی صاحب 'ریاست' (ضروری نہیں کہ وہ اسلامی ہو) کو یہ اختیار دینے کے قائل ہیں کہ وہ صاحب نصاب مسلمانوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر سکتی ہے اور 'حالات کی رعایت' سے زکوٰۃ کا سارا نصاب بدل سکتی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔" (میزان، ص 353 طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا مذکورہ دعویٰ خلاف اسلام ہے۔ اسلامی ریاست کسی حال میں بھی صاحب نصاب مسلمانوں کو نہ تو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے اور نہ زکوٰۃ کے شرعی نصابات میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کی مجاز ہے۔ کیونکہ صاحب حیثیت

مسلمانوں سے شرعی نصاب کے مطابق زکوٰۃ کی وصولی ایسے منصوص احکام ہیں جن کو بدلنے کا اختیار کسی فرد یا ادارے کو حاصل نہیں۔

اگر اسلامی ریاست کو یہ اختیار حاصل ہوتا کہ وہ صاحب نصاب مسلمانوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر سکتی ہوتی تو خلیفہ اول سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی مانعین زکوٰۃ کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے دیتے اور ان کے خلاف جہاد نہ کرتے تاکہ جنگ سے بچا جا سکے لیکن انہوں نے اس موقع پر یہ اعلان فرمایا تھا کہ:

((وَاللّٰهِ لَأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ، فَإِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ الْمَالِ، وَاللّٰهِ لَوْ مَنَعُوْنِي عِقَالًا كَانُوْا يُؤَدُّوْنَهُ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلٰى مَنْعِهِ)) (صحیح بخاری، رقم 7285)

”اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ کے درمیان تفریق کر دی، حالانکہ زکوٰۃ اللہ کا حق ہے۔ اللہ کی قسم! اگر ان لوگوں نے مجھ سے اونٹ کی ایک رسی بھی، جسے وہ نبی ﷺ کو دیا کرتے تھے، روکی تو میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔“

لیکن سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بصیرت دیکھ رہی تھی کہ اگر آج ان کو زکوٰۃ سے استثنیٰ دے دیا جائے تو کل یہ لوگ دین کے دوسرے احکام میں بھی استثنیٰ مانگنا شروع کر دیں گے تو اس کے نتیجے میں نہ ریاست اسلامی رہے گی اور نہ معاشرہ اسلامی رہے گا۔

7۔ زکوٰۃ کے ایک مصرف 'اَلْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' سے کیا مراد ہے؟

اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی سورۃ التوبہ آیت 60 میں زکوٰۃ کے جن آٹھ مصارف کا ذکر ہے ان میں سے ایک 'وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' یعنی عاملین زکوٰۃ کی مد بھی ہے اور اس پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ (صدقات) وصول کرنے، وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے، ان کا حساب کتاب رکھنے اور ان کو تقسیم کرنے کے کام پر مقرر کیے جائیں۔ ایسے لوگوں کی تنخواہ زکوٰۃ (صدقات) کی مد سے دی جا سکتی ہے

خواہ وہ محتاج نہ بھی ہوں۔

اس کے برعکس غامدی صاحب اس سے ریاست کے ہر قسم کے سرکاری ملازمین مراد لیتے ہیں جو کہ اجماع امت کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''العاملین علیھا' یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے ہیں۔'' (میزان، ص 351، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

پھر اس کے حاشیے میں اپنی بات کی تاویل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس لیے کہ ریاست کے تمام ملازمین درحقیقت 'العاملین علی اخذ الضرائب وردھا الی المصارف' ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہایت بلیغ تعبیر ہے جو قرآن نے اس مدعا کو ادا کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگ بالعموم اسے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، لیکن اس کی جو تالیف ہم نے بیان کی ہے، اس کے لحاظ سے دیکھیے تو اس کا یہ مفہوم بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے۔'' (میزان، ص 351 حاشیہ، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

ہمارے نزدیک غامدی صاحب کی مذکورہ بالا غلط، باطل اور بے اصل ہے کیونکہ عربیت سے واقف ہر شخص جان سکتا ہے کہ 'العاملین علیھا' میں 'ھا' کی ضمیر 'الصدقات' کی طرف لوٹتی ہے جس کا صاف سیدھا یہ مطلب ہے کہ اس سے صدقات یعنی زکوٰۃ پر مامور لوگ مراد ہیں۔ سرکاری ملازمین کا یہاں سرے سے نہ ذکر ہے اور نہ موقع کہ اس 'ھا' سے ریاست مراد لی جائے۔

لغت کے مشہور امام علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر 'الکشاف' میں لکھا ہے کہ اس سے مراد ہیں: 'السعاۃ الذین یقبضونھا' یعنی وہ عملہ جو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر ہو۔

اسی طرح فقہ اسلامی کی مشہور و مستند کتاب 'الفقہ الاسلامی وادلتہ' میں اس سے مراد یہ لی گئی ہے کہ:

'ھم السعاۃ لجبایۃ الصدقۃ'

(الدکتور وھبۃ زحیلی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج 2، ص 780 طبع دمشق)

یعنی وہ عملہ جو صدقے (زکوٰۃ) کی وصولی کے کام پر مامور ہو۔

غامدی صاحب کے موقف کے خلاف خود ان کے 'استاد امام' مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا، سے مراد وہ لوگ ہیں جو صدقات کی وصولی اور ان کے حساب کتاب پر حکومت کی طرف سے مامور ہوں۔ ان کی تنخواہیں اور ان کے دفاتر کے مصارف بھی اس مد سے ادا ہوں گے۔" (تدبر قرآن، ج3، ص591، طبع 1983ء لاہور)

الغرض غامدی صاحب نے 'وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا' سے حکومت کے تمام ملازمین مراد لے کر قرآنی الفاظ کی ایسی من مانی تفسیر فرمائی ہے جو عربیت کے بھی خلاف ہے، اجماع امت کے بھی خلاف ہے اور خود ان کے اپنے استاد مولانا اصلاحی کی رائے کے بھی خلاف ہے مگر اس کے باوجود ان کا ادعا یہ ہے کہ پوری امت قرآن کے ان الفاظ کے معنی سمجھنے سے بالکل قاصر رہی ہے اور چودہ صدیوں کے بعد پہلی بار اصل حقیقت صرف ان پر منکشف ہوئی ہے۔

8۔ مصنوعات (صنعتی پیداوار) پر زکوٰۃ کا طریقہ

غامدی صاحب کارخانوں کی مصنوعات کو اموال تجارت نہیں سمجھتے بلکہ ان کو زرعی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ صنعتی اشیاء پر زکوٰۃ کی بجائے عشر لاگو کرتے ہیں۔

لیکن ان کا یہ اجتہاد ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ کارخانوں کی بنی ہوئی چیزوں کو زرعی پیداوار پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے جو بالبداہت باطل اور غلط ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جو کچھ صنعتیں اس زمانے میں وجود میں لاتیں اور اہل فن اپنے فن کے ذریعے سے پیدا کرتے اور جو کچھ کرایے، فیس اور معاوضہ خدمات کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، وہ بھی اگر مناطِ حکم کی رعایت ملحوظ رہے تو پیداوار ہی ہے۔ اس وجہ سے اس کا الحاق اموال تجارت کے بجائے مزروعات سے ہونا چاہیے اور اس معاملے میں وہی ضابطہ اختیار کرنا چاہیے جو شریعت نے زمین کی پیداوار کے لیے متعین کیا ہے۔" (میزان، ص353، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

کارخانوں کی بنائی ہوئی اشیاء شرعی لحاظ سے، عرفی حیثیت سے اور عقلی طور پر اموال تجارت ہیں۔ ان کو زرعی پیداوار سمجھنا کم علمی اور جہالت ہے کیونکہ:

1۔ زرعی پیداوار زمین سے اگتی ہیں اور مصنوعات زمین سے نہیں اگتیں بلکہ کارخانوں میں بنائیں جاتی ہیں۔

2۔ صنعتی اشیاء تیار کرنا (Manufacturing) سراسر انسان کا کسب ہے، مگر زرعی پیداوار میں انسان کا کسب بہت کم اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ فصل کا اگانا، موسم کی سازگاری اور بارش برسانا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے ممکن ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں زکوٰۃ کی شرح بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔

3۔ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ (عشر) کے لیے 'حولانِ حول' یعنی ایک سال گزرنے کی کوئی شرط نہیں ہے جب کہ دوسرے اموال زکوٰۃ کے لیے ایک سال گزرنے کی شرط ہے۔

4۔ مزروعات یعنی زرعی پیداوار عموماً زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رہتی جیسے کھجور۔ مصنوعات طویل عرصے تک کارآمد ہوتی ہیں، جیسے موٹر کار۔

5۔ عقل اور عرف میں بھی زرعی پیداوار اور کارخانوں میں بنی ہوئی اشیاء کو ایک جیسا نہیں سمجھا جاتا۔

6۔ موجودہ دور کے علماء وفقہاء بھی صنعتی پیداوار کو بالاتفاق مالِ تجارت قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا ان دونوں کا یکساں مناط حکم سمجھ کر ان کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا علم ونظر کا افلاس ہے۔

پھر جہاں تک کرائے، فیس اور معاوضے کا تعلق ہے تو یہ آمدنیاں ہیں اور اسلامی شریعت میں زکوٰۃ آمدنی پر نہیں بلکہ سالانہ بچت پر ہوتی ہے۔

9۔ طواف وداع کی شرعی حیثیت

غامدی صاحب کے ہاں طواف وداع بھی واجب نہیں ہے۔ وہ طواف افاضہ (یا طواف

زیارت) کے سوا باقی کسی طواف کو واجب اور ضروری نہیں سمجھتے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں:

"حج کا طواف تو ایک ہی ہے جسے اصطلاح میں طواف افاضہ کہا جاتا ہے، لیکن حج وعمرہ سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کے لیے رخصت ہونے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کی ہے کہ جاتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر کے جائیں۔"

(میزان، ص396، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

حالانکہ جمہور علماء وفقہاء کے نزدیک طوافِ وداع واجب اور ضروری ہے طوافِ وداع سے مراد وہ الوداعی طواف ہے جسے حاجی مکہ مکرمہ سے واپسی کے وقت کرتا ہے۔ یہ طواف چونکہ واجب ہے اس لیے اگر کوئی شخص یہ طواف نہیں کرے گا تو اسے دم دینا پڑے گا یعنی اس کے ذمے ایک جانور کی قربانی ضروری ہے۔

طوافِ وداع کے اس حکم کی بنیاد وہ صحیح حدیث ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَنْفِرَنَّ اَحَدٌ حَتّٰى يَكُوْنَ آخِرُ عَهْدِهِ الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ))

(صحیح مسلم، رقم3219۔ ابوداود، رقم2002، ابن ماجہ رقم3070)

"کوئی شخص اس وقت تک واپس نہ لوٹے جب تک وہ آخری مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف نہ کر لے۔"



باب 5:

معاشرت

1۔ کیا بیواؤں کے حق میں ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کا حکم منسوخ نہیں ہے؟

تمام مفسرین کے برعکس غامدی صاحب قرآن مجید کی سورۂ البقرہ آیت 240 کے اس حکم کو منسوخ نہیں مانتے جس میں شوہروں کو ان کی بیواؤں کے حق میں ایک سال تک نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں رہائش کی وصیت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''شوہروں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ وہ اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی وصیت کر جائیں، الا یہ کہ وہ خود اپنی مرضی سے شوہر کا گھر چھوڑ دیں یا اس نوعیت کا کوئی دوسرا قدم اٹھا لیں:

﴿وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ یَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ﴾ (البقرۃ: 240)

''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں تو وہ اپنی ان بیویوں کے لیے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جائیں اور یہ بھی کہ انہیں گھر سے نہ نکالا جائے۔ پھر اگر وہ خود گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ اپنے معاملے میں دستور کے مطابق کریں، اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اللہ عزیز وحکیم ہے۔'' (میزان، ص 462، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

مذکورہ آیت کا حوالہ دینے کے بعد مزید وضاحت کے طور پر حاشیے میں لکھتے ہیں کہ:

''عام طور پر لوگ اس حکم کو سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کی آیات سے منسوخ مانتے ہیں، لیکن صاف واضح ہے کہ عورت کو نان ونفقہ اور سکونت فراہم کرنے کی جو ذمہ داری شوہر پر اس کی زندگی میں عائد ہوتی ہے، یہ اسی کی توسیع ہے۔ عدت کی پابندی وہ شوہر ہی کے لیے قبول کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی اسے کچھ مہلت لازماً ملنی چاہیے۔ یہ حکم ان مصلحتوں کے پیش نظر دیا گیا ہے، تقسیم وراثت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

(میزان ص 462، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

تمام مفسرین اور فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ بالا آیت کا حکم عارضی تھا جو سورۂ البقرہ ہی کی آیت درج ذیل سے مستقل طور پر منسوخ ہو گیا ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ (البقرة: 234)

''اور تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار مہینے دس دن کی عدت گذارنی چاہیے۔''

اس طرح بیوہ کی عدت مقرر ہو جانے کے بعد پھر جب سورۂ النساء میں وراثت کے احکام بھی نازل ہو گئے اور بیواؤں کے لیے ان کے شوہروں کی میراث میں سے حصہ مقرر کر دیا گیا تو ان کے حق میں ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کا پہلا حکم باقی نہ رہا۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ بیوہ عورت کے بارے میں ان کی مذکورہ رائے نہ صرف اجماع امت کے خلاف ہے بلکہ خود ان کے 'استاد امام' مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے کے بھی خلاف ہے۔

چنانچہ وہ اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں لکھتے ہیں کہ:

1۔ ''اوپر آیت 234 میں بیوہ عورتوں کی عدت بیان ہوئی ہے، انہی سے متعلق بعد میں یہ

مزید ہدایت اوپر والی آیت ہی کی توضیح مزید کے طور پر نازل ہوئی کہ بیوائیں چھوڑ جانے والے شوہر اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی اجازت کی وصیت کر جائیں۔ اگر اس دوران میں بیوہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑے اور اپنے نکاح ثانی یا اپنی سکونت کے سلسلہ میں دستور کے مطابق کوئی قدم اٹھائے تو اس کا اس کو حق حاصل ہے۔ میت کے ورثا کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ وصیت کی خلاف ورزی کریں۔''

اس وصیت کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون ابھی نازل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اسی باب کے شروع میں (آیت 180) والدین اور قرابت داروں کے لیے بھی وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے اور ہم وہاں بیان کر چکے ہیں کہ یہ حکم عارضی طور پر اس وقت تک کے لیے دیا گیا تھا جب تک سورۂ نساء والا قانون وراثت نازل نہیں ہوا تھا۔ اسی قانون کے تحت بیوگان سے متعلق بھی یہ ہدایت ہوئی کہ ان کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور سکونت کی وصیت کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہو گیا اور مورث کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ یا بیوگان کا حصہ بھی شریعت میں معین ہو گیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت کی مذکورہ ہدایت منسوخ ہو گئی، بیوگان کے لیے بھی یہ منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی۔ (تدبر قرآن ج1، ص555، 556، طبع مئی 1983ء لاہور)

2۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الفوز الکبیر میں سورۂ البقرہ کی آیت 240 کے مذکورہ حکم کو منسوخ مانا ہے جس میں بیوہ کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کا ذکر ہے۔

3۔ تفسیر کشاف میں علامہ زمخشری سورۂ البقرہ آیت 240 کے تحت لکھتے ہیں کہ:

((وَكَانَ ذٰلِكَ فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ، ثُمَّ نُسِخَتِ الْمُدَّةُ بِقَوْلِهٖ: اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا)) (الکشاف، ج1، ص377، طبع 1972ء مصر)

''یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر یہ مدت منسوخ کر دی گئی اس آیت کے حکم سے جس میں بیوہ کی عدت 'چار ماہ دس دن' مذکور ہے۔''

4۔ تفسیر ابن کثیر میں مذکورہ آیت کے بارے میں ہے کہ:

((قَالَ الْاَکْثَرُوْنَ هٰذِهِ الْاٰیَةُ مَنْسُوْخَةٌ بِالَّتِیْ قَبْلَهَا وَهِیَ قَوْلُهٗ: یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا))

(تفسیر القرآن العظیم، ج1، ص296، طبع بیروت)

''اکثر مفسرین کا قول ہے کہ مذکورہ آیت اپنے سے پہلی آیت سے منسوخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بیوائیں چار مہینے دس دن کی عدت گزاریں۔''

5۔ تفسیر روح المعانی میں اس بارے میں ہے کہ:

((وکان ذلك علی الصحیح فی اول الاسلام ثم نسخت المدة بقوله تعالی: اربعة اشهر وعشرا))

(علامہ محمود آلوسی، تفسیر روح المعانی، ج2، ص240، طبع بیروت)

''صحیح قول یہ ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر یہ ایک سالہ مدت دوسری چار ماہ دس دنوں کی عدت سے منسوخ ہوگئی۔''

6۔ امام شوکانی اپنی تفسیر 'فتح القدیر' میں اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

((ذهب الجمهور الی انها منسوخة بالاربعة الاشهر والعشر کما تقدم، وان الوصیة المذکوره فیها منسوخة بما فرض الله لهن من المیراث)) (فتح القدیر، ص199، طبع 2001ء ریاض)

''جمہور مفسرین کے نزدیک یہ پہلی آیت سے منسوخ ہے جس میں چار ماہ دس دن کا ذکر ہے اور وصیت کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے وراثت میں حصہ مقرر ہونے کے بعد منسوخ ہوگیا۔''

7۔ تفسیر قرطبی میں قاضی عیاض کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

((والا جماع منعقد علی ان الحول منسوخ وانَّ عِدَّتها اربعةُ اشهرٍ وعشرٌ .)) (امام قرطبی، الجامع لاحکام، ج 2، ص 226)

''اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ ایک سال کی مدت منسوخ ہے اور یہ کہ بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔''

8۔ علامہ طبرسی (شیعہ) اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء ان هذه الاٰية منسوخةٌ .))

(مجمع البیان فی تفسیر البیان فی تفسیر القرآن، ج 1، ص 345)

''علماء اس پر متفق ہیں کہ اس آیت (البقرہ 240) کا حکم منسوخ ہے۔''

آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ غامدی صاحب نے سورۃ البقرہ کی آیت 240 کے حکم کو منسوخ نہ ماننے کے حق میں جو دو دلیلیں پیش کی ہیں ان کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں پہلے سے دیا ہوا ہے جو بالاتفاق مذکورہ آیت کے بعد میں نازل ہوئی ہیں۔

1 سورۃ البقرہ آیت 234 میں (جو پہلے مذکور ہو چکی ہے)

2۔ سورۃ الطلاق آیت 4 میں کہ:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾

''اور جو عورتیں حاملہ ہوں ان کی عدت وضع حمل تک ہے۔''

غامدی صاحب جب ان دونوں آیات پر کھلے ذہن سے غور کریں گے تو ان کو اپنی اس اُلجھن کا جواب مل جائے گا جس کی خاطر انہیں ایسی دلیلیں گھڑنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔

2۔ پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں ہونا حرام ہے:

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں جہاں دو بہنوں کا بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں ہونا حرام ہے وہاں پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کا ایک وقت میں کسی مرد کے نکاح میں ہونا

بھی حرام ہے۔ ان میں سے پہلے حکم کا ماخذ قرآن اور دوسرے حکم کا ماخذ حدیث ہے۔

لیکن غامدی صاحب کا اصرار ہے کہ اس دوسرے حکم کا ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ ان کے خیال میں حدیث سے دین کا کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شرعی حکم حدیث سے ثابت ہو رہا ہو تو اول تو اس کا سرے سے انکار کر دینا چاہیے اور اگر کوئی مجبوری لاحق ہو تو حدیث کے اس حکم کو قرآن میں تلاش کرنا چاہیے، اگر وہاں سے بھی نہ ملے تو خود قرآن کی معنوی تحریف کر کے اس حکم کو اس میں زبردستی داخل کر دینا چاہیے۔

چنانچہ وہ محرمات نکاح کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''باپ کے لیے بہو اور شوہر کے لیے بیوی کی ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی، بھانجی اور بھتیجی، یہ سب حرام ہیں۔ تاہم یہ رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں اور اس سے ایک نوعیت کا ضعف ان میں پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے قرآن نے یہ تین شرطیں ان پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ بیٹی صرف اس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے۔

دوسری یہ کہ بہو کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے۔

تیسری یہ کہ بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اس حالت کے ساتھ خاص ہے، جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو۔''

(میزان، ص 414-415 طبع مئی 2008ء لاہور)

اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں نکاح کے بارے میں پہلی دو شرطیں تو مذکور ہوئی ہیں اور تیسری شرط کا ذکر صرف اس حد تک ہے کہ بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح حرام ہے لیکن غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ بیوی کی موجودگی میں اس کی پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح کی حرمت بھی قرآن ہی میں مذکور ہے۔

چنانچہ اپنے اس دعوے کا اثبات کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

''تیسری بات ﴿وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ﴾ ''اور یہ کہ تم دو بہنوں کو ایک

نکاح میں جمع کرو۔'' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔اس میں بھی، اگر غور کیجئے تو زبان کا وہی اسلوب ہے جس کا ذکر اوپر رضاعت کی بحث میں ہوا ہے۔قرآن نے بَيْـنَ الْاُخْتَيْـنِ ہی کہا ہے،لیکن صاف واضح ہے کہ زن وشو کے تعلق میں بہن کے ساتھ بہن کو جمع کرنا اسے فحش بنا دیتا ہے تو پھوپھی کے ساتھ بھتیجی اور خالہ کے ساتھ بھانجی کو جمع کرنا بھی گویا ماں کے ساتھ بیٹی ہی کو جمع کرنا ہے۔لہٰذا قرآن کا مدعا،لاریب یہی ہے کہ 'ان تجمعوا بين الاختين وبين المراء ة وعمتها وبين المرء ة وخالتها' وہ یہی کہنا چاہتا ہے لیکن بَيْـنَ الْاُخْتَيْـنِ کے بعد یہ الفاظ اس نے اس لیے حذف کر دیئے ہیں کہ مذکور کی دلالت اپنے عقلی اقتضا کے ساتھ اس محذوف پر ایسی واضح ہے کہ قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔

چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((لا يجمع بين المرء ة وعمتها ولا بين المرء ة وخالتها))

(الموطاء،رقم 1600)

''عورت اور اس کی پھوپھی ایک نکاح میں جمع ہوسکتی ہے، نہ عورت اور اس کی خالہ۔''

(میزان،ص 416،طبع مئی 2008ء لاہور)

اس طرح تمام فقہائے اسلام کے برخلاف غامدی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا کسی مرد کے نکاح میں جمع ہونا حدیث کی رو سے نہیں بلکہ قرآن کی رو سے حرام ہے۔حالانکہ ان کا یہ دعویٰ سراسر باطل اور غلط ہے۔امام قرطبی اپنی شہرہ آفاق تفسیر قرطبی میں سورۃ النساء کی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

((وهذا يقتضى الا يحرم من النساء الا من ذكر ، وليس كذلك ، فان الله تعاليف قد حرم على لسان نبيه من لم يذكر فى الآية فيضم اليها ، قال الله تعالى: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ

فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ روى مسلم وغيره عن ابى هريرة ؓ ان رسول الله ﷺ قال: "لا يجمع بين المرءة وعمتها ولا بين المرءة وخالتها))

(الجامع لاحکام القرآن، ج5، ص124)

''اس حکم کا تقاضا تو یہ ہے کہ صرف انہی عورتوں سے نکاح حرام ہو لیکن اصل میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زبان مبارک سے بعض اور عورتوں سے بھی نکاح کرنا حرام قرار دیا ہے جو یہاں مذکور نہیں ہیں لیکن ان کو بھی محرمات نکاح میں شامل سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

امام مسلم اور دوسرے محدثین حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کسی عورت اور اس کی پھوپھی کو اور کسی عورت اور اس کی خالہ کو بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں جمع نہ کیا جائے۔''

اس معاملے میں غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی کا موقف بھی ان کے خلاف ہے جو پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا کسی مرد کے نکاح میں جمع ہونا قرآن کی رو سے نہیں بلکہ حدیث کی رو سے حرام مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں لکھتے ہیں کہ:

''جمع بین الاختین کی ممانعت بھی اسی اصول حکمت پر مبنی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ قرآن حکیم انسانی فطرت کے اس تقاضے کو ابھارنا چاہتا ہے کہ جہاں رحمی رشتے کی قربت قریبہ موجود ہو وہاں باہمی ارتباط کی فطری بنیاد رافت ورحمت ہی ہونی چاہیے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ ان اسباب کو دبا دیا جائے جو رحمی رشتوں کے اندر رشک ورقابت کا زہر گھولنے والے ہوں۔ چونکہ دو بہنوں کے بیک وقت کسی کی قید نکاح میں ہونے کی صورت میں اس کا غالب امکان ہے

کہ دو بہنیں، بہنیں ہوتے ہوئے بھی، سوکنوں کے جلاپے اور رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو جائیں، اس وجہ سے اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ چونکہ یہی صورت خالہ اور بھانجی، پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کی شکل میں موجود تھی، اس وجہ سے نبی ﷺ نے، جیسا کہ حدیثوں سے واضح ہے، ان کے جمع کرنے کی بھی ممانعت فرما دی۔''

(مولانا امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج2 ص276۔277 طبع 1983ء لاہور)

پھر غامدی صاحب کا یہ خیال بھی غلط فہمی اور جہالت پر مبنی ہے کہ ''زن وشو کے تعلق میں بہن کے ساتھ بہن کو جمع کرنا اسے فحش بنا دیتا ہے۔'' اس لیے اسے حرام قرار دیا گیا ہے۔ جب کہ اس حکم کی اصل علت ان کے استاد کو معلوم ہے کہ اس صورت میں قطع رحمی کا قوی امکان ہے اور یہ علت اصل میں درج ذیل احادیث سے ماخوذ ہے کہ ایسی صورت میں:

((اِنَّكُمْ اِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ قَطَعْتُمْ اَرْحَامَكُمْ))

(عن ابن عباس بحوالہ تفسیر قرطبی، ج3 ص126)

''بے شک اس کام سے تم قطع رحمی کے مرتکب ہو گے۔''

ایک اور حدیث میں اسے 'مَخَافَةَ الْقَطِيْعَةِ' یعنی قطع رحمی کا اندیشہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (بحوالہ تفسیر قرطبی، ج3 ص126)

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں قسم کے نکاحوں (دو بہنوں یا پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی کا بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں ہونا) کی حرمت کی علت 'فحاشی' نہیں ہے جیسا کہ غامدی صاحب نے سمجھ رکھا ہے بلکہ ان کی ایک ہی مشترکہ علت یہ ہے کہ ایسی صورت میں قطع رحمی کا قوی امکان ہو جاتا ہے جس کی اسلام میں ممانعت ہے۔

3۔ عورت کے پردے کے بارے میں مغالطہ انگیزیاں

عورت کے پردے کے بارے میں غامدی صاحب کا کوئی ایک موقف نہیں ہے بلکہ وہ وقت اور حالات کے مطابق اپنا موقف بدلتے رہتے ہیں:

- کبھی فرماتے ہیں کہ عورت کے لیے چادر، برقعے، دوپٹے اور اوڑھنی کا تعلق دورِ نبویؐ کی عرب تہذیب وتمدن سے ہے اور اسلام میں ان کے بارے میں کوئی شرعی حکم موجود نہیں ہے۔
- کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت 59 ...... جس میں ازواجِ مطہرات، بناتِ نبی ﷺ اور عام مسلمان خواتین کو جلباب یعنی بڑی چادر اوڑھ کر اور اُس کا کچھ حصہ چہرے پر لٹکا کر گھر سے باہر نکلنے کا حکم ہے ...... یہ حکم ایک عارضی حکم تھا اور ایک وقتی تدبیر تھی جو مسلم خواتین کو منافقین اور یہودیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ اور ایذا پہنچانے سے بچانے کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ یہ قرآن کا کوئی مستقل حکم نہیں تھا جو بعد میں آنے والی مسلمان خواتین پر بھی لاگو ہو۔
- اور کبھی کہتے ہیں کہ حجاب کا تعلق صرف ازواجِ مطہرات کے ساتھ خاص تھا۔

اس مضمون میں ہم سب سے پہلے قرآن کی روشنی میں پردے کے احکام کی تفصیل بیان کریں گے اور آخر میں پردے کے بارے میں غامدی صاحب کے ژولیدہ، مبہم اور متضاد موقف پر تبصرہ کریں گے۔

قرآنِ مجید میں پردے کے احکام:

عورت کے پردے کے بارے میں اکثر لوگ یہ خلط مبحث کرتے ہیں کہ وہ ستر اور حجاب میں فرق نہیں کرتے، جب کہ شریعت اسلامیہ میں ان دونوں کے الگ الگ احکام ہیں۔ عورت کا ستر یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے اور دونوں ہتھیلیوں کے سوا اپنا پورا جسم چھپائے گی جس کا کوئی حصہ بھی وہ اپنے شوہر کے سوا کسی اور کے سامنے کھول نہیں سکتی۔ ستر کا یہ پردہ ان افراد سے ہے جن کو شریعت نے مَحرم قرار دیا ہے اور ان محرم افراد کی پوری تفصیل قرآنِ مجید کی سورۃ نور کی آیت 31 میں موجود ہے اور ان میں عورت کا باپ، اس کا بیٹا، اس کا بھائی، اس کا بھانجا، اور اس کا بھتیجا وغیرہ شامل ہیں۔ ان محرم افراد سے عورت کے چہرے اور اس کے

ہاتھوں کا پردہ نہیں ہے، البتہ ان کے سامنے عورت اپنے سر اور سینے کو اوڑھنی یا دوپٹہ وغیرہ سے ڈھانپے گی۔ ستر اور زینت کے بارے میں احکام سورۂ نور میں اسی طرح بیان ہوئے ہیں:

﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○﴾

(النور: 27 تا 31)

''اے نبیؐ! آپ مؤمن عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنے ستر کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر جو اس میں سے خود بخود ظاہر ہو جائے اور اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں۔ اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے سامنے، یا اپنے باپ کے، یا اپنے سسر کے، یا اپنے بیٹوں کے، یا اپنے شوہر کے بیٹوں کے، یا اپنے بھائیوں کے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا اپنے لونڈی غلام کے، یا زیردست مردوں کے جو کچھ غرض نہیں رکھتے، یا ایسے لڑکوں کے جو عورتوں کے پردے کی باتوں سے ابھی ناواقف ہوں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے پاؤں زور سے نہ ماریں کہ ان کی مخفی زینت معلوم ہو جائے اور اے ایمان والو! تم سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

گھر میں محرم مردوں کے سامنے عورت کے لیے پردے کی یہی صورت ہے۔ مگر عورت کا

حجاب اس کے ستر سے بالکل مختلف ہے اور یہ وہ پردہ ہے، جب عورت گھر سے باہر کسی ضرورت کے لیے نکلتی ہے یا گھر کے اندر غیر محرم مردوں سے سامنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں اسے بھی ''حجاب'' قرار دیا گیا ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ﴾

(الاحزاب: 53)

''جب تم ان (ازواجِ مطہراتؓ) سے کسی شے کا سوال کرو تو حجاب کے پیچھے سے کیا کرو۔''

اس صورت میں شریعت کے وہ احکام ہیں جو اجنبی مردوں سے عورت کے پردے سے متعلق ہیں۔ حجاب کے یہ احکام قرآنِ مجید کی سورۂ احزاب کی دو آیات (59 اور 54) میں بیان ہوئے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ گھر سے باہر نکلتے وقت عورت جلباب (یعنی بڑی چادر) اوڑھے گی تاکہ اس کا پورا جسم ڈھک جائے، ایسے ہی چہرے پر بھی چادر کا ایک پلو ڈالے گی۔ اب وہ صرف اپنی آنکھ کھلی رکھ سکتی ہے، باقی پورا جسم چھپائے گی۔ یہ چہرے پر نقاب کا حکم ہے، اجنبی مردوں سے عورت کا یہ پردہ ہے، جسے ''حجاب'' کہا جاتا ہے۔ اُردو زبان میں اسے ''گھونگھٹ نکالنا'' بھی کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا o﴾ (الاحزاب: 59)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور اُنھیں کوئی نہ ستائے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

سب سے پہلے اس آیت کے اصل الفاظ پر غور کیجیے۔ اس میں يُدْنِينَ کا لفظ آیا، جس کا مصدر اِدْنَاءٌ ہے اور عربی زبان میں اس کے معنی ''قریب کرنے'' اور ''لپیٹ لینے'' کے ہیں

مگر جب اس کے ساتھ عَلٰی کا صلہ آ جائے تو پھر اس میں اِرْخَاء کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ "اوپر سے لٹکا لینا"۔ دوسرا اہم لفظ جَلَابِيبِهِنَّ ہے۔ جَلَابِیب جمع ہے جلباب کی جس کے معنی رِدَاء یعنی "بڑی چادر" کے ہیں اور اس کے ساتھ مِنْ کا حرف آیا ہے جو یہاں تبعیض ہی کے لیے ہو سکتا ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں جب کسی ضرورت کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو اپنی بڑی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیں اور ان کا ایک حصہ یا ان کا پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اُردو زبان میں اسے گھونگھٹ نکالنا کہا جاتا ہے۔ اِدْنَاء عَلٰی کے الفاظ کا استعمال عربی زبان میں اسی مفہوم کے لیے ہے۔ جب کسی عورت کے چہرے پر سے کپڑا سرک جائے تو اسے دوبارہ چہرے پر لٹکا لینے کے لیے عربی زبان میں یوں کہا جائے گا۔

((اَدْنِي ثَوْبَكِ عَلٰى وَجْهِكِ))

"اپنا کپڑا اپنے چہرے پر لٹکا لو۔"

اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لیے چہرے کے پردے اور کپڑا لٹکانے کا یہ حکم اجنبی مردوں سے متعلق ہے تو یہ مفہوم لینے کا واضح قرینہ اسی آیت کے ان الفاظ میں موجود ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ یعنی جب عورتیں اپنے چہرے کا پردہ کریں اور چادر اوڑھیں گی تو اجنبی لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ شریف زادیاں ہیں۔ اس طرح کسی بد باطن کو یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ ان کو چھیڑے یا ستائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح پہچاننے کی اور چھیڑنے ستانے کی صورت گھر سے باہر کے ماحول ہی میں پیش آ سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ بڑی چادر لینے کی ضرورت بھی عموماً گھر سے باہر ہو سکتی ہے، کیونکہ گھر میں اجنبی مردوں کی آمد شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ گھر میں چونکہ اکثر محرم مردوں سے ہی سامنا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے لیے عورت کے پردے کے بارے میں الگ سے حکم موجود ہے جو سورۂ نور کی آیت 31 میں اس طرح آیا ہے: ﴿ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ﴾ ...... "اور عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔" گویا گھر کے اندر عورت کو چادر پہننے کی ضرورت نہیں، صرف اوڑھنی کافی ہو سکتی ہے، کیونکہ گھر میں اجنبی مردوں سے

بہت کم سامنا ہوتا ہے اور جب وہ گھر سے باہر نکلے گی تو بڑی چادر اوڑھے گی جس کا ایک حصہ اپنے چہرے پر بھی ڈال لے گی۔

پردہ کے سلسلہ میں تیسری اہم آیت سورۃ الاحزاب کی آیت حجاب (نمبر 53) بھی ہے جس میں یہ مسئلہ بیان ہوا کہ اگر کوئی غیر محرم شخص خواتین خانہ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اسے حجاب کے پیچھے سے یہ تقاضا کرنا چاہیے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جہاں سورۃ الاحزاب کی آیت 59 کی رو سے خواتین کو گھروں سے باہر جلباب...... یعنی ایسی بڑی چادر جو سر سے اُنھیں ڈھانپ لے اور اس میں ان کا چہرہ بھی چھپ جائے ...... اوڑھنے کا حکم ہے، وہاں سورۃِ الاحزاب کی آیت 53 کی رو سے گھروں کے اندر بھی غیر محرم مردوں سے اُنھیں حجاب کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ احکام تو غیر محرم مردوں کے لیے ہیں، جہاں تک محرم مردوں کا تعلق ہے تو سورۂ نور کی آیت زینت (27) کی رُو سے عورتوں کو چند محرم مردوں کے سامنے ہی اپنی زینت دکھانے کی اجازت ہے۔

اُمت مسلمہ کے تمام جلیل القدر مفسرین نے سورۂ احزاب کی اس آیت 59 کا یہی مفہوم بیان کیا ہے:

1۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے، اسے حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں اس طرح نقل کیا ہے کہ:

((أمر الله نساء المؤمنين إذا خرجن من بيوتهن في حاجة أن يغطين وجوههن من فوق رؤوسهن بالجلابيب و يبدين عينا واحدة.)) (تفسیر القرآن العظیم ج3، ص518، طبع بیروت)

''اللہ نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلو اوپر سے ڈال کر اپنا منہ چھپالیں اور صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں۔''

2۔ ابن جریرؒ اور ابن منذرؒ کی روایت ہے کہ محمد بن سیرینؒ نے حضرت عبیدہ سلمانی سے اس

آیت کا مطلوب پوچھا۔ (یہ حضرت عبیدہ نبی ﷺ کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضر خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اُنہیں فقہ اور قضا میں قاضی شریح رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ مانا جاتا تھا۔) اُنہوں نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے اپنی چادر اُٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔

3۔ امام ابن جریر طبریؒ نے اپنی تفسیر جامع البیان (ج:22/33) پر اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ ''شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھر سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے بال کھلے ہوئے ہوں، بلکہ اُنھیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔''

4۔ امام فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ؛

((فأمر الله الحرائر بالتجلبب .... المراد يعرفن أنهن لا يزنين لأن من تستر وجهها مع أنه ليس بعورة لا يطمع فيها أنها تكشف عورتها فيعرفن أنهن مستورات لا يمكن طلب الزنا منهن.))

''اللہ تعالیٰ نے آزاد عورتوں کو چادر اوڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو عورت اپنا چہرہ چھپائے گی، حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہو گی۔ اس طرح ہر شخص جان لے گا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔''

5۔ مشہور مفسر زمخشری، اسی آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ؛

((يرخينها عليهم ويغطين بها وجههن وأعطافهن.))

(الکشاف، جلد 2، صفحہ 221)

''وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے

اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔''

6۔ علامہ نظام الدین نیشاپوریؒ اپنی تفسیر '' غرائب القرآن'' میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

'' عورتیں اپنے چادر کا ایک حصہ لٹکالیا کریں، اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔'' (جلد 22، صفحہ 32)

7۔ مشہور حنفی مفسر ابوبکر جصاصؒ اپنی تفسیر میں اسی آیت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

((في هذه الآية دلالة أن المرأة مأمورة بستر وجهها عن الأجنبيين وإظهار الستر والعفاف عند الخروج لئلا يطمع أهل الريب فيهن.))

'' یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت ستر اور عفت کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ مشتبہ سیرت و کردار کے لوگ اسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔''

(احکام القرآن، جلد 3، صفحہ 458)

8۔ علامہ عبداللہ بن احمد بن محمود نسفیؒ میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

((ومعنى ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ يرخينهن عليهن ويغطين بها وجههن وأعطافهن.)) (تفسیر نسفی، ج: 3، ص: 313)

''اور آیت کے الفاظ ﴿ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکالیا کریں اور اس طرح اپنے چہروں اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔''

9۔ مفتی محمد شفیع مرحوم اپنی تفسیر '' معارف القرآن'' میں اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

'' اس آیت نے بصراحت چہرہ کے چھپانے کا حکم دیا ہے۔ جس سے اس مضمون کی مکمل تائید ہوگئی جو اوپر حجاب کی پہلی آیت کے ذیل میں مفصل بیان ہو چکا ہے

کہ چہرہ اور ہتھیلیاں اگرچہ فی نفسہ ستر میں داخل نہیں، مگر بوجہ خوف فتنہ کے ان کا چھپانا بھی ضروری ہے، صرف مجبوری کی صورتیں مستثنیٰ ہیں۔''

(معارف القرآن، جلد 4، صفحہ 234)

10۔ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اس آیت کے تحت اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کے زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگھٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ چھپ جائے۔'' (تفہیم القرآن، جلد 4، صفحہ 131)

11۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''قرآن نے اس جلباب سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور اُنہیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت نہ آئے۔ یہی جلباب ہے جو آج بھی دیہات میں شریف بوڑھی عورتیں لیتی ہیں جس نے بڑھ کر برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔'' (تدبر قرآن، جلد 6، صفحہ 269)

حضرات مفسرین نے سورۂ احزاب کی اسی زیر بحث آیت 59 میں چہرے کے پردے کا حکم سمجھا ہے اور چہرے کا یہ پردہ خود قرآنِ مجید سے ثابت ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے پیش نظر زنا اور زنا کے مقدمات و محرکات کی پیش بندی اور روک تھام ہے۔ ورنہ حقیقت ہر شخص پر عیاں ہے کہ ایک جوان عورت کا چہرہ ہی سب سے زیادہ جاذبِ نگاہ اور صنفی محرک ہوتا ہے، بالخصوص جب اسے غازہ و رنگ سے بھی خوب مزین کر دیا جائے۔ فقط چہرہ دیکھ لینے ہی سے عوت کے حسن و جمال کا اندازہ کر لیا جاتا ہے اور بغیر چہرہ دیکھے اس کے حسن و جمال کا تصور

ممکن نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو اسلام محرکاتِ زنا کو ایک ایک کر کے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ جو نامحرم عورت کو دیکھنے پر پابندی لگاتا ہے اور غضِ بصر کا حکم دیتا ہے۔ جو مرد اور عورت کو تنہائی میں یکجا ہونے سے روکتا ہے۔ جو عورت کو کسی غیر مرد سے بات کرتے وقت لگاوٹ کا لہجہ اختیار کرنے سے منع کرتا ہے۔ جو اس کی آواز کا پردہ چاہتا ہے کہ عورت نماز میں امام کو اس کی غلطی پر ٹوکنے کے لیے ''سبحان اللہ'' تک نہ کہے۔ عورت اپنی کوئی زینت بھی غیر مرد کو نہ دکھائے۔ وہ اسلام یہ کیسے چاہے گا کہ چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے، اور نسوانی حسن و جمال کے مرکز چہرے کو چھپانے کا کوئی حکم نہ دیا جائے۔

البتہ ہنگامی اور جنگی صورتِ حال میں یا حج اور عمرہ کے مناسک ادا کرتے وقت، علاج معالجے کی صورت میں اور زیادہ بوڑھی عورت کے لیے چہرے کے پردے میں رخصت دی گئی ہے، مگر اصل حکم جو عام ہے اور سب کے لیے ہے، وہ یہی ہے کہ اسلام میں عورت کے چہرے کا پردہ ضروری ہے۔ شریعت اسلامیہ نے اسی کا حکم دیا ہے۔

پردے کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف اور اس پر ہمارا تبصرہ:

عورت کے پردے کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف ''ارتقا پذیری'' کا شکار رہتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔

اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

1۔ دوپٹے سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''اصل میں ضرورت اس بات کی ہے کہ خواتین کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ ان کی تہذیب و ثقافت کیا ہے اور انھیں کن حدود کا پابند رہ کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔ البتہ اسے ایک تہذیبی شعار کے طور پر ضرور پیش کرنا چاہیے۔ اصل

چیز سینہ ڈھانپنا اور زیب و زینت کی نمائش نہ کرنا ہے۔ یہ مقصد کسی اور ذریعے سے حاصل ہو جائے تو کافی ہے، اس کے لیے دوپٹہ ہی ضروری نہیں ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، مئی 2002ء صفحہ 47)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک مسلمان عورت کے لیے دوپٹہ یا اوڑھنی کا استعمال کوئی شرعی حکم نہیں ہے، بس ایک تہذیبی شعار اور رسم و رواج ہے، جبکہ دوسری طرف قرآنِ مجید کی نص قطعی اور واضح حکم ہے کہ

﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَى جُيُوبِهِنَّ﴾ (النور: 27)

''اور چاہیے کہ عورتیں اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیاں (دوپٹے) ڈالے رہیں۔''

غالباً غامدی صاحب کے ہاں حدیث کی طرح قرآن سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہوتا ہوگا۔

2۔ مارچ 2007ء میں ''جیو'' ٹی وی کے پروگرام ''غامدی نامہ'' میں اسلام اور پردہ کے موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا۔ اس مذاکرے کے شرکاء میں غامدی صاحب اور تین خواتین: سمیعہ راحیل قاضی، مونا اسلم اور ایک دانشور غزالہ نثار شامل تھیں۔ اس مذاکرے میں غامدی صاحب نے پردے کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا کہ:

﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ ذَلِكَ أَدْنَى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ (الاحزاب: 59)

''اے نبیؐ! اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیں کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں کوئی نہ ستائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس فرمانِ الٰہی میں موجود شرعی حکم ایک عارضی اور ہنگامی حکم تھا اور منافقین اور یہود کی طرف سے مسلم خواتین کو چھیڑ چھاڑ اور ایذا رسانی سے بچانے کی ایک وقتی تدبیر تھی۔ اس

آیت کا عورت کے پردے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور آج یہ حکم باقی نہیں ہے۔ (اس مذاکرے کی سی ڈی ''اسلام میں پردہ'' کے عنوان سے موجود ہے۔)

یہی موقف غامدی صاحب نے اپنی کتاب 'میزان' میں لکھا ہے کہ:

''ان آیتوں میں ﴿اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ﴾ کے الفاظ اور ان کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کر دینے کی ایک وقتی تدبیر تھی جو اوباشوں اور تہمت تراشنے والوں کے شر سے مسلمان عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی۔''

(میزان، ص270، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

یاد رہے کہ غامدی صاحب اس سے پہلے مرتد کے لیے قتل کی سزا، کافر اور مسلمان کی وراثت اور کفار سے جہاد وغیرہ کو بھی وقتی اور ہنگامی احکام کے شرعی احکام کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس طرح شریعت کے بیشتر احکام غامدی صاحب کی اس ایک ہی ''لاٹھی'' اور ''ابلیسی فارمولے'' کی زد میں آ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا!!

لیکن ہم اُن کو اُن کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی کا اس بارے میں موقف پیش کیے دیتے ہیں۔ وہ سورۂ احزاب کی آیت 59 کی تفسیر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

''اس ٹکڑے ﴿ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ﴾ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوّل تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں، سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا، کیا کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات کل کی نسبت ہزار درجہ زیادہ خراب ہیں، البتہ حیا اور عفت کے وہ تصورات معدوم ہو گئے جن کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔'' (تدبر قرآن، جلد6، صفحہ 270)

نیز اسی آیت (الاحزاب:59) کی تفسیر میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''قرآن نے اس جلباب (چادر) سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی ''جلباب'' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقعہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقعہ کو اس زمانہ کے دل دادگان اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں لیکن قرآنِ مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے، جس کا انکار صرف وہی برخود لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسولؐ سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔'' (تدبر قرآن، جلد6، صفحہ 269)

غامدی صاحب کے نزدیک اُمت مسلمہ کے تمام علمائے کرام تو ''خاک'' کے مرتبہ میں ہیں اور پوری اُمت میں سے صرف ان کے ممدوح دو ''علما'' ہیں جن کو وہ ''آسمان'' کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ غامدی صاحب اپنی کتاب ''مقامات'' میں لکھتے ہیں کہ:

''میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا ہے، لیکن امین احسن اور ان کے اُستاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

(مقامات، صفحہ 57، 58، مطبوعہ دسمبر 2001ء، لاہور)

لیکن عورت کے چہرے کے پردے کے بارے میں غامدی صاحب کا موقف نہ صرف قرآنِ مجید اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے، بلکہ اُن کے اپنے استاد کے موقف کے بھی خلاف ہے۔



باب 6:

سیاست وریاست

1۔اسلامی ریاست کے اختیارات کا مسئلہ

غامدی صاحب کی تجدد پسندی اور اسلام دشمنی کا حال یہ ہے کہ وہ اسلامی ریاست کو اس کے بنیادی فرائض اور ذمہ داریوں سے بھی روکتے ہیں اور اسے ان اختیارات سے بھی محروم دیکھنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ریاست اپنے مسلمان شہریوں کو کسی جرم کے ارتکاب سے روک سکتی اور اس پر سزا تو دے سکتی ہے لیکن دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کو طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی۔ وہ مثال کے طور پر، انہیں روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتی۔ ان میں سے کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ وہ صاحب استطاعت ہے، اسے حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ جہاد وقتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی۔ مختصر یہ کہ جرائم کے معاملے میں اس کا دائرہ اختیار آخری حد تک وسیع ہے، لیکن شریعت کے اوامر میں سے ان دو...... نماز اور زکوٰۃ...... کے سوا باقی سب معاملات میں یہ صرف ترغیب وتلقین اور تبلیغ وتعلیم ہی ہے جس کے ذریعے سے وہ مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جدوجہد کر سکتی ہے۔ اس طرح کے تمام معاملات میں اس کے سوا کوئی چیز اس کے دائرہ اختیار میں نہیں ہے۔''

(میزان، ص492، 493 طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی ریاست مسلمانوں کو نماز

اور زکوٰۃ کے سوا دین کے کسی اور ایجابی تقاضے یا کسی شرعی امر کا حکم نہیں دے سکتی لہٰذا وہ:

مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا حکم نہیں دے سکتی۔

ان لوگوں کو جن پر حج فرض ہو حج پر جانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔

جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ غلط اور غیر اسلامی ہے۔ یہ ان کی جہالت، تجدد پسندی اور اسلام دشمنی کا شاخسانہ ہے اور ان کے اپنے 'استاد امام' کے اس بارے میں موقف کے بھی خلاف ہے۔ اب ہم ان کے اس دعوے کا علمی جائزہ لیں گے۔

قرآن مجید اور ریاست کی اطاعت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد 'اولو الامر' یعنی حکمرانوں کی اطاعت کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا۠﴾

(النساء: 59)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی اور ان کی جو تم میں سے اہل اقتدار ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔''

اس آیت میں اہل ایمان کو پہلے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اولوالامر یعنی مسلمانوں کے خلیفہ اور حکمران کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تو ہر حال میں ہے اور غیر مشروط ہے

جب کہ اولوالامر کی اطاعت مشروط ہے اس سے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم کے خلاف نہ ہو اور ان کی اطاعت کے تابع ہو۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست کی اطاعت صرف معروف میں ہے اور منکر یا معصیت کے کاموں میں نہیں ہے۔ اسلامی ریاست جب کسی معروف کا حکم دے تو مسلمان شہریوں پر اس کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

احادیث اور اسلامی ریاست کی اطاعت:

صحیح احادیث میں بھی مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ معروف میں اپنے حکمرانوں کی اطاعت کریں اور معصیت میں اطاعت نہ کریں۔ ایک متفق علیہ حدیث یہ ہے کہ:

((اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا اَحَبَّ اَوْ كَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ، فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ))

(صحیح بخاری، رقم 7144، صحیح مسلم، رقم 4763)

''ایک مسلمان پر اپنے امیر کا حکم سننا اور ماننا فرض ہے خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند، جب تک کہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع و طاعت نہیں۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ:

((اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ)) (صحیح بخاری، رقم 7145)

''طاعت صرف معروف (کے کاموں) میں ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا پہلا خطبہ خلافت:

مسلمانوں کے خلیفہ اول سیدنا ابوبکر نے خلیفہ ہونے کے بعد اپنی پہلی تقریر میں یہ اعلان فرمادیا تھا کہ:

((اَطِيْعُوْنِي مَا اَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، فَإِذَا عَصَيْتُ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ

فَلَا طَاعَةَ لِيْ عَلَيْكُمْ)) (کنز العمال، ج5، حدیث 2282)

''میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا رہوں اور جب میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکمرانوں کی اطاعت صرف معروف اور جائز کاموں میں ہے، منکر اور معصیت کے کاموں میں نہیں ہے۔

اسلامی ریاست کے فرائض اور اختیارات:

قرآن حکیم میں اسلامی حکومت کے درج ذیل فرائض بیان ہوئے ہیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۝﴾ (الحج : 41)

''یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔''

دوسرے مقام پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝﴾ (آل عمران : 104)

''اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یاد رہے کہ ان دونوں آیات کا ترجمہ ہم نے دانستہ طور پر غامدی صاحب کے استاد امام مولانا اصلاحی کی تفسیر 'تدبر قرآن' سے لیا ہے اور خود غامدی صاحب نے بھی اپنی کتاب 'میزان' میں ان دونوں آیات سے اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں ثابت کی ہیں۔ (ص 489، 490)

مذکورہ آیات کو جو شخص بھی کھلے ذہن کے ساتھ پڑھے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی حکومت ہر 'معروف' کا حکم دینے اور ہر 'منکر' سے روکنے کے لیے قانون بنانے کا اختیار رکھتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ دونوں چیزیں...... معروف اور منکر...... 'عام' استعمال ہوئے ہیں اور ان کو 'خاص' نہیں کیا جا سکتا۔ یوں نہیں کہا جا سکتا کہ اسلامی حکومت بعض معروف کا حکم دے سکتی ہے اور بعض کا نہیں دے سکتی۔ کیونکہ خود قرآن نے اس طرح کی کوئی تحدید یا تخصیص نہیں کی۔

البتہ قاعدہ یہی ہے کہ اسلامی حکومت نماز اور زکوٰۃ سمیت ہر 'معروف' کام کا حکم پہلے اخلاقی طور پر تعلیم و تبلیغ اور ترغیب و تلقین کے ذریعے دے گی۔ اس کے نتیجے میں اگر لوگ خوشی سے اور رضا کارانہ طور پر معروف کی پابندی کریں گے تو قانون ان سے کوئی تعرض نہیں کرے گا، لیکن اگر اس کے باوجود لوگ 'معروف' پر عمل نہیں کریں گے تو اسلامی حکومت قانون کی طاقت سے ان کو 'معروف' کا پابند کرے گی کیونکہ قرآن کی رو سے جس طرح جرائم کے خاتمے اور منکرات کے سدباب کے لیے اسلامی ریاست وسیع اختیارات رکھتی ہے بالکل اسی طرح 'معروف' کی پابندی کرانے کے لیے بھی اسے ویسے ہی وسیع اختیارات حاصل ہیں۔

یاد رکھیے شریعت کے تمام اوامر و نواہی کے بارے میں اسلامی ریاست کا یہی دستور العمل ہے کیونکہ وہ محض واعظ اور ذاکر نہیں ہوتی اور دنیا کی ہر حکومت کی طرح صاحب اختیار و اقتدار حکمران ہوتی ہے۔

روزے کا حکم اور اسلامی ریاست:

روزہ رکھنا دین کا ایک ایجابی تقاضا اور ایک شرعی امر ہے اور اسلامی حکومت جو ہر معروف کا حکم دے سکتی ہے روزے کے معروف کا بھی حکم دے گی۔ وہ پہلے نصیحت اور ترغیب کے انداز میں مسلمانوں کو اس معروف کی تلقین کرے گی اور اگر لوگ اس کی اس اخلاقی تبلیغ ہی سے روزے کی پابندی کرلیں گے تو وہ قانون کو حرکت میں نہیں لائے گی۔ لیکن جو لوگ اس کی

اس نصیحت اور تلقین پر عمل نہیں کریں گے اور سر عام روزہ خوری کریں گے تو اسلامی حکومت ان کو قانون کی طاقت سے روزہ رکھنے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور کرے گی اور بعض حالات میں مناسب سزا بھی دے گی۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس بارے میں خود ان کے 'استاد امام' امین احسن اصلاحی کا موقف بھی ان کے خلاف ہے اور ان کا موقف یہ ہے کہ خلیفہ وقت روزے کے شرعی حکم سمیت اللہ تعالیٰ کے تمام منصوص احکام و مسائل کو طاقت کے زور سے نافذ کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'اسلامی ریاست' میں لکھتے ہیں:

> ''حضورؐ کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہو گئے تھے، ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو بزورِ شمشیر ادائیگی زکوٰۃ پر مجبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ ان کے نزدیک شریعت کے ان واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا، جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میں انہوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا بلکہ روزہ، نماز، حدود، تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بحیثیت خلیفہ کے اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی، چنانچہ انہوں نے اپنے اسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔''

(اسلامی ریاست، ص 40، طبع 2006ء دار التذکیر، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی کا موقف یہ ہے کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کو نہ صرف روزہ رکھنے کا حکم دے سکتی ہے بلکہ وہ شریعت کے تمام واضح اور منصوص اوامر و مسائل، جن میں نماز، زکوٰۃ، حج، قربانی اور جہاد وغیرہ شامل ہیں' کے نفاذ کے لیے قانون کی طاقت استعمال کر سکتی ہے۔

حج کا حکم اور اسلامی ریاست:

حج بھی دین کا ایک ایجابی تقاضا اور شرعی امر ہے۔ اسلامی حکومت اپنے عمال سمیت تمام صاحب استطاعت لوگوں کو حج کرنے پر مجبور بھی کر سکتی ہے۔ یہ معاملہ بھی پہلے تعلیم و ترغیب اور وعظ و نصیحت سے شروع ہوگا اور جو لوگ استطاعت کے باوجود حج کرنے میں کوتاہی کریں گے اسلامی ریاست ان کو اس فریضے کی ادائیگی کے لیے قانون کی طاقت استعمال کرے گی۔ خلافت راشدہ کے دور میں اس کی نظیر موجود ہے۔

اس بارے میں مورخِ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی رحمہ اللہ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صوبوں کے عاملوں اور گورنروں کو حکم دے رکھا تھا کہ ایام حج میں سب آ کر شریک حج ہوں۔ آپ خود بھی ہر سال حج کو جاتے رہے۔ عاملوں کے شریکِ حج کرنے میں ایک خاص مصلحت یہ بھی تھی کہ حج کے موقعہ پر ہر ملک اور ہر صوبے کے لوگوں کو موقع حاصل ہے کہ وہ آ کر مجھ سے ملیں اور اپنے عامل میں اگر کوئی نقص دیکھتے ہیں تو اس کی شکایت کریں اور اسی وقت اس عامل سے بھی جو وہاں موجود ہے، جواب طلب کیا جا سکے۔''

(تاریخ اسلام، جلد اول، ص415)

مطلب یہ ہے کہ اس طرح عمالِ حکومت کو حج کا ثواب حاصل کرنے کا موقع بھی مل جاتا اور ضمنی فائدے کے طور پر ان کا احتساب بھی ہو جاتا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست صاحب استطاعت مسلمانوں کو حج کرنے کے لیے قانونی طاقت بھی استعمال کر سکتی ہے۔

جہاد و قتال کا حکم:

جہاد و قتال بھی دین کا ایک ایسا ایجابی تقاضا اور شرعی امر ہے جس کے بارے میں علمائے اسلام کا اتفاق اور اجماع ہے۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح دنیا کی کوئی حکومت اپنے ملک کے دفاع سے غفلت نہیں برت سکتی۔ اور ہنگامی صورت حال (Emergency) میں جبری بھرتی کا قانون نافذ کر سکتی ہے۔ اسی طرح اسلامی ریاست بھی اپنے ملک کے دفاع، جسے اسلامی اصطلاح میں جہاد و قتال کہتے ہیں، سے قطعاً غافل نہیں رہ سکتی۔ اسلام میں جہاد و قتال دین کا ایجابی تقاضا بھی ہے اور فریضہ بھی۔ اس کے لیے اسلامی ریاست اپنی تعلیم گاہوں میں نوجوانوں کے لیے جہاد و قتال کی خاطر فوجی تربیت کا حصول لازمی قرار دے سکتی ہے۔ غیر معمولی اور ہنگامی حالات (Emergency) میں جبری بھرتی کا قانون نافذ کر سکتی ہے اور جب وہ نفیر عام (عام لام بندی) کا حکم جاری کر دے تو اس کی اطاعت ہر صحت مند جوان مسلمان مرد پر لازم ہو جاتی ہے۔ پھر جو لوگ شرعی عذر کے بغیر ایسے موقع پر جہاد و قتال میں شرکت نہ کریں ان کو وہ مناسب سزا بھی دے سکتی ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ التوبہ میں ان تین بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واقعہ موجود ہے جو غزوۂ تبوک میں شرکت نہیں کر سکے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان تینوں صحابہ کو معاشرتی مقاطعہ (Social Boycott) کی سزا دی تھی اور ان کی منکوحہ بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کا حکم جاری فرمایا تھا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری کتاب التفسیر رقم 4677 میں اور صحیح مسلم، کتاب التوبہ رقم 7016 میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ہمیں معلوم ہے غامدی صاحب سرے سے جہاد و قتال کے حکم ہی کے منکر ہیں اور ان کے نزدیک یہ کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ لیکن کیا ان کے نہ ماننے سے شریعت کا کوئی حکم بدل سکتا ہے ؎

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

جبری تعلیم اور اسلامی ریاست:

آج کی اکثر مہذب ریاستوں میں جبری تعلیم کا قانون موجود ہے جس کی خلاف ورزی پر والدین کے لیے سزا بھی رکھی گئی ہے اور کوئی معقول شخص اس قانون کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

اسلام میں بھی حصولِ علم کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ حدیث میں ہے کہ:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (ابن ماجہ، رقم224)

''(دین کا) علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

اسلامی ریاست بھی اپنے مسلمان شہریوں کو وعظ ونصیحت کے انداز میں لوگوں کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے ترغیب دیتی ہے لیکن جہاں ضرورت ہو وہاں وہ دین کی بنیادی تعلیم کو جبری طور پر بھی نافذ کرسکتی ہے۔ خلافتِ راشدہ سے اس کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔

چنانچہ اس بارے میں علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الفاروق'' میں امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خانہ بدوش بدوؤں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم جبری طور پر قائم کی۔ چنانچہ ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا، چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر پھر کر ہر شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کا کوئی حصہ یاد نہ ہو اس کو سزا دے۔'' (الفاروق، ص248، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، لاہور، بحوالہ اغانی جز (16) صفحہ 158 نیز اصابہ فی احوال الصحابی میں بھی یہ واقعہ منقول ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی ریاست دین کی جبری تعلیم کا قانون بھی نافذ کرسکتی ہے۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ دین کا علم حاصل کرنا دین کا ایک ایجابی تقاضا ہے، ایک شرعی امر ہے اور ایک معروف کام ہے اور یہ اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ وہ اپنے مسلمان شہریوں کو معروف کا حکم دے اور اس کی ان سے پابندی کرائے۔

سرکاری منصب اور اسلامی ریاست:

اسلامی ریاست کسی ایسے فرد کو سرکاری عہدہ ومنصب قبول کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے جو اس کے نزدیک اس کا اہل ہو۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق (ج11 ص348) ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مشہور صحابی سعید بن عامر جمحی رضی اللہ عنہ کو شام کے علاقے حمص کا والی (گورنر)

بنانا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ نہیں ہو سکتا کہ تم لوگ خلافت کی ساری ذمہ داری کا بوجھ میری گردن پر ڈال دو اور خود اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ جواب سن کر سعید بن عامر رضی اللہ عنہ نے وہ عہدہ قبول کر لیا اور ان کو حمص (شام) کا گورنر بنایا گیا جہاں پر کئی برس تک اس عہدے پر فائز رہے۔

(بحوالہ فقہ عمر از محمد رواس قلعہ جی، مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی، ناشر: ادارہ معارف اسلامی، لاہور)

نیز یہ واقعہ صُوَرٌ مِنْ حَيَاةِ الصَّحَابَةِ از الدکتور عبدالرحمٰن رافت پاشا، ص 10 پر بھی موجود ہے، اس کتاب کا اردو ترجمہ 'حیات صحابہ کے درخشاں پہلو' کے نام سے موجود ہے۔

اس مقام پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ یہ سرکاری عہدہ قبول کرنے کا معاملہ کوئی دینی کام نہیں تھا یا یہ 'دین کا کوئی ایجابی تقاضا' نہ تھا کیونکہ اول تو اسلام میں دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دوسرے یہ کہ اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچائیں اور اسلام میں سرکاری عہدہ ومنصب ایک امانت ہے اور یہ امانت صرف اس کے اہل اور باصلاحیت لوگوں ہی کے سپرد کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ (النساء: 58)

''بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حق داروں کو پہنچا دو۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ تمہیں کتنی اچھی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک اللہ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔''

مسلمان عورت کا شرعی پردہ:

مسلمان عورت کا شرعی پردہ بھی دین کا ایک ایجابی تقاضا اور شرعی امر ہے۔ اسلامی

ریاست مسلمان خواتین کو شرعی پردے کا پابند کرنے کے لیے پہلے مرحلے میں تعلیم وتلقین نصیحت ترغیب سے کام لے گی۔ اگر اسی سے اس کا مقصد پورا ہو جائے گا تو وہ قانون کی طاقت استعمال نہیں کرے گی۔ لیکن وعظ ونصیحت کے باوجود جو مسلمان خواتین شرعی پردے کی پابندی نہیں کریں گی ان کے خلاف قانون کی طاقت استعمال کی جائے گی۔

اگرچہ غامدی صاحب سرے سے مسلمان عورت کے لیے شرعی پردے ہی کو نہیں مانتے اور اسے محض رسم ورواج قرار دیتے ہیں مگر ساری امت کی طرح ان کے اپنے استاد امام اسے شریعت کا ایک ضروری حکم مانتے ہیں اور اس بارے میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

''جس طرح دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی ایسی چیز کو روا نہیں رکھ سکتی جو معاشرے کی اجتماعی زندگی کو ریاست کے بنیادی اصولوں کے خلاف متاثر کرنے والی ہو، اسی طرح اسلامی حکومت اپنی حدود کے اندر کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ قحبہ گری یا سودی لین دین کا پیشہ کرے اگرچہ یہ شخص یا گروہ کے نزدیک جائز اور کارِ ثواب ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ملک کی اجتماعی زندگی کے اخلاقی اور معاشی نظام کو بگاڑنے والی چیزیں ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم عورتوں کو اگرچہ پردے کی شرعی حدود کا قانوناً پابند نہیں کیا جائے گا لیکن بہر حال ان کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مغرب زدہ عورتوں کی طرح لوگوں کے اخلاق بگاڑتی پھریں۔''

(اسلامی ریاست، ص219، 220 طبع 2006ء لاہور)

''مولانا اصلاحی کے اس بیان سے یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت مسلم خواتین کو نہ صرف قانونی طور پر شرعی پردے کا پابند کر سکتی ہے بلکہ وہ غیر مسلم عورتوں کو بھی ایک مناسب حد تک پردے کا پابند کر کے ان کو کھلے عام بے پردگی سے روک سکتی ہے۔''

جو چیز قانون ہے اس کا نفاذ کیوں نہ ہو؟

غامدی صاحب اپنی کتاب 'میزان' طبع سوم مئی 2008ء میں 'قانون عبادات' کے عنوان کے تحت روزے، قربانی سمیت تمام اسلامی عبادات کو 'قانون' قرار دیتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

(1) ''روزے کا یہ قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے۔'' (ص369)

(2) ''قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے......'' (ص405)

''قربانی کا قانون یہی ہے۔'' (ص406)

(3) قانون عبادات میں نماز، زکوۃ، قربانی، عمرہ، حج، روزہ اور اعتکاف شامل ہیں۔ (ص263تا405)

(4) زکوۃ کا قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے۔'' (ص350)

اب سوال یہ ہے کہ جب روزہ قانون ہے، حج قانون ہے اور قربانی قانون ہے تو ایک اسلامی حکومت اپنے ان 'قوانین' کو نافذ کیوں نہیں کر سکتی۔ سب جانتے ہیں کہ قانون ایسی چیز ہوتی ہے جسے ہر ریاست طاقت کے زور سے نافذ کرتی ہے۔ پھر کیا اسلامی ریاست اپاہج اور اتنی بے بس ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے احکام وقوانین کی تنفیذ نہیں کر سکتی اور اس کے لیے طاقت استعمال نہیں کر سکتی؟

پھر اگر غامدی صاحب کی منطق درست مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر اسلامی حکومت منافق ہوتی ہے یا اسے منافق ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملکی قوانین میں سے جس قانون کو چاہیے طاقت سے نافذ کر دے اور جس قانون کو چاہے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے اور اس کے لیے نہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہو اور نہ بندوں کے سامنے۔ غور کیجیے، یہ کتنا بھیانک تصور ہے اسلامی ریاست کے بارے میں، جو غامدی صاحب کی کھوپڑی سے

برآمد ہوا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بے اصل اور خلافِ اسلام ہے کہ ایک اسلامی ریاست نماز اور زکوٰۃ کے سوا کسی شرعی کام یا دین کے کسی ایجابی تقاضے کا حکم نہیں دے سکتی۔ البتہ اسلامی حکومت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کے معاملے میں پہلے مرحلے میں تعلیم وتبلیغ اور ترغیب وتلقین سے کام لے گی لیکن جو لوگ اس سے اصلاح پذیر نہ ہوں ان کی اصلاح کے لیے قانون کی طاقت استعمال کرے گی اور جس طرح کسی منکر کو مٹانے کے لیے وہ وسیع انتظامی اور صوابدیدی اختیارات رکھتی ہے اسی طرح معروف کا حکم دینے میں بھی اسے وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ آج کے مہذب معاشروں کی حکومتوں کے مقابلے میں کم اختیارات کی حامل نہیں ہوتی۔

2۔کیا اسلام میں مرتد کے لیے قتل کی سزا نہیں ہے؟

غامدی صاحب نے مرتد کے لیے قتل کی سزا ہونے کا بھی انکار کیا ہے جس کا سبب محض انکارِ حدیث ہے۔

''ارتداد'' کے لغوی معنی ''لوٹ جانے'' اور ''پھر جانے'' کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں ارتداد کا مطلب ہے: ''دین اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لینا۔'' یہ ارتداد قولی بھی ہوسکتا ہے اور فعلی بھی۔ ''مرتد'' وہ شخص ہے جو دین اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرلے۔

اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے جو صحیح احادیث، تعامل صحابہ اور اجماع اُمت سے ثابت ہے۔

مگر غامدی صاحب اس منصوص اور مسلمہ اجماعی امر کو نہیں مانتے اور مرتد کے لیے سزائے قتل ہونے کے منکر ہیں۔ ہم سب سے پہلے مرتد کے واجب القتل ہونے کے شرعی اور عقلی دلائل دیں گے، اس کے بعد غامدی صاحب کے موقف کا جائزہ لیں گے۔

صحیح احادیث:

نبی کریم ﷺ کے جن مستند فرامین کی بنا پر علماے اُمت کا مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع ہے، وہ درج ذیل ہیں:

1۔ صحیح بخاری میں سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت:

((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ.)) (صحیح بخاری، حدیث:6922)

''جو (مسلمان) اپنا دین بدل لے، اُسے قتل کردو۔''

اسی مضمون کی احادیث بعض جلیل القدر صحابہ کرام: سیّدنا ابوبکر صدیق، سیّدنا علی، سیّدنا ابوموسیٰ اشعری، سیّدنا خالد بن ولید اور سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی مروی ہیں۔

مذکورہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ سنن ابوداوٗد، سنن ابن ماجہ اور موطا امام مالکؒ میں بھی موجود ہے۔

2۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عن عبداللّٰه قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: " لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله الا الله، وأني رسول الله إلا بإحدى ثلاث: النفس بالنفس، والثيب الزاني، والمفارق لدينه التارك للجماعة.)) (صحیح بخاری، حدیث:2878)

''سیّدنا عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔''

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داوٗد، جامع ترمذی، سنن نسائی (4725) سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے اور اسے سیّدنا

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی مرتد کے لیے قتل کی سزا ثابت ہوتی ہے۔

3۔ سنن ابوداؤد کی حدیث ہے کہ:

((عن ابي أمامة بن سهل قال: كنّا مع عثمان وهو محصور في الدار، وكان في الدار مدخل من دخله سمع كلام من على البلاط، فدخله عثمان، فخرج إلينا وهو متغير لونه، فقال: إنهم ليتواعدونني بالقتل آنفا، قال: قلنا يكفيكهم الله يا أمير المؤمنين قال: ولم يقتلونني؟ سمعت رسول الله يقول: "لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلاث: كفر بعد إسلام، أو زنا بعد إحصان، أو قتل نفس بغير نفس." فوالله ما زنيت في جاهلية ولا في إسلام قط، ولا أحببت أن لي بديني بدلا منذ هداني الله، ولا قتلتُ نفسا فبم يقتلونني؟))

(سنن ابوداؤد، کتاب الدیات، حدیث:4502)

''سیّدنا ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا، جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد

کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہو جائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کردے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد شخص واجب القتل ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی احادیث صحیحہ کی بنا پر تمام فقہائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔

کتبِ احادیث (جن میں صحیح بخاری بھی شامل ہے) اور معتبر کتبِ تاریخ سے ثابت ہے کہ چاروں خلفاے راشدین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں مرتدین کو ہمیشہ قتل کی سزا دی لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان واقعات کی تفصیل نہیں دے رہے۔

اسی طرح خلفائے بنواُمیہ اور خلفائے بنوعباس نے بھی مرتد پر سزائے قتل نافذ کی۔

اجماعِ امت:

ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:

1۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے فقہی مسائل پر مبنی کتاب "الفقه على المذاهب الأربعة" (از عبدالرحمٰن جزیری) میں ہے کہ:

((واتفق الأئمة الأربعة عليهم رحمة الله تعالىٰ على أن من ثبت ارتداده عن الإسلام ـ والعياذ بالله ـ وجب قتله، وأهدر دمه.))

(الفقه على المذاهب الاربعه، جلد 5، صفحه 423)

'' ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے ...... اللہ

بچائے ...... اُس کا قتل واجب ہے اور اُس کا خون بہانا جائز ہے۔"

2۔ اسلامی فقہ کے اجماعی مسائل پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا 'موسوعۃ الاجماع' میں ہے کہ مرتد کا خون بہانا جائز ہے:

((اتفقوا علی أن من کان رجلا مسلمًا حرًّا .... ثم ارتد إلی دین کفر .... أنه حل دمه.)) (موسوعۃ الاجماع جلد اوّل، ص 436)

"اس پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ آزاد مسلمان مرد مرتد ہو جائے تو اس کا خون بہانا جائز ہے۔"

3۔ اسلامی فقہ کی مشہور کتاب الفقہ الاسلامی وأدلته میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی أحکام المرتد کے تحت مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع اُمت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء علی وجوب قتل المرتد لقوله ﷺ: "من بدّل دينه فاقتلوه." وقوله علیہ السلام: "لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدیٰ ثلاث: الثيب الزاني والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة." وأجمع أهل العلم علی وجوب قتل المرتد.))

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 6، صفحہ 186)

"علما کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کا قتل واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسلمان اپنا دین بدل لے، اسے قتل کردو۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال اور مباح نہیں ہوتا مگر تین صورتوں میں: ایک یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی جان کا قاتل ہو اور تیسرے یہ کہ وہ دین کو چھوڑ دے، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہے۔"

مذکورہ بالا شرعی دلائل کی تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماع اُمت ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ کی رائے:

مرتد کو سزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا دی جاتی ہے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ ''خطبات بہاولپور'' ص333)

مرتد کے لیے سزائے قتل کے عقلی دلائل:

اب تک ہم نے ایسے شرعی دلائل پیش کر دیئے ہیں جن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کی بنیاد احادیث صحیحہ، تعامل صحابہؓ اور اجماع اُمت پر ہے۔ ان شرعی دلائل کو جان لینے کے بعد ایک صاحب ایمان کا دل تو مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہے۔ مگر کیا کیجیے، آج کل بہت سے اہل ایمان کے دلوں کو کسی شرعی حکم کے بارے میں محض شرعی دلائل سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے علاوہ عقلی دلائل بھی چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں شرحِ صدر حاصل ہو۔ اس لیے ہم ذیل میں مرتد کی سزائے قتل کے بارے میں چند عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں:

1۔ سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو انسانی زندگی کا محض ایک جزو یا ضمیمہ بن کر رہے اور جو ہر شخص کا ایک ذاتی اور نجی معاملہ (Private Matter) ہو۔ وہ کوئی لباس بھی نہیں جسے کوئی شخص آج پسند کر کے پہنے اور کل اُسے ناپسند کر کے اپنے جسم سے اُتار پھینکے۔ وہ دراصل ایک دین اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ ایک مکمل ضابطہ حیات (Code of

Life) ہے۔ وہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ایک منظم معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ عبادت، معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، وہ ایک ایسی منظم و منضبط ریاست (Disciplined State) کی تشکیل کا خواہاں ہے جس کا ہر شہری اس کے جملہ احکام وقوانین کی پابندی کرے اور ان کی خلاف ورزی سے باز رہے۔

اب اگر اسلامی ریاست کا کوئی شہری اس کے کسی قانون کو توڑتا ہے تو وہ اپنے شہری کو اپنے قانون کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب ہے۔ جب کوئی مسلمان شہری مرتد ہو جائے گا تو اسلامی ریاست ایسے شخص کو ارتداد (Apostasy) کے جرم کا ارتکاب کرنے پر موت کی سزا دے گی۔ یہ اسلامی ریاست کا قانون ہے اور دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح اسے بھی اپنے قانون کے نفاذ کا اختیار ہے۔

2۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل نہ ہونے والوں اور اس میں داخل ہو کر نکل جانے والوں میں فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو "کفار" اور دوسرے کو "مرتدین" کہتا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو برداشت کرتا اور کچھ حقوق بھی دیتا ہے، مگر دوسرے گروہ کو برداشت نہیں کرتا اور اُسے ہر حق سے محروم رکھتا ہے۔ پہلا گروہ بیگانوں کا ہے اور دوسرا بے وفا یگانوں کا۔ اُسے بیگانوں کی بے مروّتی پر کوئی شکوہ نہیں، مگر اپنوں کی بے وفائی اُسے گوارا نہیں۔ وہ بیگانوں سے محتاط رہتا ہے اور اُن کو اپنا رازدان نہیں بناتا۔ اس لیے بیگانے اُسے زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اپنوں سے اُس کی رازداری ہے جن کے چھوڑ جانے سے اُس کا دل کڑھتا ہے اور اُن کی طرف سے اُسے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ سازش کر کے اُسے کسی بڑے خطرے سے دوچار نہ کر دیں، کیوں کہ "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے" ہے۔

مرتد کا معاملہ اسی دوسری قسم سے متعلق ہے، وہ اسلام کا رازداں ہوتا ہے۔ جب وہ ارتداد کا مرتکب ہو کر دین اسلام سے الگ ہوتا ہے تو اپنے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے

خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات لیے ہوئے اہل کفر کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اُس کے یہ منفی جذبات کفار کی طرف سے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی بڑے خطرے اور سازش کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں، جس کے انسداد کے لیے اسلام نے مرتد کو موت کی سزا سنائی ہے۔

3۔ اسلام نے دنیا کے سامنے سوا چودہ سو برس پیشتر سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کے دائرے میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی ہر شخص کو کھلی آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (البقرة: 256) لیکن اس دائرے میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نکلنے پر پابندی عاید ہے اور جو کوئی اس پابندی کو توڑے گا اُسے موت کے گھاٹ اُتارا جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اسلام کا یہ اعلان سن لینے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے اس کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اپنی آزاد مرضی کے ساتھ اس سے باہر نکلنے پر عائد پابندی کو توڑتا ہے اور پھر اپنی اس حرکت پر اپنے کیے کی سزا پاتا ہے تو بتائیے اس میں اسلام کا کیا قصور ہے؟

4۔ ارتداد کو اسلام کے خلاف سازش کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور مدینے کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ ہتھیار فی الواقع استعمال کیا تھا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ؛

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○﴾ (آل عمران: 72)

”اہل کتاب کا ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے: تم جا کر صبح کو اس (دین) پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر اُترا ہے اور پھر شام کو انکار کر دو تا کہ اس طرح اور (مسلمان) بھی (اپنے دین سے) پھر جائیں۔“

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ سازش کی تھی کہ اپنے ہاں کے کچھ پڑھے لکھے معتبر لوگوں کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل کیا جائے، وہ بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ پھر جلد ہی اسلام کو چھوڑ کر اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔ اس کی ”خرابیاں“

دوسرے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح مسلمانوں بالخصوص نومسلموں کا ایمان متزلزل کیا جاسکے اور وہ اسلام سے برگشتہ ہوجائیں کہ جب پڑھے لکھے معقول حضرات بھی اسلام کے قریب جا کر اس سے بدک جاتے ہیں تو ضرور اس دین میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے عام لوگوں میں اسلام اور اہل اسلام کے لیے کوئی کشش اور ترغیب باقی نہ رہے گی۔ اگرچہ یہودیوں کی یہ سازش بوجوہ ناکام رہی، تاہم آج بھی ارتداد کی کسی سازش کے ذریعے کمزور ایمان والے مسلمانوں کے لیے کسی مقام پر بھی کوئی فتنہ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

5۔ آج کی مہذب ریاستوں کے عام قانون کی رُو سے کسی شخص کو فوجی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جب کوئی شخص اپنی مرضی سے فوجی ملازمت اختیار کرلیتا ہے تو اُسے ایک خاص مدت سے پہلے نوکری چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنی مرضی سے وقت سے پہلے نوکری چھوڑ دے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کا کورٹ مارشل کر کے اسے سزا دی جاتی ہے اور اگر وہ مفرور (Deserter) ہوجائے تو اسے سزائے موت کا مستحق بھی قرار دیا جاتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور اس عالمگیر قانون پر اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس لیے کہ فوج بھیڑوں کا گلہ نہیں ہوتا، وہ ایک منظم ادارہ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کا ایسا نظام ہے جو نظم وضبط (Descipline) کی سختی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سول (Civil) میں جن کاموں کو بالکل معمولی سمجھ کر ان سے اعراض کیا جاتا ہے، وہی کام فوج میں جرائم قرار پاتے ہیں۔ وقت پر حجامت نہ بنوانا، اپنے بوٹ پالش نہ کرنا، اُن کے تسمے نہ باندھنا، وقت پر کھانا نہ کھانا، اپنا بستر درست نہ رکھنا، سول (Civil) میں کوئی جرائم نہیں مگر یہی کام فوج میں جرائم شمار ہوتے ہیں۔

بالکل یہی معاملہ اسلامی ریاست کا ہے، وہ بھی کوئی بکریوں کا ریوڑ نہیں ہوتی کہ جس بکری کا جب جی چاہا ریوڑ سے الگ ہوگئی اور جب چاہا اس میں پھر شامل ہوگئی۔ اسلامی ریاست ایک خدائی فوج (حزب اللہ) ہے جس کے نظم وضبط میں عام فوجی نظم وضبط سے بڑھ

کر سختی اور پابندی ہے۔ عام فوج کے لیے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو دفعہ حاضری ہے، مگر اسلامی معاشرے کے مردوں کو پانچ وقت مسجد میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ارتداد کو جرم قرار دیتی اور مرتد کو سخت ترین سزا دیتی ہے تاکہ اس کا اندرونی نظم و ضبط قائم رہے۔ وہ ایک مرتد کو سزا دے کر اسی طرح اپنے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے ایمان کا تحفظ کرتی ہے جس طرح کسی قاتل کو سزا دے کر پورے معاشرے کی زندگی کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے اس نظم و ضبط کی سختی پر اعتراض کرنے والوں کو پہلے اپنے ہاں کے فوجی نظم و ضبط کی سختی پر غور کر لینا چاہیے اور اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔

⊙ اس مقام پر بعض لوگ (جن میں غامدی صاحب بھی شامل ہیں) یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جب کوئی مرتد مسلح ہو کر بغاوت کرے تو صرف اسی صورت میں وہ واجب القتل ہو سکتا ہے اور اگر وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد اور بغاوت نہ کرے تو اُسے قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

اس اعتراض کا شرعی جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث صحیحہ کی بنیاد پر مرتد کے واجب القتل ہونے پر اجماع ہے، اُن احادیث میں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ مرتد جب تک مسلح بغاوت نہ کرے، وہ قتل کا مستحق نہیں ہے بلکہ ان احادیث میں مرتد کے محض مرتد ہونے پر اس کے لیے قتل کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اور اس اعتراض کا عقلی جواب یہ ہے کہ جس طرح دنیا بھر میں کسی مفرور فوجی کو محض مفرور ہو جانے پر فوجی قانون کی رُو سے موت کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اور اسے یہ سزا دینے کے لیے اُس کی طرف سے مسلح بغاوت ہونا کوئی شرط نہیں، بالکل اسی طرح ایک اسلامی ریاست بھی اپنے شرعی قانون کے مطابق مرتد کو، اس کی طرف سے مسلح بغاوت کیے بغیر بھی موت کی سزا دے سکتی ہے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کا جائزہ:

غامدی صاحب مرتد کے لیے قتل کی شرعی سزا کو نہیں مانتے۔ اس بارے میں اُن کا موقف یہ ہے کہ مرتد کے لیے قتل کی سزا کا حکم تو ثابت ہے مگر یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اُن مشرکین عرب کے ساتھ خاص تھا جو اسلام قبول کر لینے کے بعد ارتداد اختیار کرتے تھے، باقی اور کسی قسم کے مرتد کے لیے قتل کی شرعی سزا کا کوئی وجود نہیں۔ غامدی صاحب اپنے اس موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے: ((من بدل دينه فاقتلوه .)) ...... ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اسے قتل کر دو۔'' ہمارے فقہا اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رُو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ اس معاملے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں اور اگر دی جائے گی تو اس کی مدت کیا ہونی چاہیے؟ فقہائے احناف البتہ، عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ہر مرتد کی سزا خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اسلامی شریعت میں قتل ہے۔''

(برہان، طبع چہارم، جون 2006ء، صفحہ 139)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ؛

''لیکن فقہا کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم تو بیشک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا بلکہ صرف انہی لوگوں کے

ساتھ خاص تھا، جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآنِ مجید میں اُمّیّینَ یا مُشرِکِینَ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔"

(برہان، طبع چہارم، صفحہ 140، جون 2006ء)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں کہ؛

"ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود وتعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کردیا، جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔"

(برہان، صفحہ 143، طبع چہارم، جون 2006ء)

ارتداد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب کے اس موقف کا جائزہ لیا جائے تو ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ؛

1۔ فقہائے اسلام نے صحیح بخاری کی حدیث ((من بدل دینه فاقتلوه .)) ......"جو مسلمان اپنا دین بدل لے تو اُسے قتل کردو۔" کو غلطی سے ایک عام حکم سمجھا ہے، جبکہ یہ ایک خاص حکم ہے۔

2۔ فقہائے اسلام نے مذکورہ بالا ایک ہی حدیث کی بنا پر ہر قسم کے مرتد کے لیے قتل کی سزا بیان کردی ہے۔

3۔ مذکورہ حدیث کی اصل قرآنِ مجید کی ایک آیت سورۃ التوبہ: 5 ہے، جس کے بعد اس حدیث کا حکم خاص ہو جاتا ہے۔

4۔ اسلام کے حدود وتعزیرات میں مرتد کے لیے قتل کی سزا کا کوئی وجود نہیں۔

اب غامدی صاحب کے اس موقف کا ہم تجزیہ کرتے ہیں:

کیا مذکورہ حدیث کا حکم عام نہیں؟

غامدی صاحب مذکورہ حدیث کے حکم کو عام نہیں مانتے جب کہ عربیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے عام مانا جائے۔ اس حدیث: ((من بدل دینه فاقتلوه.)) ......''جو مسلمان اپنا دین بدل لے تو اُسے قتل کردو۔'' میں مَنْ موصولہ کا اُسلوب وہی ہے جو درج ذیل حدیث کا ہے:

((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا.)) (جامع ترمذی، حدیث:1315)

''جس نے دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں۔''

اس حدیث میں بھی مَنْ (جو، جوکوئی، جس نے) موصولہ آیا ہے۔ اور اس کا حکم عام ہے۔ اس سے ہر دھوکہ دینے والا شخص مراد ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے دھوکہ دینے والا کوئی خاص فرد مراد ہے۔ عرب کے دھوکے باز مراد ہیں، اور عجم کے دھوکے باز مراد نہیں ہوسکتے۔

غامدی صاحب نے حدیث: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ .)) میں مَنْ موصولہ کو اس کے عام حکم معنوں میں لینے کی بجائے ''مشرکین عرب'' کے خاص معنوں میں لیا ہے جو کہ عربیت کے بالکل خلاف ہے اور قرآن و حدیث کا جو مفہوم بھی عربیت کے خلاف لیا جائے، وہ غلط ہے کیونکہ یہ قرآن و حدیث کی معنوی تحریف ہے جو قرآن و حدیث کے انکار کے مترادف ہے اور اس حربے سے سارے دین کو دورِ نبوی ﷺ تک محدود کرکے پوری شریعت اسلامیہ کا تیا پانچا کیا جاسکتا ہے اور یہ کارنامہ ہمارے زمانے کے منکرین حدیث، بالخصوص غامدی صاحب بڑی دیدہ دلیری سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ع

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

⊙ البتہ اس مقام پر عربیت کی رُو سے ایک سوال یہ اُٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا اس مَنْ (جو) میں کافر بھی شامل ہے تو اس سوال کے جواب کی وضاحت خود نبی ﷺ نے اپنی دوسری احادیث میں فرمادی ہے کہ اس سے مسلمان مراد ہے۔ مثال کے طور پر ایک متفق علیہ حدیث ہے، جو پیچھے گزر چکی ہے:

((عن عبداللّٰه قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: "لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله الا الله، وأني رسول الله إلا بإحدىٰ ثلاث: النفس بالنفس، والثيب الزاني، والمفارق لدينه التارك للجماعة.)) (صحیح بخاری، رقم:2878)

"سیّدنا عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے مرتد ہو جانے پر اُس کے لیے قتل کی سزا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہونے سے پہلے عرب کا مشرک تھا یا عجم کا کافر تھا۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی سزا ہے۔

کیا مرتد کی سزا کا مبنیٰ صرف ایک ہی حدیث ہے؟

غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ فقہائے اسلام نے صرف صحیح بخاری کی ایک حدیث: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ.)) کی بنیاد پر مرتد کے لیے قتل کی سزا بیان کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ علمی خیانت پر مبنی ہے اور وہ یہ بات عام لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے فرما رہے ہیں۔ فقہائے اسلام کے اس اجماعی فیصلے کی بنیاد صرف ایک حدیث پر نہیں بلکہ متعدد احادیث صحیحہ پر ہے جن کو ہم اس مضمون کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔

غامدی صاحب کا یہ "طریق واردات" کہ کسی مسئلے پر بحث و استدلال کے لیے اس سے متعلق تمام احادیث کو پیش نظر رکھنے کی بجائے بعض حدیثوں کو لے لینا اور بعض کو چھوڑ دینا معروف دیانت دارانہ طریق بحث و استدلال نہیں ہے بلکہ یہ کام اُن کے لیے اپنے مسلمہ اُصول کے بھی خلاف ہے۔ وہ خود مانتے ہیں کہ:

''چوتھی چیز یہ ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس بات کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے لیکن اسی باب کی تمام روایات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہوجاتا ہے۔'' (میزان، صفحہ 64-65 طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، صفحہ 72، طبع دوم فروری 2005ء)

مگر مرتد کی سزا کے معاملے میں اور شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد کے بارے میں غامدی صاحب نے اپنے اس اصول کا بھی خون کردیا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں صرف ایک ہی حدیث کی بنا پر ایک غلط رائے قائم کرلی ہے اور باقی متعلقہ روایات سے چشم پوشی کرلی ہے۔

مذکورہ حدیث کا قرآن سے ربط:

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ فقہائے اسلام نے حدیث ((مَــنْ بَــدَّلَ دِيْـنَـــهٗ فَــاقْتُـلُوْهُ .)) ......''جو مسلمان اپنا دین بدل لے، تو اُسے قتل کردو'' کو قرآن کی اصل سے متعلق نہیں کیا اور قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا اور مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کے نتیجے میں اُنھوں نے مرتد کے لیے ایک ایسی سزا (قتل) قرار دے دی جس کا اسلامی حدود وتعزیرات میں کوئی وجود نہ تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اس حدیث کا ربط قرآنِ مجید کی سورۃ التوبہ کی اس آیت 5 سے جوڑا ہے، جسے ہم اُن کے ترجمے کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

(التوبہ: 5)

''پھر جب حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کردو اور اس

کے لیے ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ہر گھات میں ان کے لیے تاک لگاؤ، لیکن اگر وہ کفر وشرک سے توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو اُنھیں چھوڑ دو۔ بے شک اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

آخر مرتد کے بارے میں مذکورہ حدیث اور اس قرآنی آیت میں کیا ربط و اشتراک ہوسکتا ہے؟ اسے ہر وہ شخص جان سکتا ہے جس نے زندگی میں کبھی ایک مرتبہ بھی قرآنِ مجید کو کھلے ذہن کے ساتھ سمجھ کر پڑھا ہو۔ قرآنِ مجید کی اس آیت کو جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہے، مفسرین حضرات نے مشرکین کے خلاف جہاد وقتال سے متعلق قرار دیا ہے، جب کہ مذکورہ حدیث مرتد کے بارے میں حکم بیان کرتی ہے۔ اب ارتداد کی سزا اور جہاد و قتال کے درمیان کیا باہمی ربط ہے؟ اس عقدے کی گرہ کشائی صرف غامدی صاحب کی عقل و منطق ہی کر سکتی ہے جو قرآن و حدیث کی عبارات میں اپنے خیالات پڑھنے کی عادی ہو چکی ہے۔ علمی دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مرتد کے بارے میں آمدہ حدیث کو قرآنِ مجید کی اُن آیات سے جوڑا جاتا جن میں ارتداد اور مرتدین کا ذکر آیا ہے مگر ایسا دانستہ طور پر نہیں کیا گیا، کیونکہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

قرآنِ مجید میں ارتداد اور مرتدین کا ذکر درج ذیل مقامات پر موجود ہے اور جن کو مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں بیان کیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت: 217 اور سورۃ المائدۃ کی آیت: 54۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے اس جگہ ہم ان میں سے صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کرتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

(البقرۃ: 217)

"اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت ہی میں مرے گا تو اس کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔"

قرآنِ مجید کا یہ مقام اور دوسرے مذکورہ مقامات ایسے ہیں جن کو ارتداد اور مرتدین کے حوالے سے اُن احادیث سے جوڑا جا سکتا ہے جن میں مرتد کے بارے میں کوئی حکم آیا ہے اور غامدی صاحب کے استاد، مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں ان قرآنی مقامات کی وضاحت میں ارتداد اور مرتدین کا ذکر کیا ہے مگر اُنہوں نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 5 میں مرتدین کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، جسے غامدی صاحب خواہ مخواہ مرتد سے متعلق حدیث کے ساتھ جوڑ رہے ہیں۔

کیا مرتد کے لیے قتل اسلامی سزا نہیں؟

غامدی صاحب کے موقف کا آخری نکتہ یہ ہے کہ اسلام کے حدود و تعزیرات میں مرتد کے لیے سزا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ تمام فقہائے اسلام کی مشترکہ اور متفقہ غلطی ہے کہ اُنہوں نے اسے اسلامی حدود و تعزیرات میں شامل کر رکھا ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں مرتد کے لیے سزائے قتل کو احادیث صحیحہ کے نصوص، تعامل صحابہؓ، ائمہ مجتہدینؒ اور تمام فقہائے اسلام کے اجماع سے ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام کے حدود و تعزیرات میں مرتد کے لیے قتل کی سزا کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ اسلامی شریعت، حدیث و سنت اور اجماعِ اُمت کا منکر ہے اور ایسا شخص یقیناً گمراہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سلف سے خلف تک عرب و عجم کے تمام مجتہدین اور فقہائے اسلام عربیت سے ناآشنا، قرآن و حدیث کو سمجھنے سے عاری اور شریعت کے احکام سے ناواقف تھے کہ سب نے مل کر یہ غلطی کر ڈالی کہ مرتد کے لیے سزائے قتل قرار دے دی اور اسلام میں اپنی طرف سے بدعت کے طور پر ایک ایسی شرعی حد داخل کر دی جس کا اسلامی حدود و تعزیرات میں کوئی وجود نہ تھا؟ ایسی بات کہنے کی جسارت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دماغ درست

نہ ہو، جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا نہ ہو اور جسے آخرت کا ڈر نہ ہو۔

3۔ کیا شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگساری) کی حد (سزا) نہیں؟

غامدی صاحب نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد کا بھی انکار کیا ہے۔ حالاں کہ یہ شرعی حد سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

اس سلسلے میں غامدی صاحب اپنا موقف اس طرح بیان کرتے ہیں:

1۔ ''کوئی زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، دونوں کی اصل سزا تو جلد (تازیانہ) ہی ہے۔''

(میزان، حصہ اوّل، صفحہ 183، طبع مئی 1985ء، لاہور)

2۔ ''تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحابِ عقل و بصیرت آخر کس طرح فرض کر لیتے ہیں کہ قرآن میں تو لامحالہ کنوارے زانیوں ہی کی سزا بیان ہوئی ہے، رہے شادی شدہ زانی تو اُن کی سزا چونکہ عقل و حکمت اور عدل و انصاف کی رو سے زیادہ ہونی چاہیے۔ اس لیے قرآن سے نہ بھی ملے تو کسی اور جگہ سے تلاش کر کے وہ ان پر نافذ کر دینی چاہیے۔''

(میزان حصہ اوّل، صفحہ 168، طبع مئی 1985ء)

3۔ ''لغت عرب سے واقف کوئی شخص اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ ''اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي'' کے الفاظ سے محض کنوارا زانی اور کنواری زانیہ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔''

(میزان حصہ اوّل، ص 135، طبع مئی 1985ء)

4۔ ''موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں بھی نہیں دی جا سکتی۔''

(میزان ص 283، طبع دوم، اپریل 2002ء، لاہور)

(میزان ص 611، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

سورۂ نور میں..... زنا کے مرتکبین کے لیے ایک متعین سزا ہمیشہ کے لیے مقرر کر دی گئی۔

5۔ ''زانی مرد ہو یا عورت، اُس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اس کی پاداش میں اُسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔'' (میزان، ص 624، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

اب ہم غامدی صاحب کے اس موقف کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

قرآن میں جرمِ زنا کی سزا:

قرآن حکیم نے زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے آغاز میں یہ سزا بیان کی تھی کہ اگر چار گواہ اس امر کی شہادت دے دیں کہ انہوں نے کسی مرد اور عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو ان دونوں کو مارا پیٹا جائے اور زانیہ عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ○﴾ (النساء: 15)

"اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی طلب کرو۔ اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا کسی موقع پر ان کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکال دے۔"

جرم زنا کی مذکورہ بالا سزا قرآن مجید کا ایک ابتدائی اور عارضی نوعیت کا حکم تھا جس کی طرف " اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا " (ان کے لیے اللہ کوئی راستہ نکال دے گا) کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد سورۂ نور کی آیت 2 میں اس سلسلے کا مستقل حکم نازل ہوا:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾ (النور: 2)

"زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے قانون کے معاملے میں قطعاً کوئی نرمی اختیار نہ کرو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ضروری ہے کہ ان کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔"

اس آیت کے نزول کے بعد سورۂ نساء کے مذکورہ بالا احکام منسوخ ہو گئے۔ اب آئندہ

کے لیے جرمِ زنا کی سزا سو کوڑے مقرر ہوگئی۔

مگر آیت جلد کا یہ حکم درحقیقت کوئی حکم عام نہ تھا جسے غلطی سے غامدی صاحب نے عام حکم سمجھ رکھا ہے کہ اس میں ہر قسم کا مرتکب زنا شامل ہو، کیونکہ قرآن حکیم نے زانیہ لونڈیوں (اور ان کے ساتھ غلاموں) پر اس حکم کا اطلاق نہیں کیا، بلکہ ان کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ (النساء: 25)

''جب وہ لونڈیاں قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر وہ کوئی بدکاری کریں تو ان کے لیے اس سزا کا نصف ہے جو '' **محصنات** ''(آزاد عورتوں) کے لیے مقرر ہے۔''

واضح رہے کہ یہاں پر ''العذاب'' کی جو سزا بیان ہوئی ہے یہ وہی سزا ہے۔ جسے آیت جلد میں عَذَابَهُمَا کہا گیا ہے، اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے قیدِ نکاح میں آئی ہوئی لونڈیوں (اور ان کے ساتھ غلاموں) کے لیے ارتکابِ زنا کی صورت میں نصف سزا یعنی پچاس کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے۔ [1]

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ سورۃ النور کی آیت جلد (2) کا حکم کوئی عام حکم نہیں ہے بلکہ اس کا حکم صرف آزاد زانیوں کے لیے خاص ہے اور جو لوگ اسے عام حکم سمجھ کر اس سے زنا کے ہر مجرم کی سزا سو (100) کوڑے قرار دیتے ہیں ان کی رائے قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ لونڈیوں کے جرمِ زنا کی سزا پچاس کوڑے ہیں۔

پھر سنت نے ان آزاد زانیوں کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ ان میں سے بھی صرف غیر شادی زانی مراد ہیں۔ رہے شادی شدہ آزاد زانی تو ان کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد

[1] غامدی صاحب کی ''علمی دیانت'' کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میزان (ص 481، طبع مئی 2008ء لاہور) میں مذکورہ آیت (النساء:25) درج کرتے وقت بدنیتی سے اس کے بیچ کا وہ ٹکڑا غائب کر دیا ہے جس میں لونڈیوں کے جرمِ زنا پر آدھی سزا بیان ہوئی ہے تاکہ اُن کا موقف قرآن کے خلاف ثابت نہ ہو سکے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کی من مانی تاویلات کے علاوہ اس کی معنوی تحریف سے بھی باز نہیں آتا۔ (مصنف)

(مقررہ سزا) ہے۔

سنت اور سزائے رجم:

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان احادیث صحیحہ کا ذکر کریں گے جن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شادی شدہ آزاد زانیوں پر سو کوڑوں کی بجائے رجم کی سزا نافذ کی۔ اس سلسلے میں ہم پہلے قولِ رسول اور اس کے بعد فعلِ رسول بیان کرتے ہیں:

ا: قولِ رسول اللہ ﷺ!

1۔ ((عن عائشه رضی اللہ عنہا، قالت قال رسول الله ﷺ: " لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله، الا باحدى ثلاث: رجل زنى بعد احصان فانه يرجم ورجل خرج محاربا بالله ورسوله فانه يقتل اويصلب اوينفى من الارض، اويقتل نفسا فيقتل بها.)) (ابو داؤد، كتاب الحدود، حديث: 4353)

"سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کسی مسلمان کا خون مباح نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں مگر تین صورتوں میں اس کا خون مباح ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے، اس جرم پر اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرے تو (اس جرم کی پاداش میں) اسے قتل کیا جائے گا یا اسے پھانسی دی جائے گی یا اسے جلا وطن کر دیا جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے تو اس پر اسے بھی (قصاص کے طور پر) قتل کر دیا جائے گا۔"

2۔ ((عَنْ عبدالله رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله وانى رسول الله، الا باحدى ثلاث:

النفس بالنفس والثیب الزانی، والمارق من الدین التارک الجماعة.)) (صحیح بخاری، کتاب الدیات، حدیث: 6878)

''سیدنا عبداللہ (ابن مسعود رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان کا خون مباح نہیں جب کہ وہ یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین حالتوں میں اس کا خون مباح ہوگا۔ پہلی یہ کہ قصاص کی حالت میں، دوسری یہ کہ شادی شدہ زانی ہونے کی صورت میں اور تیسری یہ کہ دین کو چھوڑنے اور جماعتِ مسلمین سے الگ ہونے کی شکل میں۔''

3۔ ((عن ابی امامة بن سهل: قال: کنا مع عثمان وهو محصور فی الدار، وکان فی الدار مدخل من دخله سمع کلام من علی البلاط فدخله عثمان، فخرج الینا وهو متغیر لونه فقال: انهم لیتواعدوننی بالقتل آنفاً قال: قلنا یکفیکهم الله یا امیر المؤمنین..... قال ولم یقتلوننی؟)) ((سمعت رسول الله ﷺ یقول: "لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث: کفر بعد اسلام او زنا بعد احصان، او قتل نفس بغیر نفس، فوالله ما زنیت فی جاهلیة ولا فی اسلام قط، ولا احببت ان لی بدینی بدلا مُنذ هدانی الله ولا قتلت نفساً، فبمَ یقتلوننی؟.))

(سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، حدیث: 4502)

''سیدنا ابوامامہ بن سہل کہتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے اور اس گھر کا ایک راستہ تھا جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سن سکتا تھا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا، وہ باہر نکلے

اور فرمایا: ''ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔'' ہم نے عرض کیا: ''اے امیر المؤمنین! ان کے مقابل میں اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے۔''
''فرمایا: ''یہ لوگ کیوں میرے قتل کے درپے ہیں۔''
''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت واقع ہو، وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کر لے، یا شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے، یا کسی کو ناحق قتل کر دے۔ خدا کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا بھی پسند نہیں کیا جب سے مجھے اللہ نے ہدایت کی توفیق دی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا، پھر یہ لوگ مجھے کس بنا پر قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

ان تینوں قولی احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ از روئے سنت شادی شدہ کے لیے کوڑوں کی بجائے قتل بصورتِ رجم کی سزا مقرر ہے۔

ب: فعل رسول اللہ ﷺ!

4۔ ((عن ابی ھریرۃ ؓ قال اتی رجل رسول اللہ ﷺ وھو فی المسجد فناداہ فقال یا رسول اللہ ﷺ! انی زنیت، فاعرض عنہ حتی ردّد علیہ اربع مرات، فلما شھد علی نفسہ اربع شھادات۔ دعاہ النبی ﷺ فقال: " أ بک جنون؟ " قال: " لا " قال: " فھل احصنت؟ " قال: " نعم " فقال النبی ﷺ: " اذھبوا بہ فارجموہ.)) (صحیح بخاری، حدیث: 6815)

''سیّدنا ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس آدمی نے آپ ﷺ کو آواز دی اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کا

ارتکاب کیا ہے۔" آپ ﷺ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اس آدمی نے آپ کو چار مرتبہ متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر جب اس نے چار دفعہ قسم کھا کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو نبی ﷺ نے اسے بلا کر پوچھا: "کیا تو پاگل ہے؟ وہ بولا: "نہیں۔" آپ نے پوچھا: "کیا تو شادی شدہ ہے؟ وہ بولا "جی ہاں۔" اس کے بعد نبی ﷺ نے حکم دیا "لوگو! اسے لے جا کر سنگسار کر دو۔"

5. ((عن جابر بن عبداللہ الانصاری أن رجلا من اسلم اتی رسول اللہ ﷺ فحدثه انه قد زنی، فشهد علی نفسه اربع شهادات، فامر به رسول اللہ ﷺ فرجم و کان قد اُحصِنَ.))

(صحیح بخاری، حدیث: 6814)

"حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ پھر اس نے چار دفعہ قسم کھاتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے رجم کیے جانے کا حکم دیا اور پھر اسے رجم کیا گیا اور وہ شخص شادی شدہ تھا۔"

6. ((عن ابی هريرة انه قال اتی رجل من المسلمين رسول اللہ ﷺ وهو فی المسجد فناداه فقال يا رسول اللہ! انی زنيت فاعرض عنه فتنحیّٰ تلقاء وجهه، فقال له يا رسول اللہ! انی زنيت۔ فاعرض عنه حتیّٰ ثنی ذٰلك عليه اربع مرات۔ فلما شهد علی نفسه اربع شهاداتٍ دعاه رسول اللہ ﷺ فقال: أ بك جنون؟ قال: "لا" قال: فهل اَحْصَنْتَ؟ قَالَ: نعم، فقال رسول اللہ ﷺ: اِذهبوا به فارجُموهُ.)) (صحیح مسلم، حدیث: 4420)

"سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس

آیا۔ آپ اس وقت مسجد میں تھے۔ اس شخص نے آواز دی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔" رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے دوبارہ کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔" آپ پھر بھی متوجہ نہ ہوئے یہاں تک کہ اس نے چار دفعہ اپنی بات دہرائی۔ پھر جب اس نے چار مرتبہ قسم کھا کر اپنے جرم کا اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بلا کر پوچھا: "تو پاگل تو نہیں؟" بولا: "نہیں" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تو شادی شدہ ہے؟" وہ بولا: "جی ہاں" (میں شادی شدہ ہوں) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اسے لے جا کر سنگسار کر دو۔"

7۔ ((عن ابی هريرة و زيد ابن خالد الجُهَني انهما قالا ان رجلا من الاعراب اتی رسول الله ﷺ فقال انشدك الله الا قضيت لی بكتاب الله. فقال الخصم الاخر وهو افقه منه، نعم، فاقض بيننا بكتاب الله وائذن لی. فقال رسول الله ﷺ قل! قال ان ابنی كان عسيفا علی هذا فزنی بامراته وانی اخبرت ان علی ابنی الرجم، فافتديت منه بمائة شاة ووليدة. فسالت اهل العلم فاخبرونی انما علی ابنی جلد مائة وتغريب عام وان علی امرءة هذا الرجم، فقال رسول الله ﷺ والذی نفسی بيده لا قضينّ بينكما بكتاب الله، الوليدة والغنم رد وعلی ابنك جلد مائة وتغريب عام، واغدُ يا اُنيس الی امرءة هٰذا، فان اعترفت، فارجمها قال فغدا عليها فاعترفت فامر بها رسول الله ﷺ فرجمت.))

(صحیح مسلم، کتاب الحدود، حدیث: 4435)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد جہنی دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور آکر کہنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ! میں

آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ خدا کی کتاب کے مطابق میرا فیصلہ فرما دیں، اور دوسرا شخص جو پہلے سے زیادہ سمجھ دار تھا کہنے لگا: ''مجھے اجازت دیجئے کہ میں اصل واقعہ بیان کروں۔'' آپ نے فرمایا: ''بیان کرو۔'' وہ بولا: ''میرا لڑکا اس شخص کے ہاں مزدور تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے لڑکے پر رجم کی سزا واجب ہے تو میں نے اس کے فدیے کے طور پر اس آدمی کو ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے، پھر جب میں نے اہل علم لوگوں سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور اس کے ساتھ ایک سال کی جلا وطنی اور عورت پر رجم کی سزا واجب ہے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ لونڈیاں اور بکریاں واپس کر دی جائیں۔ تمہارے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور ایک سال کے لیے جلا وطنی اور اے اُنیس [ایک انصاری صحابی کا نام ہے] اس عورت کے ہاں جاؤ اگر وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو اسے رجم کر دینا، پھر جب وہ (صحابی) اس عورت کے ہاں گئے تو اس نے اعتراف جرم کر لیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اسے رجم کیا گیا۔''

8. ((عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ان رجلا من اسلم جاء الی رسول اللہ ﷺ فاعترف بالزنا فاعرض عنه، ثم اعترف عنه، حتی شهد علی نفسه اربع شهادات، فقال له النبی ﷺ: "أ بك جنون؟" قال: "لا" قال: "احصنت؟" قال: "نعم" قال: فأمر به النبی ﷺ فرجم فی المصلی، فلما اذلقته الحجارة، فر، فادرك، فرجم حتی مات.)) (سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، حدیث: 4430)

''سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کا ایک آدمی رسول

اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے آپ کے سامنے جرمِ زنا کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، اس نے پھر اقرار کیا، اور جب چار دفعہ قسم کھا چکا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا تو پاگل ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''نہیں'' آپ نے پوچھا: ''کیا تو شادی شدہ ہے؟'' وہ بولا: ''جی ہاں'' پھر نبی ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ لوگ اسے عید گاہ کی طرف لے گئے اور رجم کرنے لگے۔ جب اس پر پتھر پڑے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے تعاقب کر کے اسے پھر جا لیا اور سنگسار کر دیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔''

ان تمام فعلی احادیث کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سنت نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا مقرر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مقدماتِ زنا میں ملزم کے عاقل ہونے کے ساتھ ان کی حالتِ احصان (شادی شدہ ہونے) کو بھی منجملہ ان شرائط کے پیشِ نظر رکھا ہے جن کی تحقیق کے بعد آپ نے حدِ رجم کا نفاذ فرمایا ہے۔ دورِ رسالت کے درجن بھر مقدماتِ زنا میں سے کسی ایک مقدمۂ زنا کی روداد میں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ:

1۔ آپ ﷺ نے ملزم کی ''غنڈہ گردی بدمعاشی یا اوباشی'' کا اثبات فرمانے کے بعد اس پر رجم کی سزا نافذ کی ہو۔

2۔ نہ ایسی کوئی حدیث ملتی ہے جس میں آپ نے کسی کنوارے زانی کو اس کے ''غنڈہ، بدمعاش یا اوباش'' ہونے کی بنا پر رجم کی سزا دی ہو۔

3۔ کوئی ایک حدیث بھی اس بات کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی جس میں رسول اللہ ﷺ نے کسی شادی شدہ زانی کو رجم کی بجائے صرف سو کوڑوں کی سزا دی ہو۔

میں غامدی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کے حق میں کوئی حدیث پیش کر دیں جس سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہو۔ لہٰذا یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا سنت کی نص سے ثابت ہے۔

اجماعِ امت اور سزائے رجم:

اس بات پر تمام اہل علم، مفسرین اور فقہائے اسلام کا اجماع ہے کہ سنت کی رُو سے ہر شادی شدہ زانی پر حدِ رجم واجب ہے اور قرآن مجید میں زنا کے جرم پر جو سو (100) کوڑوں کی سزا بیان ہوئی ہے وہ غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے سزا ہے۔

1۔ ائمہ مجتہدین کی متفقہ رائے:

کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں ائمہ اربعہ کی متفقہ رائے اس بارے میں یہ بیان ہوئی ہے:

((اتفق الائمة علی ان من کملت فیه شروط الاحصان ثم زنا بامرءة قد کملت فیها شروط الاحصان بان کانت حرة بالغة عاقلة مدخولا بها فی نکاح صحیح وهی مسلمة۔ فهما زانیان محصنان یجب علی کل واحد منهما الرجم حتی یموت.))

(کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه از عبدالرحمٰن جزیری، جلد پنجم، کتاب الحدود)

''ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص میں احصان کی سب شرطیں پائی جائیں اور پھر وہ کسی ایسی عورت سے زنا کا مرتکب ہو جس میں بھی احصان کی تمام شرائط موجود ہوں یعنی وہ آزاد بالغہ عاقلہ ہو اور نکاحِ صحیح کے بعد مدخولہ ہو چکی ہو اور مسلمان بھی ہو۔ تو ایسے شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانیہ میں سے ہر ایک کو رجم کرنا واجب ہے۔''

2۔ ہدایۃ المجتہد میں ہے کہ:

((فإن الثیب الاحرار المحصنون فان المسلمین اجمعوا علی ان حدهم الرجم.)) (ابن رشد، هدایة المجتهد ج2، ص 426)

''رہے آزاد شادی شدہ زانی تو اس بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ان کے لیے رجم کی حد واجب ہے۔''

3۔ مشہور محدث وفقیہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

((اجمع العلماء وجوب جلد الزاني البكر مائة ورجم المحصن وهو الثيب.))

''علمائے امت کا اس پر اجماع ہے کہ کنوارے زانی پر سو کوڑے اور شادی شدہ زانی پر حدِ رجم واجب ہے۔'' (شرح صحیح مسلم از امام نوویؒ، جلد دوم)

4۔ اسلامی فقہ کی مشہور و معتبر کتاب 'الفقه الاسلامی وادلته'' میں الدکتور وہبہ زہیلی لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء على أن حد الزاني المحصَن هو الرجم.... بدليل ما ثبت في السنة المتواترة واجماع الامة، والمعقول.))

(الفقه الاسلامی وادلته، ج6، ص 40)

''علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد ہے..... جو سنت متواترہ، اجماع امت اور عقل وحکمت سے ثابت ہے۔''

5۔ امت کے اجماعی مسائل کی مشہور کتاب ''موسوعة الاجماع في الفقه الاسلامی'' میں ہے کہ:

((ان المسلمين اجمعوا على أن الزاني المحصَن، اذا زنى عامدًا، عالـمًا، مختارًا، فحدُّه الرَّجْمُ حتى يموت....وقد اتفقوا على أن الاحصان شرط للرجم.))

(موسوعة الاجماع في الفقه الاسلامی، ج1، ص322 طبع دمشق)

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جب کوئی شادی شدہ شخص جان بوجھ کر دانستہ اپنی مرضی سے زنا کرے تو اس کی حد (سزا) رجم یعنی سنگساری ہے یہاں تک کہ وہ مر جائے۔''

بائبل کا حوالہ:

زنا چونکہ کئی جرائم کا مجموعہ بلکہ ام الجرائم ہے۔ اس لیے تمام الہامی مذاہب میں زنا کو گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے۔ چنانچہ بائبل میں زنا (Adultery) کی سزا قتل بیان ہوئی ہے کہ:

> ''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔'' (استثناء 22:22)

مولانا شبلی نعمانی کی رائے:

احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو دُرّے اور بیاہوں کے لیے رجم کا حکم ہے۔ (سیرت النبیؐ، جلد دوم، ص 84۔ طبع 2001ء مکتبہ مدنیہ لاہور)

ایک عقلی دلیل:

عقل و حکمت اور عدل و انصاف کی رُو سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جرمِ زنا کی سزا کے بارے میں اسلام کا منشا کیا ہے؟ اسلامی شریعت نے ایک ایسے شخص کے ارتکابِ زنا میں کہ جس کو اپنی فطری جنسی خواہش پوری کرنے کا کوئی جائز ذریعہ حاصل نہیں ہو سکا ...... اور ایک ایسے شخص کے ارتکابِ زنا میں کہ جس کو اس کی فطری صنفی خواہش پوری کرنے کا ایک جائز ذریعہ میسر آ چکا ہے ...... بہر حال فرق کیا ہے اور دونوں کی حالتوں کے اختلاف کی بنا پر ان کے لیے الگ الگ سزائیں مقرر کی ہیں۔

فرض کیجیے دو عورتیں زنا کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایک کنواری اور دوسری شادی شدہ عورت ہے۔ پہلی عورت اپنی جنسی خواہش کے ہیجان میں تسکین کا کوئی جائز راستہ نہیں پاتی اور زنا کا ارتکاب کرتی ہے۔ دوسری عورت ایک شوہر کی بیوی ہے۔ اگر اس کا شوہر اس کے لیے وجہِ تسکین نہیں بنتا تو وہ عورت اس سے خلع لے کر کسی اور مرد سے نکاح بھی کر سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایک خاوند کی بیوی ہوتے ہوئے مرتکبِ زنا ہوتی ہے تو اس کا یہ فعل اس کے شوہر کی حق

تلفی، اس سے بدترین خیانت اور پرلے درجے کی بے وفائی ہے۔ اس نے اپنے خاوند سے باندھے ہوئے اس معاہدے کا سرِ عنوان مٹا ڈالا ہے جس معاہدے کو قرآن مجید نے ''میثاقِ غلیظ'' یعنی پختہ معاہدے سے تعبیر کیا ہے۔ کیا ان دونوں عورتوں کا مقدمہ ایک جیسا ہے؟ نہیں! ہماری عقل ان کو دو مختلف مقدمے قرار دیتی ہے کیا ان دونوں عورتوں کا جرمِ زنا ایک ہی درجے کا ہے؟ نہیں! ہماری بصیرت کہتی ہے کہ دونوں کا جرم یکساں درجے کا نہیں ہے بلکہ الگ الگ درجے کا ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کیا، ان دونوں کو ایک جیسی سزا ملنی چاہیے؟ ہرگز نہیں! عدل وانصاف کا تقاضا یہ ہے کہ چونکہ کنواری عورتوں کا جرم نسبتاً کم ہے اور شادی شدہ عورت کا نسبتاً زیادہ، لہٰذا سزا میں بھی یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کیا ایک فطری اور عقلی شریعت کے لیے یہ امر ضروری نہیں کہ وہ پہلی مجرمہ کو نسبتاً کم اور دوسری مجرمہ کو نسبتاً زیادہ سزا دے؟

اسی حکمت کے پیشِ نظر اسلامی قانون میں غیر شادی شدہ زانی اور غیر شادی شدہ زانیہ کے لیے تو سو سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی ہے مگر شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانیہ کے لیے رجم کی حد رکھی گئی ہے۔ دو مختلف صورتوں کو یکساں حیثیت دے کر ان کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرنا کسی طور پر بھی عقل وحکمت اور عدل وانصاف کے قرینِ قیاس نہیں ہے اور جو لوگ شریعت کے تمام تر احکامات کو عقل وحکمت پر مبنی قرار دیتے ہیں ان کے لیے تو اس سے انکار کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی قانون میں شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد مقرر ہے اور اس سزا کی تائید میں قرآن مجید کے قرائن وشواہد ملتے ہیں، اس کے ثبوت میں سنت نبویہ کے نصوص موجود ہیں، اس کی حمایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا تعامل شامل ہیں، اس پر ائمہ مجتہدین متفق ہیں، اس کے بارے میں امت کے فقہاء، محدثین اور مفسرین کے درمیان اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے اور اس پر قرنِ اول سے لے کر آج تک امت کا عملی تواتر اور اجماع ہے۔ لہٰذا ایسے منصوص، متواتر اور اجماعی معاملے میں اختلافِ رائے کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ ایسا اختلافِ رائے گمراہی اور ضلالت کے سوا کچھ نہیں اور یہ محض انکار

حدیث کا شاخسانہ ہے۔

4۔ چوری کے جرم پر حد

چوری کے جرم اور اس کی سزا کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (المائدۃ : 38)

''اور چور مرد ہو یا عورت ہو، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہی ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا بھی۔ اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔''

لیکن قرآن مجید کے اس حکم کے باوجود غامدی صاحب ایک تو چوری کے کم سے کم نصاب کو نہیں مانتے، دوسرے وہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنے کی سزا کو سنت سے اخذ کرنے کی بجائے اپنے اجتہاد سے قرآن کے اندر سے برآمد کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''قطع ید' ہاتھ کاٹ دینے کی یہ سزا چور مرد اور چور عورت کے لیے ہے۔ قرآن نے اس کے لیے 'سارق' اور 'سارقۃ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ عربی زبان کے اسالیب بلاغت سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ یہ صفت کے صیغے ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا اطلاق فعل سرقہ کی کسی ایسی ہی نوعیت پر کیا جا سکتا ہے جس کے ارتکاب کو چوری اور جس کے مرتکب کو چور قرار دیا جا سکے۔''

قطع ید کی یہ سزا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ہے۔ لہٰذا مجرم کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دینے میں عمل اور پاداش عمل کی مناسبت جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اسی طرح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے، اس لیے کہ انسانوں میں آلۂ کسب کی حیثیت اگر غور کیجیے تو اصلاً اسی کو حاصل ہے۔

(میزان، ص 629، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ:

1۔ 'سارق' اور 'سارقہ' صفت کے ایسے صیغے ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔

2۔ یہ عمل اور پاداش عمل کی مناسبت کا تقاضا ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے اور اس کا مزید تقاضا یہ ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے۔

اب ہم غامدی صاحب کے اس موقف کا ترتیب وار علمی جائزہ لیں گے۔

1۔ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے کہ 'سارق' اور 'سارقہ' صفت کے ایسے صیغے ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ لغت کے مشہور امام (جسے غامدی صاحب بھی امام اللغۃ لکھتے ہیں) علامہ زمخشری نے اپنی تفسیر 'الکشاف' میں 'وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ' کے یہ معنی لکھے ہیں:

وَالَّذِیْ سَرَقَ وَالَّتِیْ سَرَقَتْ ، یعنی جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علامہ زمخشری کے نزدیک 'سارق' اور 'سارقہ' صفت کے ایسے صیغے نہیں ہیں جو وقوع فعل میں اہتمام پر دلالت کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ان الفاظ سے صرف وقوع فعل مراد لیتے ہیں کہ ''جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے۔''

حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید نے مطلق حکم دیا ہے کہ چور مرد اور چور عورت کے ہاتھ کاٹ دو مگر اس میں یہ مذکور نہیں ہے کہ کتنی مالیت کی چوری پر حد جاری ہوگی۔ صحیح حدیث میں چوری کا نصاب ایک ڈھال کی قیمت ہے۔ چوری کی گئی چیز کی مالیت اگر اس کے برابر ہوگی تو اس پر ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اسی پر قریب قریب تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے۔ لیکن چونکہ غامدی صاحب نہ تو حدیث کو دین کا حصہ مانتے ہیں اور نہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی مطلق حکم کی تحدید کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ حدیث سے ثابت شدہ کسی حکم کو شرعی حکم قرار دیتے ہیں اس لیے وہ خود عقل کل بن کر چوری کی تعریف کرتے اور اس کا نصاب مقرر کرتے ہیں۔

2۔ غامدی صاحب کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ عمل اور پاداش عمل کی مناسبت کا پہلا تقاضا یہ

ہے کہ چور کا ہاتھ ہی کاٹا جائے اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عمل اور پاداش عمل کی مناسبت کا تقاضا اور فلسفہ نہیں ہے بلکہ فقط اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو چور کے لیے سزائے قتل کا حکم بھی دے سکتا تھا اور وہ بھی عمل اور پاداش عمل کی مناسبت ہو سکتی تھی۔

رہی یہ بات کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے تو یہ بھی عمل اور پاداش عمل کی مناسبت کا تقاضا اور فلسفہ نہیں ہے بلکہ یہ حدیث وسنت سے ایک ثابت شدہ حکم ہے اور اسی پر اجماع امت ہے کہ چور کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے اور وہ دوبارہ چوری کرے تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ ڈالا جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بائیں ہاتھ سے چوری کرے تو کیا غامدی شریعت کے فلسفہ قانون کے مطابق اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ آلۂ کسب یہی تھا؟

آخر میں غامدی صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ دوسروں کو عربی زبان کے اسالیب بلاغت سمجھانے سے پہلے خود عربی زبان میں واحد، تثنیہ اور جمع ہی کا فرق سیکھ لیں۔ قرآن مجید میں چور مرد اور چور عورت کے بارے میں یہ الفاظ نہیں آئے ہیں کہ 'فَاقْطَعُوْا يَدَيْهِمَا (پس تم ان دونوں کے دو ہاتھ کاٹ دو) بلکہ قرآن مجید میں فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا کے الفاظ آئے ہیں جن کا اصل ترجمہ یہ ہوگا کہ 'پس تم ان دونوں کے سارے ہاتھ کاٹ دو۔' کیونکہ 'اَيْدِي' جمع ہے يَدٌ (ہاتھ) کی اور جمع کا اطلاق عربی زبان میں کم سے کم تین کے عدد پر ہوتا ہے دو کے عدد پر نہیں ہوتا۔ تو کیا غامدی صاحب، جو حدیث کے بغیر قرآن کی تفسیر محض لغت سے اور الفاظ کے صرف معروف معنی لینے کے قائل ہیں، کبھی یہ فتویٰ دینے کی جسارت کر سکتے ہیں کہ اسلام میں قرآن کی رو سے چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں؟ کیونکہ قرآن مجید کے صریح حکم کا تقاضا یہی ہے۔

5۔ اسلام میں سزائے موت کا قانون

اسلامی شریعت میں کئی جرائم مثلاً قتل، ڈاکہ (حرابہ) ارتداد، شادی شدہ شخص کے زنا

کرنے، جادو کرنے اور توہین رسالت وغیرہ پر موت کی سزا کا قانون موجود ہے مگر غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ 'قتل اور فساد فی الارض' کے سوا کسی جرم میں موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ گویا ان کے نزدیک صرف دو ہی ایسے جرائم ہیں جن پر اسلام میں موت کی سزا دینا جائز ہے۔ ان کے علاوہ اگر کسی اور جرم میں موت کی سزا دی جائے گی تو وہ نہ صرف غیر اسلامی ہوگی بلکہ ایسی سزا دینے والا آخرت میں ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہے گا۔

اپنے اس موقف کے بارے میں غامدی صاحب اپنی کتاب 'میزان' میں ''حدود وتعزیرات'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کو شریعت دی گئی تو اسی وقت لکھ دیا گیا تھا کہ ان دو جرائم کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے۔ مائدہ میں ہے:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ (المائدة: 32)

''جس نے کسی کو قتل کیا، اس کے بغیر کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو اس نے گویا سب انسانوں کو قتل کیا۔''

(میزان، ص611، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

ایک اور مقام پر انسانی جان کی حرمت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پانچواں حکم یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو قتل نہ کرے۔ مذہب و اخلاق کی رو سے انسانی جان کو جو حرمت ہمیشہ سے حاصل رہی ہے، یہ اسی کا بیان ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اس کے بارے میں یہی تاکید اس سے پہلے بنی اسرائیل کو کی گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے یہ بات ان پر لکھ دی تھی کہ ایک انسان کا قتل درحقیقت

پوری انسانیت کا قتل ہے۔ تالمود میں یہ فرمان کم وبیش انھی الفاظ میں آج بھی موجود ہے۔ سورۂ مائدہ میں قرآن نے اسی کا حوالہ دیا ہے:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَ مَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ (المائدۃ: 32)

''اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی انسان کو بچایا، اس نے گویا تمام انسانوں کو بچالیا۔''

اس فرمان سے واضح ہے کہ کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسری یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ زمین میں فساد پھیلانے کی تعبیر یہاں اسی مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ اس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جس کی سزا قرآن کی رو سے ابدی جہنم ہے۔''

(میزان، ص228، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کی رائے میں:

1۔ اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں موت کی سزا نہیں دی جا سکتی۔

2۔ فساد فی الارض سے مراد نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہونا۔

3۔ قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم پر کسی کی جان لینا ایسا ناحق قتل ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

اب ہم ان امور کا تفصیلی جائزہ لیں گے:

1۔ کیا اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم میں موت کی سزا نہیں دی جاسکتی؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں موت کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے علاوہ کئی اور جرائم مثلاً ڈاکہ، ارتداد اور کسی شادی شدہ شخص کے جرم زنا پر بھی موت کی سزا دی جاسکتی ہے اور اسی پر امت مسلمہ کا اتفاق اور اجماع ہے۔

کیا امت مسلمہ بنی اسرائیل کی شریعت کی پابند ہے؟

غامدی صاحب نے اپنے موقف کے حق میں پہلے تو بنی اسرائیل کی شریعت کو امت مسلمہ پر لاگو کر دیا ہے جب کہ ہر امت کو الگ الگ شریعت دی گئی تھی اور کوئی امت کسی دوسری امت کی شریعت کی پابند نہ تھی۔ امت مسلمہ کو آخر میں کامل اور عالمگیر شریعت دی گئی ہے اور وہ بنی اسرائیل کی نامکمل اور محدود شریعت کی ہرگز پابند نہیں رہی کیونکہ تورات منسوخ ہو چکی ہے اور اس کا ناسخ قرآن مجید موجود ہے۔

غامدی صاحب کے استاد مولانا امین اصلاحی بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ تمام نبیوں اور ان کی امتوں کے لیے دین ایک ہی تھا مگر سب کی شریعت الگ الگ تھی۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر تدبر قرآن کے ایک مقام پر ''مختلف امتوں کی شریعت کے اختلاف کی حکمت'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

> ''جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے تا کہ یہ چیز امتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے۔''

(تدبر قرآن، ج2، ص535، مطبوعہ 1983ء لاہور)

لہٰذا بنی اسرائیل کی شریعت سے امت مسلمہ کے لیے اسلامی شریعت کشید نہیں کی جا سکتی۔

2۔ پوری آیت نہ لکھنا:

غامدی صاحب نے پہلے حوالے میں متعلقہ پوری آیت نہیں لکھی تا کہ وہ اپنے قارئین کو مغالطہ اور فریب دے سکیں جب کہ پوری آیت یہ ہے:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ۝﴾

(المائدۃ: 32)

''اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل کے لیے لکھ دیا کہ جس نے کسی کو بغیر قصاص کے یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے کی سزا کے قتل کر دیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر ڈالا، اور جس نے کسی ایک شخص کی جان بچائی، اس نے گویا سارے انسانوں کی جان بچائی۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر واضح احکام لے کر ان کے پاس آئے مگر اس کے باوجود ان میں سے اکثر لوگ زمین میں زیادتیاں کرتے رہے۔''

یہ اصل آیت ہے جس کا من پسند ٹکڑا الگ کر کے غامدی صاحب نے اس سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرما دیا ہے کہ دو جرائم قتل اور فساد فی الارض کو چھوڑ کر موت کی سزا نہیں ہے۔

گویا اس مقام پر غامدی صاحب نے اسی طرح قرآن کی معنوی تحریف کی ہے جیسے کوئی شخص قرآن مجید کی سورۃ النساء آیت 43 کی درج ذیل عبارت:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى....﴾

(النساء: 43)

''اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم نشے کی حالت میں ہو۔''

میں سے اس کے آخری الفاظ ''وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی'' (جب کہ تم نشے کی حالت میں ہو) حذف کر کے اس سے یہ مطلب نکالے کہ قرآن مجید مسلمانوں کو نماز کے قریب جانے سے روکتا ہے۔

ظاہر ہے ایسی جسارت صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو اور جسے آخرت کی جوابدہی کا احساس نہ ہو۔

مذموم تفسیر بالرائے کا ارتکاب:

غامدی صاحب نے اسلامی شریعت میں موت کی سزا کے قانون پر بحث کرتے ہوئے ایک کمال تو یہ دکھایا کہ جس آیت کو دلیل کے طور پر پیش کیا وہ پوری نہیں لکھی۔ پھر ان کا دوسرا کمال یہ ہے کہ جس آیت کا تعلق بنی اسرائیل کی شریعت سے تھا اسے امت مسلمہ کی شریعت بنا کر پیش کر دیا۔ پھر اس آیت میں سرے سے سزائے موت کا ذکر تک نہیں ہے مگر غامدی صاحب اس سے نہ صرف سزائے موت کا مضمون نکال رہے ہیں بلکہ وہ اپنی طرف سے پورے حصر کے ساتھ یہ تحدید (Limitation) بھی فرما رہے ہیں کہ یہ سزائے موت صرف اور صرف دو ہی جرائم (قتل اور فساد فی الارض) پر دی جاسکتی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ.

حالانکہ اس طرح کی کوئی تحدید بھی مذکورہ آیت میں کہیں بیان نہیں ہوئی۔ یہ کرشمہ ہے قرآن کی آیات میں اپنے ذاتی خیالات پڑھنے کا، قرآن کی من مانی تفسیر کرنے کا اور انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کا۔ غالباً اقبال مرحوم نے ایسے ہی رویے کے بارے میں کہا تھا ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

اور وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ ؎

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبریلؑ و مصطفیٰؐ را

(ان نام نہاد مفسروں کی ایسی عجیب وغریب تاویلیں خود اللہ تعالیٰ، حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو بھی حیران کر دیتی ہیں)

اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے اپنے دعوے کے حق میں جس آیت کا حوالہ دیا اس کا تعلق بھی یہودیوں کے قصاص کے قانون سے نہیں ہے بلکہ اس قانون کے فلسفہ وحکمت سے ہے، جب کہ یہودیوں کے قصاص کا قانون قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ٥﴾ (المائدۃ: 45)

''ہم نے ان (یہودیوں) کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح زخموں کا ویسا ہی بدلہ لینا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی ظالم ہیں۔''

سورۃ المائدہ کی جس آیت سے غامدی صاحب نے موت کی سزا کو صرف دو جرائم تک محدود کر دیا ہے، اس آیت کو دوسرے تمام مفسرین کی طرح ان کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی بھی اسلامی حدود وتعزیرات کا ماخذ نہیں مانتے بلکہ انہوں نے بھی اس آیت کے مضمون کو یہودیوں سے متعلق قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں مذکورہ آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

﴿اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾

یہ اس اصل حکم کا بیان نہیں ہے جو قصاص کے باب میں یہود کو دیا گیا بلکہ اس کی دلیل

اور اس کی حکمت و عظمت بیان ہوئی ہے۔ ''جان کے بدلے جان'' کا قانون تورات میں بھی ہے اور اس کا حوالہ سورۂ میں آگے آرہا ہے۔ یہاں چونکہ مقصود یہود کی شرارت وشقاوت کو نمایاں کرنا ہے، اس وجہ سے قانون قصاص کا اصل فلسفہ بیان فرمایا گیا۔ یہود پر قتل نفس کی سنگینی واضح کرنے کے لیے ان کو یہ حکم اس تصریح کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ٹھہرے گا۔ لیکن پھر وہ قتل اور فساد فی الارض کے معاملے میں بالکل بے باک ہوگئے۔'' (تدبر قرآن، ج2، ص503، طبع مئی 1983ء لاہور)

لہٰذا یہ غامدی صاحب کی تحریفِ قرآن اور مذموم تفسیر بالرائے کا شاخسانہ ہے کہ انہوں نے سورۂ المائدہ کی مذکورہ آیت کو اس کے سیاق کلام (Context) سے کاٹ کر اس کا صرف ایک تہائی ٹکڑا لکھ کر اس سے وہ معنی نکالے جو ان کے استاد سمیت آج تک کوئی مفسر نہ سمجھ سکا کہ اسلام میں موت کی سزا صرف دو جرائم پر دی جا سکتی ہے اور یہ کہ ''اللہ تعالیٰ نے اسے پوری صراحت'' سے بیان فرما دیا ہے جس کے بعد کسی فرد یا حکومت کو دو جرائم (قتل اور فساد فی الارض) کے سوا کسی اور جرم میں موت کی سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔ جب کہ اہل علم جانتے ہیں کہ قتل کے قصاص کا قانون تو سورۂ البقرہ کی آیت 178 میں بیان ہوا ہے اور محاربہ (ڈاکے) کی سزا کا قانون سورۂ المائدہ کی آیت 33 میں مذکور ہے۔

احادیث صحیحہ یعنی سنت کا انکار:

غامدی صاحب جب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تو اس وقت وہ احادیث صحیحہ یعنی سنت کے منکر بھی ٹھہرتے ہیں اور توہین رسالت بھی کرتے ہیں۔

کیونکہ اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح احادیث یعنی سنت کی رو سے مرتد کے لیے موت کی سزا مقرر ہے اور اسی طرح سنت ہی کی رو سے شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کے ذریعے موت کی حد بھی مقرر ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب نے ایک ہی سانس میں مذکورہ دعویٰ کر کے ان دونوں سنت سے ثابت شدہ شرعی سزاؤں کا انکار کر دیا ہے حالانکہ ان دونوں سزاؤں

پر اجماع امت موجود ہے۔

اجماع امت کا انکار:

غامدی صاحب نے اپنے مذکورہ دعوے کے ذریعے اجماع امت کا بھی انکار کیا ہے کیونکہ اس پر اجماع امت نہیں ہے کہ اسلام میں موت کی سزا صرف دو جرائم ہی پر دی جا سکتی ہے بلکہ اس پر اجماع امت ہے کہ شریعت میں کئی جرائم مثلاً قتل، ڈاکے، ارتداد، جادو، توہین رسالت اور شادی شدہ شخص کے زنا پر موت کی سزا مقرر ہے۔

2۔ فساد فی الارض سے کیا مراد ہے؟

غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی رو سے فساد فی الارض ایک جرم ہے جس پر قتل کی سزا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ بالکل بے اصل اور جہالت پر مبنی ہے کیونکہ قرآن کی رو سے 'فساد فی الارض' سرے سے کوئی متعین جرم ہی نہیں ہے کہ اس کی سزا قتل ہو۔

مثال کے طور پر ناپ تول میں کمی کرنے کو بھی قرآن میں 'فساد فی الارض' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم اہل مدین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ٥﴾ (ھود: 85)

''اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد کرنے والے بن کر نہ دندناتے پھرو۔''

اس مقام پر ناپ تول میں کمی کو 'فساد فی الارض' کہا گیا ہے۔ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ اسی نقطہ سے حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور پھر اپنی قوم کی اس برائی کی طرف توجہ دلائی جو پوری قوم میں نہ صرف یہ

کہ عام ہو چکی تھی بلکہ وہ برائی کے بجائے ہنر اور قابلیت اور حق وصواب سمجھی جانے لگی تھی۔ ان کی قوم...... اہل مدین...... تجارت پیشہ قوم تھی۔ اس وجہ سے ان کا فسادِ مزاج سب سے زیادہ اسی میدان میں ابھرا اور ناپ تول میں کمی کرنے کو اپنا پیشہ ورانہ ہنر بنا لیا۔ اس فن کے ایک سے ایک بڑھ کر ماہران میں پیدا ہونے لگے اور کسی کے اندر اس امر کا احساس بھی باقی نہ رہا کہ یہ ترقی و کامرانی کی راہ نہیں بلکہ فساد فی الارض کی راہ ہے۔''

(تدبر قرآن، ج4،ص160، طبع نہم2003ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی بھی اس آیت کی رو سے ناپ تول میں کمی کو 'فساد فی الارض' قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح قرآن میں چوری کو بھی 'فساد فی الارض' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ سورۃ یوسف علیہ السلام میں برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے یہ بیان ہوا کہ:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ﴾ (یوسف : 73)

''انہوں (یوسف علیہ السلام کے بھائیوں) نے کہا اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے کہ ہم لوگ زمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور نہ ہم چور ہیں۔''

اس مقام پر برادران یوسف علیہ السلام نے چوری کرنے والوں کو 'زمین میں فساد کرنے والے' قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی کوئی تردید نہیں فرمائی جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزدیک چوری بھی 'فساد فی الارض' ہے جب کہ اس جرم پر قتل کی سزا نہیں بلکہ صرف ہاتھ کاٹنے کی حد مقرر کی گئی ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی تو چوری کے علاوہ ''علو و استکبار'' یعنی تکبر کو بھی 'فساد فی الارض' کا جرم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فساد فی الارض کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ زمین میں

فساد صرف چوری، رہزنی اور ڈکیتی ہی نہیں ہے۔ یہ تو محض اس کے بعض مظاہر ہیں۔ اصل فساد علو واستکبار ہے۔ استکبار کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے حدودِ بندگی سے تجاوز کر کے خدا کے حدود وحقوق میں مداخلت کرے۔ جو لوگ اس جرم کے مرتکب ہیں وہ مفسدین فی الارض میں شامل ہیں۔''

(تدبر قرآن، ج5،ص709،طبع اول،1983ء لاہور)

پھر جب 'فساد فی الارض' کوئی متعین جرم ہی نہیں ہے اور نہ اس کی سزا قتل بیان کی گئی ہے اور ناپ تول میں کمی، چوری اور تکبر کو بھی فساد فی الارض قرار دیا گیا ہے۔ اور ان کی سزا بھی اسلام میں قتل بیان نہیں ہوئی ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ خود غامدی صاحب کے استاد مولانا اصلاحی اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں 'فساد فی الارض' کو قرآن کی ایک مخصوص اصطلاح قرار دیتے ہوئے اس کی درج ذیل مختلف وضاحت کرتے ہیں کہ:

''فساد فی الارض، قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم اس نظامِ حق کو بگاڑنا یا اس کو بگاڑنے کی کوشش کرنا ہے جو اللہ واحد کی عبادت اور اس کے احکام وقوانین کی اطاعت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی دعوت انبیائے کرام لے کر آتے ہیں۔'' (تدبر قرآن، ج1 ص119،طبع اول، مئی 1983ء لاہور)

جبکہ غامدی صاحب 'فساد فی الارض' کی قرآنی تعبیر کا یہ مفہوم بتاتے ہیں کہ:

''دوسری یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ زمین میں فساد پھیلانے کی تعبیر یہاں اسی مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔'' (میزان،ص228،طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ جس جرم، کی سزا قتل ہونے کا غامدی صاحب دعویٰ کرتے ہیں اس جرم کی نوعیت اور تعریف سے ان کے اپنے استاد بھی متفق نہیں ہیں۔

کیا قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم پر کسی کی جان لینا ایسا ناحق قتل ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم پر کسی کی جان لینا ایسا ناحق قتل ہے جس کی سزا ابدی جہنم ہے، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ:

> ''کسی انسان کی جان دو ہی صورتوں میں لی جا سکتی ہے، ایک یہ کہ وہ کسی کو قتل کر دے، دوسری یہ کہ نظم اجتماعی سے سرکشی کر کے وہ دوسروں کی جان و مال اور آبرو کے درپے ہو جائے۔ زمین میں فساد پھیلانے کی تعبیر یہاں اسی مفہوم کے لیے اختیار کی گئی ہے۔ اس کے سوا ہر قتل ایک ناحق قتل ہے جس کی سزا قرآن کی رو سے ابدی جہنم ہے۔'' (میزان، ص228، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا مذکورہ دعویٰ نہ صرف جہالت اور شرارت پر مبنی ہے بلکہ توہین رسالت کے زمرے میں آتا ہے جس کی شرعی سزا بھی قتل ہے۔ اسلامی شریعت سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شادی شدہ زانیوں اور مرتدین پر سزائے موت نافذ کی ہے تو کیا غامدی صاحب کے دعوے کے مطابق نعوذ باللہ اللہ کا رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جہنم میں جائیں گے؟ اور امت مسلمہ کے تمام علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین اور وہ قضاۃ بھی ابدی طور پر جہنم کا ایندھن بنیں گے، جنہوں نے دو سے زیادہ جرائم پر موت کی سزا سنائی؟ حقیقت یہ ہے کہ ایسا دعویٰ کرنا صرف کسی فاتر العقل اور پاگل شخص ہی کا کام ہے۔

6۔ شراب نوشی کی شرعی سزا

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں شراب نوشی پر شرعی سزا ہے جو جرم ثابت ہونے پر نافذ کی جاتی ہے اور بربنائے اختلاف یہ سزا کم سے کم چالیس (40) کوڑے اور زیادہ سے زیادہ اسی (80) کوڑے ہیں۔ اس کے حد ہونے پر پوری امت کا اتفاق اور اجماع ہے۔

مگر غامدی صاحب ایک تو شراب نوشی پر کسی شرعی سزا کو نہیں مانتے، دوسرے وہ اسے ایسی تعزیر قرار دیتے ہیں۔ جو کم و بیش بلکہ معاف بھی ہو سکتی ہے اور اسے ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'برہان' میں شراب نوشی کی سزا کے بارے میں اپنا قطعی فیصلہ اس طرح سناتے ہیں:

''یہ بالکل قطعی ہے کہ حضور ﷺ نے اگر شراب نوشی کے مجرموں کو پٹوایا تو شارع کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے پٹوایا اور آپ کے بعد آپ کے خلفا نے بھی ان کے لیے چالیس کوڑے اور اسی کوڑے کی یہ سزائیں اسی حیثیت سے مقرر کی ہیں۔ چنانچہ ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حد نہیں ہے، بلکہ محض تعزیر ہے جسے مسلمانوں کا نظم اجتماعی، اگر چاہے تو برقرار رکھ سکتا اور چاہے تو اپنے حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر وتبدل کر سکتا ہے۔'' (برہان، ص 139، طبع چہارم جون 2006ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا ایک دعویٰ تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب نوشی کے مجرموں کو جو سزا دی وہ شارع کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے حکمران (گویا مرکز ملت) کی حیثیت سے دی اور ان کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ شراب نوشی پر سزا حد نہیں تعزیر ہے اور ایک ایسی تعزیر ہے جس میں اسلامی حکومت تبدیلی بھی کر سکتی ہے اور اگر چاہے تو اسے بالکل ختم بھی کر سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں غامدی صاحب کے یہ دونوں دعاوی بالکل غلط اور بے اصل ہیں۔

ان کے پہلے دعوے کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی کسی مجرم کو کوئی سزا دی، ہمیشہ شارع اور پیغمبر کی حیثیت سے دی کیونکہ آپ شارع اور پیغمبر پہلے ہیں اور حکمران بعد میں ہیں۔

یہ کیسی تجدد پسندانہ اور الحادی سوچ ہے کہ نبی ﷺ جب کسی چور اور زانی کو سزا دیتے تھے تو اس وقت شارع اور پیغمبر کی حیثیت سے دیتے تھے اور جب حضور ﷺ کسی شرابی کو

سزا دیتے تھے تو مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے دیتے تھے، اس وقت آپ نہ تو شارع ہوتے تھے اور نہ پیغمبر؟

ان کے دوسرے دعوے کا جواب یہ ہے کہ شراب نوشی پر سزا کو خواہ حد کہیے یا تعزیر کا نام دیجئے مگر اس کے ایک مقرر شرعی سزا ہونے پر امت مسلمہ کا اتفاق اور اجماع ہے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ یہ شرعی سزا کتنی مقدار میں ہے۔ جمہور فقہا کے نزدیک شراب نوشی پر اسی (80) کوڑوں کی شرعی سزا مقرر ہے جب کہ امام شافعی اور بعض کے نزدیک اس جرم پر چالیس (40) کوڑوں کی شرعی سزا مقرر ہے۔

چنانچہ ابن رشد اپنی کتاب ''بدایۃ المجتہد'' میں لکھتے ہیں:

((فقال الجمهور: الحد في ذلك ثمانون، وقال الشافعي وابوثور وداود: الحد في ذلك اربعون، هذا في حد الحر، وقال اهل الظاهر: حد الحر والعبد سواء، وهو اربعون))

(بداية المجتهد، ج2، ص332)

''جمہور فقہاء کے نزدیک اس (شراب نوشی) کی حد اسی (80) کوڑے ہیں۔ البتہ امام شافعی، ابوثور اور داؤد کے نزدیک یہ حد چالیس (40) کوڑے ہیں اور یہ آزاد مجرم کے لیے ہے اہل ظاہر کہتے ہیں کہ آزاد اور غلام دونوں کے لیے چالیس (40) کوڑوں کی حد ہے۔''

'الفقہ الاسلامی وادلتہ' کے مصنف الدکتور وھبۃ زحیلی شراب نوشی کی سزا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

((قال جمهور الفقهاء: حد الشرب والسكر ثمانون جلدة...... وقال الشافعية: حد الخمر وسائر المسكرات اربعون جلدة.)) (الفقه الاسلامي وادلته، ج6، ص151)

''جمہور فقہاء کے نزدیک شراب نوشی اور نشے کی حد اسی (80) کوڑے ہیں......

اور شوافع کے ہاں شراب نوشی اور دوسرے تمام منشیات پر چالیس (40) کوڑوں کی حد ہے۔''

'موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی' میں ہے کہ:

((وقد اتفقوا علی ان حد الشرب اربعون جلدة، لا ينقض عنها، وانه ليس اكثر من ثمانين.))

(موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی، ج1، ص 337)

''اس پر امت کا اتفاق ہے کہ شراب نوشی کی شرعی سزا کم سے کم چالیس (40) اور زیادہ سے زیادہ (80) کوڑے ہیں۔''

علامہ شبلی نعمانی اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'الفاروق' میں لکھتے ہیں کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی پر اسی (80) کوڑوں کی سزا دی۔ (ص 327)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت میں شراب نوشی پر کم سے کم چالیس کوڑوں اور زیادہ سے زیادہ اسی (80) کوڑوں کی شرعی سزا مقرر ہے جس میں کوئی اسلامی حکومت (خواہ اسے نظم اجتماعی کہیے یا مرکز ملت کا نام دیجیے) نہ تو ردوبدل کر سکتی ہے اور نہ اسے بالکلیہ ختم کر سکتی ہے بلکہ اس کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنے ہاں کے ایسے مجرموں پر اس شرعی سزا کی تنفیذ کرے ورنہ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوگی۔

7۔ قتلِ خطا میں دیت (Blood Money) کا مسئلہ

حدیث و سنت سے ثابت دیت کے مسئلے میں بھی غامدی صاحب اُمت مسلمہ کے متفقہ اور اجماعی موقف کے خلاف ہیں۔ علمائے اسلام کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قتل خطا کی دیت مقرر ہے جو کہ سو اونٹ یا اُس کی قیمت ہے اور یہ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ مگر غامدی صاحب نہ تو دیت کی مقررہ مقدار کو مانتے ہیں اور نہ عورت اور مرد کی دیت کے فرق کو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اسلام نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ افراد کے لحاظ سے دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔''......

''عورت کی دیت، اس زمانے کے ارباب حل و عقد اگر چاہیں تو پوری مقرر کر سکتے ہیں۔'' (میزان، حصہ اوّل، صفحہ 218، طبع مئی 1985ء، لاہور)

پھر ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن نے خود دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد، مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اسی دستور کے مطابق ہیں۔'' (میزان ص623، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

لیکن غامدی صاحب کا مذکورہ موقف ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیث و سنت اور اجماع اُمت کے خلاف ہے۔

قرآن اور دیت:

جہاں تک قرآن حکیم میں قتل خطا کی دیت کا تعلق ہے تو اس کے واجب ہونے کا ثبوت درج ذیل آیت میں ملتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا﴾ (النساء: 92)

''کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے چوک ہو جائے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو دیت دی جائے، البتہ یہ کہ وہ دیت معاف کر دیں۔''

اس آیت کے حکم کے بارے میں امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ:

((لما لم یکن مقدار الدیة مبینا فی الکتاب کان فعل النبی ﷺ فی ذلك وارد مورد البیان وفعله ﷺ اذا ورد مورد البیان فهو علی الوجوب.)) (احکام القرآن ج2، ص 239)

''چونکہ الکتاب یعنی قرآن میں دیت کی مقدار بیان نہیں ہوئی ہے اس لیے نبی کریم ﷺ کے عمل سے اس بارے میں وضاحت مل جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کے عمل کی وضاحت سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس آیت میں صرف دیت کا واجب ہونا مراد ہے۔''

سنت اور دیت:

احادیث میں قتل خطا کی دیت کی مقدار مقرر ہے جو کہ سو اونٹ یا اُس کے برابر قیمت ہے۔

1۔ ''اِنَّ فِی النَّفْسِ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ.''

(سنن نسائی، کتاب القسامه والقود والدیات، حدیث: 4861)

(موطا امام مالك، کتاب العقول)

''بے شک جان کی صورت میں (دیت کی مقدار) سو اونٹ ہیں۔''

2۔ ''عَقْلُ الْمَرْءَةِ مِثْلُ عَقْلِ الرَّجُلِ حَتّٰی یَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِیَتِهَا.''

(سنن نسائی، حدیث: 4809)

''(جراحات میں) عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے بشرطیکہ دیت کی مقدار کل دیت کے ایک تہائی② سے زیادہ نہ ہو۔''

یہ حدیث جراحات یعنی اعضاء کے تلف ہونے یا زخموں کی صورت میں دیت کے بارے میں ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کی دیت جراحات میں بھی صرف اس حد تک مرد کی دیت کے برابر ہوتی ہے جب دیت کی مقدار کل دیت (100 اونٹ یا ان کی قیمت) کے ایک

تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ جب عورت کی دیت کی مقدار کل دیت کے ایک تہائی سے بڑھ جائے گی تو پھر مرد اور عورت کی دیت میں برابری نہیں رہے گی بلکہ دونوں میں فرق ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب جراحات میں مرد اور عورت کی دیت میں فرق ہے تو پھر ساری دیت میں کیوں فرق نہیں ہے۔ ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جس میں یہ ہو کہ مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اجماعِ امت اور دیت:

قتلِ خطاء میں عورت کی دیت مرد کے مقابل میں نصف ہونے پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ ابن رُشد اپنی کتاب "بداية المجتهد" میں ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک کے طور پر بیان فرماتے ہیں:

1۔ ((اما دية المرءة فانهم اتفقوا على النصف من دية الرجل فی النفس فقط.)) (بداية المجتهد، ج 2، ص 315)

"باقی رہا عورت کا معاملہ تو اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔"

2۔ التشریع الجنائی میں عبدالقادر عودہ شہید لکھتے ہیں کہ عورت کی نصف دیت پر پوری امت متفق ہے۔

((ومن المتفق عليه ان دية المرءة على النصف من دية الرجل فی القتل.)) (التشريع الجنائی، ج 1، ص 669)

"اس امر پر امت کا اتفاق رائے ہے کہ قتل (خطاء) کی صورت میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی۔"

اب اگر اجماعِ امت بھی دین میں حجت ہے اور وہ یقیناً حجت ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی قانون میں قتلِ خطاء کی صورت میں عورت کی دیت مرد سے نصف ہے۔ اور اس بارے

میں غامدی صاحب کا موقف صحیح نہیں ہے۔

حاصل بحث:

حاصلِ بحث یہ ہے کہ قانون اسلامی میں قتل خطاء کی صورت میں دیت کی مقدار سو اونٹ مقرر ہے، البتہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف رکھی گئی ہے۔ قرآن وسنت سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور تعامل صحابہ واجماع امت سے بھی یہی امر ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب کا یہ موقف غلط ہے کہ اسلام میں دیت کی مقدار مقرر نہیں ہے اور یہ کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہے۔ عورت پیداواری عامل یا معاشی طور پر کسی کی کفیل نہیں ہوتی۔ اس لیے بالعموم اس کی ہلاکت سے خاندان یا ورثاء کو اس قدر مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا جس قدر مالی نقصان ایک مرد کے مر جانے سے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح وراثت میں بھی قرآن نے مرد کے مقابلے میں عورت کا حصہ نصف قرار دیا ہے اور مالی معاملات میں بھی آدھی گواہی رکھی ہے۔

8۔ مقدمات میں شہادت (گواہی) کا مسئلہ

غامدی صاحب اسلامی شریعت کے قانونِ شہادت کا بھی انکار کرتے ہیں:

1۔ وہ ہر معاملے میں مرد اور عورت کی گواہی کو برابر قرار دیتے ہیں۔

2۔ وہ سوائے ایک آدھ مقدمے کے کسی مقدمے میں بھی گواہی کا کوئی نصاب نہیں مانتے۔

3۔ وہ حدود میں بھی عورتوں کو گواہی کو جائز مانتے ہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''قحبہ عورتوں سے نمٹنے کے لیے چار گواہ طلب کرنے کا یہ طریقہ اور قذف کی صورت میں مقدمہ قائم کرنے کے لیے چار گواہوں کی شہادت پر اصرار، ان دو چیزوں کے سوا اسلامی شریعت کے جرائم بھی اسی طرح ثابت قرار پاتے ہیں، جس طرح جرم اس دنیا میں ثابت ہوتے رہتے ہیں یا مستقبل میں ثابت ہوں گے۔ قرآن نے عدالت کو اس معاملے میں ہرگز کسی خاص طریقے کا پابند نہیں کیا۔''

(میزان، ص 299، طبع اپریل 2002ء لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''ان دو مستثنیات (قذف اور قحبہ عورتوں کے زنا) کے سوا اسلامی شریعت ثبوت جرم کے لیے عدالت کو ہرگز کسی خاص طریقے کا پابند نہیں کرتی، لہٰذا حدود کے جرائم ہوں، یا ان کے علاوہ کسی جرم کی شہادت، ہمارے نزدیک یہ قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا ہے اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا۔ اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہے۔ عورت اگر اپنے بیان میں الجھے بغیر واضح طریقے پر گواہی دیتی ہے تو اسے محض اس وجہ سے رد نہیں کر دیا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت یا مرد موجود نہیں ہے، اور مرد کی گواہی میں اگر اضطراب وابہام ہے تو اسے محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ مرد ہے۔ عدالت اگر گواہوں کے بیانات اور دوسرے قرائن وحالات کی بنا پر مطمئن ہو جاتی ہے کہ مقدمہ ثابت ہے تو وہ لامحالہ اسے ثابت قرار دے گی اور اگر وہ مطمئن نہیں ہوتی تو اسے یہ حق بے شک، حاصل ہے کہ وہ دس مردوں کی گواہی کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دے۔'' (برہان، ص 27، طبع چہارم، جون 2006ء لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''ثبوت جرم کے لیے قرآن مجید نے کسی خاص طریقے کی پابندی چونکہ کسی جگہ لازم نہیں ٹھہرائی۔ اس وجہ سے یہ بالکل قطعی ہے کہ اسلامی قانون میں جرم ان سب طریقوں سے ثابت ہوتا ہے جنہیں اخلاقیاتِ قانون میں مسلمہ طور پر ثبوت جرم کے طریقوں کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں عقل تقاضا کرتی ہے کہ ان سے اسے ثابت ہونا چاہیے۔ چنانچہ حالات، قرائن، طبی معائنہ، پوسٹ مارٹم، انگلیوں کے نشانات، گواہوں کی شہادت، مجرم کے اقرار، قسم، قسامہ اور اس طرح کے دوسرے شواہد سے جس طرح جرم اس دنیا میں ثابت ہوتے ہیں، اسلامی شریعت کے جرائم بھی ان سے بالکل اسی طرح ثابت

قرار پاتے ہیں۔" (برہان، ص25، طبع چہارم، جون 2006ء لاہور)

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں ہر معاملے میں مرد اور عورت کی گواہی برابر نہیں ہے، ہر قسم کے مقدمات کے لیے گواہی کا ایک خاص نصاب مقرر ہے اور یہ کہ حدود میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں ہے۔

کیا ہر معاملے میں مرد اور عورت کی گواہی برابر ہے؟

قرآن مجید کی سورۃ البقرہ کی آیتِ دَین میں جہاں قرض کے لین دین کی دستاویز اور اس پر گواہ بنانے کا ذکر آیا ہے وہاں دو مردوں کی گواہی کا نصاب بیان ہوا ہے۔ لیکن اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو کم سے کم ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔ گویا دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (البقرۃ: 282)

"اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ہو۔ یہ سب گواہ تمہارے نزدیک معتبر ہونے چاہئیں۔ دو عورتوں کی گواہی اس لیے کہ اگر ایک کچھ بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی رو سے مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے اور غامدی صاحب کا یہ دعویٰ قرآنی حکم کے خلاف ہے کہ بدکاری اور قذف کے سوا اسلام میں کوئی اور گواہی کا نصاب موجود نہیں ہے۔

جہاں تک حدیث میں عورت کی گواہی کا تعلق ہے تو اس بارے میں صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فَشَهَادَةُ امْرَءَ تَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ)) (صحيح مسلم، رقم: 241)

"پھر دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔"

اسی مضمون کی احادیث صحیح بخاری، رقم 304، ترمذی رقم 2613 اور ابن ماجہ، رقم 4003 میں موجود ہیں۔

گویا قرآن مجید کی طرح صحیح احادیث اور سنت سے بھی مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی کا ایک مرد کی گواہی کے برابر ہونا ثابت ہے۔

قرآن مجید اور حدیث وسنت کے واضح احکامات کی روشنی میں فقہائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ مالی معاملات میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔

بدایۃ المجتہد میں ہے کہ:

((واتفقوا على انه تثبت الاموال بشاهد عدل ذكر وامرء تين لقوله تعالى: فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ))

(ابن رشد، بداية المجتهد، ج2، ص465 مطبوعه مصر)

"اس پر سب کا اتفاق ہے کہ مالی معاملات ایک معتبر مرد اور دو معتبر عورتوں کی گواہی سے ثابت ہو جاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔"

موسوعۃ الاجماع میں بھی اس پر اجماع امت لکھا ہے کہ:

((وقد اتفقوا على قبول رجل وامرء تين ان لم يوجد رجلان في الديون من الاموال خاصة))

(سعدی ابوحبیب، موسوعة الاجماع، ج1، 547، طبع دمشق)

"اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قرض کے لین دین میں قبول کی جائے گی۔"

کیا بقول غامدی صاحب سوائے دو مستثنیات (فحبہ عورتوں سے نمٹنے اور قذف) کے اسلامی شریعت میں مقدمات کے ثبوت کے لیے شہادت کا کوئی نصاب مقرر نہیں ہے؟

ہم سمجھتے ہیں کہ غامدی صاحب کا مذکورہ دعویٰ ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ اسلامی شریعت میں بے شمار مقدمات جیسے قتل، زنا، چوری اور ڈاکے وغیرہ کے لیے شہادت کے نصابات مقرر ہیں۔ عام مقدمات میں دو مردوں کی گواہی کافی قرار دی گئی ہے البتہ قذف اور زنا میں چار مرد گواہوں کی شرط لازمی ہے۔

تعجب ہے کہ غامدی صاحب ایسے جرم پر جس کی سزا صرف اسی کوڑے ہے اس کے ثبوت کے لیے تو وہ چار گواہوں کی شہادت ضروری قرار دیتے ہیں مگر جن جرائم پر سو کوڑوں، قتل اور سنگساری کی سخت سزائیں مقرر ہیں ان کے ثبوت کے لیے وہ ایک مرد کی گواہی بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ جب کہ ان کے استاد امام مولانا امین احسن اصلاحی ہر قسم کے زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی کو لازمی قرار دیتے ہوئے اپنی 'تفسیر تدبر قرآن' میں لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ یہ تعزیرات سورۂ نور میں نازل شدہ حدود کے بعد منسوخ ہوگئیں، لیکن بدکاری کے معاملے میں شہادت کا یہی ضابطہ (چار گواہوں کا) بعد میں بھی باقی رہا۔'' (تدبر قرآن، ج1، ص265، طبع 1983ء لاہور)

حدود و قصاص کے مقدمات کی گواہی:

جہاں تک حدود و قصاص کے مقدمات میں عورتوں کی گواہی کا تعلق ہے تو اس بارے میں اجماع امت یہی ہے کہ ان کی گواہی معتبر نہیں ہے، سوائے ظاہر یہ کے جو حدود میں بھی عورتوں کی گواہی قبول کرتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ جہاں دو مردوں کی گواہی مطلوب ہے وہاں چار عورتوں کی گواہی لی جائے گی اور جہاں چار مردوں کی شہادت ضروری ہے وہاں آٹھ عورتوں کی شہادت ضروری ہوگی۔

دراصل حدود و تعزیرات کے معاملے میں بھی دوسرے منکرین حدیث اور ملحدین کی طرح

غامدی صاحب کا طریق واردات اور ٹیکنیک بھی یہی ہے کہ کبھی اجماع امت کا انکار کریں گے، کبھی حدیث وسنت کو دین سے خارج کریں گے، کبھی قرآن کے احکام کو وقتی اور عارضی قرار دیں گے اور جب کچھ بس نہ چلے گا تو قرآن مجید کی آیات کی من مانی تفسیر کرنے لگ جائیں گے۔

9۔کیا کفار کے خلاف جہاد وقتال کا حکم منسوخ ہو چکا ہے؟

آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے نبوت کے ایک جھوٹے دعوے دار مرزا غلام احمد قادیانی نے، جو بقلم خود 'انگریز کا خود کاشتہ' پودا تھا، انگریز کی حکومت کی خوشنودی کی خاطر جہاد کو حرام قرار دیتے ہوئے کہا تھا ؎

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

اب سو سال بعد مرزا صاحب کی صدائے بازگشت ہمیں غامدی صاحب کے ہاں سنائی دیتی ہے جو کفار کے خلاف مسلمانوں کے جہاد کو حرام قرار دیتے ہیں۔

مرزا قادیانی اور غامدی صاحب میں مماثلت:

مرزا صاحب اور غامدی صاحب میں کئی باتیں مشترک ہیں، مثال کے طور پر:

1۔ دونوں قرآن مجید کی من مانی تفسیر کرتے ہیں۔
2۔ دونوں صحیح احادیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔
3۔ دونوں کا کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔
4۔ دونوں اجماع امت کے منکر ہیں۔
5۔ دونوں سرکار دربار کے کاسہ لیس ہیں۔
6۔ دونوں ملت اسلامیہ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں۔
7۔ دونوں دین کے مسلمات کا انکار کرتے ہیں۔

8۔ دونوں دین کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرتے ہیں۔

9۔ دونوں جھوٹے دعاوی کرنے کے عادی ہیں۔

10۔ دونوں کفار کے خلاف جہاد کو حرام قرار دیتے ہیں۔

پھر اسلامی شریعت کے بارے میں دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب کا طریقہ واردات اور ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ پہلے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے باہمی تعلق کو ختم کرتے ہیں تاکہ قرآن سے حدیث وسنت کا رشتہ منقطع کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ صحیح احادیث اور اجماع امت کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآنی آیات کی من مانی تفسیر کرتے، اس سے اپنے من پسند نتائج نکالتے اور اسے قرآن کا اصل مدعا قرار دیتے ہیں۔

جہاد وقتال کے معاملے میں بھی غامدی صاحب نے یہی حربہ استعمال کیا ہے۔

چنانچہ وہ کافروں کے خلاف جہاد وقتال کو شرعی حکم نہیں مانتے۔ اس بارے میں موصوف کی تحقیق انیق یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کچھ کافر لوگ ہوا کرتے تھے، مگر ان کے خلاف بھی جہاد وقتال ہرگز جائز نہ تھا صرف اللہ تعالیٰ کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان پر کسی طریقے سے کوئی عذاب بھیج دے۔

لیکن اس دور مبارک کے بعد آج تک امت مسلمہ کفار کے وجود کو ترس رہی ہے اور قیامت تک ترستی رہے گی کہ ان کے خلاف جہاد وقتال کی سعادت حاصل کر سکے مگر اس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو رہا۔

اگر گذشتہ تیرہ صدیوں میں کہیں مسلمانوں نے کچھ لوگوں کو غلطی سے کافر سمجھ کر ان کے خلاف جہاد وقتال کیا یا ان سے مالِ غنیمت حاصل کیا یا ان سے جزیہ وصول کیا تو ان کے یہ سارے کام غامدی صاحب کی نظر میں غیر شرعی، غیر اخلاقی اور خلافِ قرآن تھے۔

غامدی صاحب اپنے اس مخصوص تصورِ جہاد وقتال کو اس طرح پیش فرماتے ہیں:

1۔ ''اس (جہاد وقتال) کا حکم قرآن میں دو صورتوں کے لیے آیا ہے: ایک، ظلم وعدوان کے خلاف دوسرے، اتمامِ حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف پہلی صورت شریعت کا

ابدی حکم ہے...... دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ اس کے براہِ راست حکم سے اور انہی ہستیوں کے ذریعے روبعمل ہوتا ہے جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے......

اس قانون کی رو سے اللہ کی حجت جب ان رسولوں کے ذریعے سے کسی قوم پر پوری ہو جاتی ہے تو ان کے منکرین پر اسی دنیا میں عذاب آ جاتا ہے۔ یہ عذاب آسمان سے بھی آتا ہے اور بعض حالات میں اہل حق کی تلواروں کے ذریعے سے بھی۔ پھر اس کے نتیجے میں منکرین لازماً مغلوب ہو جاتے ہیں اور ان کی سرزمین پر حق کا غلبہ پوری قوت کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اتمامِ محبت کے بعد یہی دوسری صورت پیش آئی۔ چنانچہ آپ کو اور آپ کے صحابہ کو جس طرح ظلم وعدوان کے خلاف قتال کا حکم دیا گیا، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی تلوار اٹھانے کی ہدایت ہوئی۔ یہ خدا کا کام تھا، جو انسان کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ اسے ایک سنت الٰہی کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ انسانی اخلاقیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ. ''اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے سزا دے گا۔'' (التوبہ:14) کے الفاظ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔''

(میزان،ص579، 580،طبع سوم،مئی2008ء لاہور)

2۔ ''یہ اللہ کی جنگ ہے جو اس کے بندے، اس کے حکم پر اور اس کی ہدایت کے مطابق 'فی سبیل اللہ' یعنی اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ ان کی حیثیت اس جنگ میں محض آلات وجوارح کی ہے۔ اس میں ان کو اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں، لہٰذا وہ اپنی اس حیثیت سے سرمو کوئی انحراف نہیں کر سکتے۔''

3۔ ''اس قانون (قانون اتمامِ حجت) کے تحت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلہ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ پر اور اس کے بعد جزیرہ نمائے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔

آپ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کی تکفیر اور ان کے خلاف محض ان کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا ان پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے۔ اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔''

('شذرات' ماہنامہ اشراق، ص2، بابت اگست 2009ء لاہور)

اب ہم غامدی صاحب کے اس نظریۂ جہاد پر شق وار تبصرہ کریں گے:

1۔ ظلم وعدوان سے کیا مراد ہے؟

یاد رہے غامدی صاحب مبہم گفتگو کرنے کا عادی ہیں اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ شریعت کا ابدی حکم یہ ہے کہ ظلم وعدوان کے خلاف جہاد کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ اس ظلم وعدوان (زیادتی) سے کیا مراد ہے؟ کیا آج اگر چند افراد مل کر کسی شخص کو اس کے گھر سے زبردستی بے دخل کر دیں اور اس کے گھر پر قابض ہو جائیں تو یہ ظلم وعدوان نہیں ہوگا؟ اگر ہوگا اور یقیناً ہوگا تو کیا اس ظلم وعدوان کے مرتکب افراد کے خلاف اسلامی حکومت جہاد وقتال کا حکم جاری فرمائے گی تاکہ شریعت کے ایک ابدی حکم پر عمل ہو سکے۔ یا اگر آج ہمسایہ غیر مسلم ملک کے چند غنڈے سرحد کے اندر آ کر کسی مسلمان چرواہے کی کچھ بھیڑ بکریاں ہانک کر اپنے ہاں لے جائیں تو یہ ظلم وعدوان ہوگا یا نہیں؟ اگر یہ ظلم وعدوان ہے تو کیا اس ظلم وعدوان کی پاداش میں اسلامی حکومت 'شریعت کے ایک ابدی حکم' کی تعمیل میں اپنے ہمسایہ غیر مسلم ملک کے خلاف جہاد وقتال کا اعلان کر دے گی؟

حقیقت یہ ہے کہ ظلم وعدوان ایک مبہم اور اضافی اصطلاح (Vague and relative term) ہے۔ جس کو جہاد وقتال کے لیے عملی طور پر متعین نہیں کیا جا سکتا، اور ظاہر ہے اسلامی

شریعت کے احکام کی بنیاد مبہم اور غیر متعین اصطلاحوں پر نہیں رکھی گئی۔

2۔ اتمامِ حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف جہاد وقتال:

رہی جہاد وقتال کی دوسری صورت جسے غامدی صاحب 'اتمام حجت کے بعد منکرین حق کے خلاف جہاد وقتال' کا نام دیتے ہیں تو یہ بالکل بے اصل اور بے سروپا بات ہے۔

غامدی صاحب کے اس دعوے کی تقریر یوں ہوتی ہے کہ جب کوئی رسول (نبی نہیں) اپنی قوم پر اتمام حجت کر لیتا ہے تو اس کے بعد منکرین حق (کفار نہیں) پر آسمان سے عذاب آتا ہے جس سے ان کی شامت آجاتی ہے اور وہ اس کے سبب سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

پھر اگر فرشتوں کے انکار کے باعث یا بعض فنی وجوہات کی پیچیدگی کی وجہ سے آسمانی سے عذاب بھیجنا ناممکن ہو جائے تو رسول اللہ اور اس کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ اپنے 'قانون اتمام حجت کا واسطہ دے کر ان کو منکرین حق کے خلاف جہاد وقتال پر آمادہ کرتا ہے۔ مگر یہ اہل حق جہاد وقتال کی نیت اور ارادے سے بھی محروم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی حیثیت اس وقت محض آلات وجوارح کی ہوتی ہے اس لیے ان کو آخرت کے اجر وثواب کی بھی کوئی امید نہیں ہوتی۔ وہ بیچارے بلا ارادہ اللہ تعالیٰ کے آلۂ کار بن کر اپنے ہاتھوں میں کچھ تلواریں، نیزے اور تیر بھالے لے کر میدانِ جنگ میں کود جاتے ہیں اور منکرین حق پر قہر خداوندی بن کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ منکرین حق مغلوب ہو جاتے ہیں اور اہل حق کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

پھر غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منکرین حق پر اتمام حجت کے بعد یہی صورت پیش آئی۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ معتبر تاریخی شواہد وواقعات غامدی صاحب کے ان دعاوی کی تائید نہیں کرتے بلکہ ان کے خلاف ہیں، کیونکہ:

1۔ مشرکین قریش پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے پوری طرح اتمام حجت اس وقت ہو چکا تھا جب آپ ﷺ نے مکے سے مدینے ہجرت فرمائی، مگر پورے آٹھ برس یعنی فتح

مکہ تک 'قانون اتمام حجت' کے تحت ان منکرین حق پر آسمان سے کوئی عذاب نازل نہیں ہوا بلکہ وہ اس تمام عرصے میں مدینے پر بار بار اپنے لشکر لے کر حملہ آور ہوتے رہے اور رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے مسلسل خطرہ بنے رہے۔

2۔ اگر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا جہاد وقتال اور غزوات کا سلسلہ اصل میں منکرین حق کے لیے اللہ تعالیٰ کا عذاب تھا، تو اس کے سبب سے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ کیونکہ عذاب ان کے لیے نہیں تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس جہاد وقتال میں سینکڑوں صحابہ شہید ہوئے، بعض کی لاشوں کا مثلہ کیا گیا۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے، ان کو مالی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ کیا اس سے نعوذ باللہ یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر عذاب منکرین حق کے لیے مقدر کر رکھا تھا اس کا ایک بڑا حصہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے لیے بھی مختص فرمایا تھا؟ یا اللہ تعالیٰ کی غلطی اور فروگزاشت کے نتیجے میں یہ سب کچھ وقوع پذیر ہو گیا؟

عہد رسالت کے غزوات کی نوعیت:

عہد رسالت کے جن غزوات کو غامدی صاحب یہ قرار دے رہے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شریعت کی رو سے جہاد وقتال نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت، کے مطابق عذاب خداوندی تھا۔ اس کی ایک جھلک صرف غزوۂ احد میں جو 3 ہجری میں ہوا، دیکھی جا سکتی ہے۔ جس میں مشرکین قریش یعنی منکرین حق کا تین ہزار کا ایک لشکر ابوسفیان کی سرکردگی میں مدینے پر حملہ آور ہوتا ہے جس میں دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ لشکر احد پہاڑ کے دامن میں آ کر جمع ہو جاتا ہے، دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی کل تعداد سات سو (700) ہے، مقابلے کے لیے مدینے سے نکلتے ہیں۔ دونوں لشکر آمنے سامنے صف آرا

ہوتے ہیں۔لڑائی کے پہلے راؤنڈ میں منکرین حق کو شکست ہوتی ہے، وہ میدان چھوڑ کر بھاگتے ہیں۔اس دوران اہل حق ان کا مال غنیمت سمیٹنے لگتے ہیں۔ بھاگتے ہوئے منکرین حق جب یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر پیچھے سے حملہ کرنا اب ممکن ہوگیا ہے کیونکہ ان کے عقب کا محافظ دستہ بھی درے سے ہٹ کر مال غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہوگیا ہے اور وہاں صرف چند آدمی درے پر موجود ہیں جن کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے تو منکرین حق کا ایک گھڑ سوار دستہ خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل کی سرگردگی میں پہاڑ کا چکر کاٹتا ہے اور درے میں موجود دس مسلمانوں کو شہید کرتے ہوئے پیچھے سے اہل حق کے لشکر پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مشرکین قریش کا بھاگتا ہوا لشکر واپس لوٹ آتا ہے اور سامنے سے مسلمانوں پر ان کی بے خبری میں پل پڑتا ہے۔لڑائی کے دوسرے راؤنڈ میں اہل حق گھیرے میں آجاتے ہیں۔دشمن سامنے اور پیچھے دونوں طرف سے حملہ کر چکا ہے۔اہل حق کی صفیں درہم برہم ہو جاتی ہیں۔ افراتفری ایسی مچتی ہے کہ خود اپنوں کی تلواریں اپنوں سے ٹکراتی ہیں جس سے ایک صحابی شہید اور دو زخمی ہو جاتے ہیں۔اہل حق کا جھنڈا جس صحابی کے ہاتھ میں ہوتا ہے وہ بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ افواہ پھیل جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہوگئے ہیں۔اسی غم اور پریشانی میں کئی صحابہ ہاتھوں سے تلواریں پھینک دیتے ہیں اور جنگ سے ہاتھ روک لیتے ہیں۔خود رسول اللہ ﷺ زخمی ہو جاتے ہیں اور اسی حالت میں پہاڑ کی طرف چڑھتے ہوئے ایک گڑھے میں گر جاتے ہیں جہاں سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کو مشکل سے باہر نکالتے ہیں۔اس کے بعد آپ ﷺ کے سامنے کے دو دانت مبارک شہید ہو جاتے ہیں۔آپ کا رخسار مبارک زخمی ہو جاتا ہے۔ پیشانی لہولہان ہو جاتی ہے اور چہرۂ اقدس پر خون بہنے لگتا ہے۔

اس نازک صورت حال کے بعد جنگ کا تیسرا راؤنڈ شروع ہو جاتا ہے۔اہل حق دوبارہ صف بندی کر کے دشمن پر حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کو مار بھگاتے ہیں مگر اس جنگ میں اہل حق کا زیادہ جانی نقصان ہوتا ہے۔ستر (70) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوتے ہیں جب کہ

منکرین حق کے صرف بائیس (22) آدمی ہلاک ہوتے ہیں۔

اب اگر غامدی صاحب کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کا یہ جہاد وقتال نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے 'قانون اتمام حجت' کے مطابق اس کا عذاب تھا تو بتایئے اس عذاب خداوندی کا شکار وہ منکرین حق ہوئے جن کے صرف بائیس (22) آدمی مرے یا اس عذاب کا شکار وہ اہل حق ہوئے جن کے ستر (70) افراد شہید ہوئے؟ اور جس کے نتیجے میں علامہ شبلی نعمانی کے بقول ''تمام مدینہ ماتم کدہ بن گیا''، 'قانون اتمام حجت' کی اس جنگ میں فرشتوں نے بھی اہل حق کی کوئی مدد نہ کی اور نعوذ باللہ کیا اللہ تعالیٰ نے غلطی سے اپنے عذاب کا بڑا حصہ منکرین حق کی طرف سے پھیر کر اہل حق کی طرف کر دیا تھا؟

کیا رسول ہر حال میں غالب رہتا ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بے اصل اور خلاف قرآن ہے کہ رسول اپنی قوم کے مقابلے میں ہمیشہ غالب رہتا ہے کیونکہ قرآن مجید ہی سے یہ ثابت ہے کہ بعض رسولوں کو ان کی قوم نے قتل کر دیا تھا۔

(1) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝﴾ (البقرة: 87)

''تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمہارے پاس وہ چیز لے کر آیا جو تمہارے نفس کو پسند نہ آئی تو تم نے تکبر کیا، پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو تم قتل کرتے تھے۔''

(2) اسی طرح ارشاد ہوا کہ:

﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ۝﴾ (المائدة: 70)

”بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لایا جو ان کو پسند نہ آئی تو بعض کو وہ جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر ڈالتے تھے۔“

(3) اسی طرح مزید ارشاد ہوا کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾

(آل عمران : 183)

”یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کئی رسول آئے، نشانیاں لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو۔ پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ اگر تم سچے ہو؟“

جب رسولوں کا اپنی قوم کے ہاتھوں قتل ہونا ثابت ہے تو غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ رسول اپنی قوم پر ہمیشہ غالب آتا ہے اور اس کی قوم ہمیشہ مغلوب ہوتی ہے؟

جہاد وقتال کا اصل مقصد:

جہاد وقتال کا اصل مقصد جیسا کہ غامدی صاحب نے سمجھ رکھا ہے محض ظلم وعدوان کے خلاف جنگ نہیں ہے بلکہ اسلام میں جہاد وقتال کا اصل مقصد دنیا سے کفر وشرک کے فتنے اور غلبے کو مٹانا، اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنا اور دین حق کا بول بالا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾

(الانفال : 39)

"اور تم ان (کافروں) سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔"

لہٰذا جب تک دنیا میں کفر و شرک کا فتنہ اور غلبہ موجود ہے ان کے خلاف مسلمانوں کا جہاد جاری رہے گا۔

((عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَهَا، فَقَدْ عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَ حِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ))

(صحیح بخاری، رقم2949۔ صحیح مسلم، رقم 125)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں۔ پھر جو اس کا قائل ہو گیا تو اس نے اپنا مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچا لیا سوائے اس کے حق کے اور اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔"

(یاد رہے کہ بعض حالات میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور جزیہ لے کر ذمیوں کے خلاف جہاد نہیں ہوتا)۔

ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ اَبِیْ مُوْسٰى رضی اللہ عنہ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانُهٗ، فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

(بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

"حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایک آدمی مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے،

ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک تاکہ اس کی بہادری کی نمائش ہو تو ان میں سے کون اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔"

کیا جہاد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا اعلان شرط ہے؟

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اسلام میں جہاد کا اعلان صرف اسلامی حکومت یا مسلمانوں کا نظم اجتماعی کرے گا۔ مختلف دینی جماعتوں اور تنظیموں کا جہاد جہاد نہیں ہے۔

چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"اس (جہاد و قتال) کے معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی ان (مسلمانوں) کے نظم اجتماعی ہی کو حاصل ہے۔ ان کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ ان کی طرف سے اس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔"

(میزان، ص 851، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

دوسرے مقام پر ان کے ایک شاگرد نے ان کا یہ قول اخباری حوالے سے نقل کیا ہے کہ:

"جہاد تبھی ہوتا ہے جب مسلمانوں کی حکومت اس کا اعلان کرے۔ مختلف مذہبی گروہوں اور جتھوں کے جہاد کو جہاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

(ماہنامہ اشراق، ص 52، مارچ 2001ء لاہور)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اقدامی یعنی جارحانہ جہاد و قتال کے لیے جو کہ فرض کفایہ ہے، بعض شرائط رکھی ہیں جن میں اسلامی حکومت کا قیام اور اس کی طرف سے جہاد کے اعلان کی شرط بھی ہے مگر دفاعی یعنی مدافعانہ جہاد کے لیے جو کہ فرض عین ہے کوئی شرط نہیں رکھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز جمعہ کی امامت و خطبہ، نماز عیدین کی امامت اور خطبہ، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام، مناسک حج کی ادائیگی کے لیے امیر حج اور خطبہ حج جیسے تمام امور اصلاً حکمرانوں کی ذمہ داریاں ہیں مگر جب سے مسلم حکمران اپنی ان ذمہ داریوں

سے غافل ہوئے ہیں، اہل اسلام اپنے طور پر یہ سارے دینی کام سرانجام دے رہے ہیں۔

یہی حال جہاد وقتال کا ہے جو کہ بنیادی طور پر مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری ہے مگر جب سے انہوں نے دوسرے دینی فرائض کی طرح اس اہم دینی فریضے کو فراموش کر دیا ہے اور اسلام دشمن امریکہ کے 'فرنٹ لائن اتحادی' بن گئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے بعض نیک اور صالح افراد اپنے طور پر منظم ہو کر کفار کے خلاف دفاعی جہاد کر رہے ہیں اور وہ یہ کام قیامت تک کرتے رہیں گے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا، تُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ)) (صحیح مسلم، رقم4953)

''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔ قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرتی رہے گی۔''

ظاہر ہے جب غامدی صاحب کے نزدیک دنیا میں کوئی کافر ہی موجود نہیں ہے تو جہاد وقتال کس کے خلاف کیا جائے گا؟ اس لیے وہ سرے سے جہاد ہی کے منکر ہیں اگرچہ ذرا منطقی انداز سے اور الفاظ کی ہیرا پھیری کے ساتھ کبھی اقرار بھی کر لیتے ہیں کیونکہ

جنابِ شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

اب ہم جہاد وقتال کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلات بیان کریں گے۔

اسلام اور جہاد وقتال

تمہید:

''جہاد'' کے لفظی معنی ''انتہائی کوشش اور جدوجہد کرنے'' کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح

میں جہاد اُس بھرپور جدوجہد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کی راہ میں اُس کے دین کی سربلندی کے لیے کی جائے۔

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ وہ پوری انسانیت کے لیے امن و سکون کا پیغام ہے۔ لیکن وہ ظلم و جبر اور کفر و شرک کے غلبے کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے۔

جہاد کی کئی قسمیں ہیں:

جہاد بالمال، جہاد بالقلم، جہاد باللسان، جہاد بالنفس اور جہاد بالسیف وغیرہ۔

جہادِ بالمال یہ ہے کہ کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور دین کی سربلندی کے لیے اپنا مال خرچ کرے۔

جہاد بالقلم یہ ہے کہ تحریر کے ذریعے دین کے غلبے کی کوشش کی جائے۔

جہاد باللسان یہ ہے کہ زبان کے ذریعے اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوتِ دین کا کام کیا جائے۔

جہاد بالنفس یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اور ان پر قابو پاتے ہوئے نفس کو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت پر لگایا جائے۔

جہاد بالسیف یہ ہے کہ تلوار وغیرہ اسلحے کے ذریعے باطل اور کفر کی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اس جہاد کو قتال بھی کہتے ہیں۔ یہ دفاعی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔

یاد رہے کہ اُردو زبان میں جہاد کا لفظ جہاد کی ان تمام اقسام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور صرف قتال کے معنوں میں بھی جہاد کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جہاد و قتال اسلام میں ایک اہم اور مقدس فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ اہل اسلام کے لیے شوکت و وقار کا ذریعہ ہے اور اس کو چھوڑنے میں ذلت و نامرادی ہے۔ یہ عام حالات میں فرض کفایہ ہے مگر نفیر عام (خاص حالات) میں فرض عین بن جاتا ہے۔ جیسے نماز کا حکم ہے۔ جہاد کے بارے میں فقہائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ:

((ہو (الجہاد) فریضۃ محکمۃ وامرًا ماضیاً الیٰ یوم القیامۃ))

(الفقہ الاسلامی مع ادلتہ از دکتور وھبہ زحیلی جلد6، ص416)

''جہاد محکم فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔''

قرآن و حدیث میں جہاد و قتال کی فرضیت اور اس کے بارے میں تفصیلی فضائل اور احکامات موجود ہیں۔ اس حوالے سے ہم سب سے پہلے قرآنی آیات درج کریں گے اور ان کے بعد احادیث بیان کی جائیں گی۔

قرآن اور جہاد و قتال:

قرآنِ مجید کفار کے خلاف جہاد و قتال کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر 26 مقامات پر آیا ہے اور قتال کا تذکرہ 79 جگہ پر ہے۔

1. ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ (البقرۃ: 216)

''(اے مسلمانو!) تم پر قتال (جہاد) فرض کیا گیا ہے۔''

2. ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۝﴾ (البقرۃ: 244)

''اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں لڑو اور یقین رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

3. ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۝﴾ (التوبۃ: 29)

''(اے مسلمانو!) تم لڑو اُن اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخر کے دن پر۔ جو ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور نہ وہ سچے دین کو مانتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

4. ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ

الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○﴾ (النساء: 75)

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم جہاد و قتال نہیں کرتے، اللہ کی راہ میں۔ اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو اللہ کے آگے فریاد کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس میں ظالموں کا راج ہے۔ ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا کر دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کر دے۔''

5. ﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ (محمد: 4)

''پھر جب (اے مسلمانو!) کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو۔''

6. ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرة: 190)

''اور (اے مسلمانو!) تم اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔''

7. ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○﴾ (التوبة: 36)

''اور (اے مسلمانو!) تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو، جیسے وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں۔''

8. ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبة: 123)

''اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔''

9. ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○﴾ (التوبة: 41)

''(اے مسلمانو!) تم نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ

میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔"

10۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (التوبۃ: 39-38)

"اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین سے چپک جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے معاملے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے؟ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

11۔ ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: 39)

"اور تم کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔"

12۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ﴾ (الانفال: 65)

"اے نبیؐ! مومنین کو جہاد کا شوق دلائیں۔"

13۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبۃ: 73)

"اے نبیؐ! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کریں اور ان پر سختی کریں۔"

14۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴾ (النساء: 71)

''اے ایمان والو! اپنے دفاع کی تیاری کرو۔ پھر دستے بنا کر یا اکٹھے مل کر جہاد کے لیے نکلا کرو۔''

15۔ ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَنصُرُوا۟ ٱللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ۝﴾ (محمد: 7)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا۔''

16۔ ﴿فَرِحَ ٱلْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَـٰفَ رَسُولِ ٱللَّهِ وَكَرِهُوٓا۟ أَن يُجَـٰهِدُوا۟ بِأَمْوَٰلِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَقَالُوا۟ لَا تَنفِرُوا۟ فِى ٱلْحَرِّ ۗ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا ۚ لَّوْ كَانُوا۟ يَفْقَهُونَ ۝﴾ (التوبة: 81)

''پیچھے رہ جانے منافقین اللہ کے رسول ﷺ سے پیچھے رہنے پر بہت خوش ہوئے اور انہیں گراں گزرا کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اُنہوں نے لوگوں سے کہا: ''گرمی میں نہ نکلو۔'' آپ اُن سے کہیں: ''دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔'' کاش! اُنہیں سمجھ ہوتی۔''

17۔ ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلَّذِينَ يُقَـٰتِلُونَ فِى سَبِيلِهِۦ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَـٰنٌ مَّرْصُوصٌ ۝﴾ (الصف: 4)

''بے شک اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

18۔ ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُوا۟ وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝﴾ (الانفال: 45)

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

19۔ ﴿ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهَاجَرُوا۟ وَجَـٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ بِأَمْوَٰلِهِمْ

وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ o يُبَشِّرُهُمْ
رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ o خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ o﴾ (التوبة: 20تا22)

”جولوگ ایمان لائے، اُنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، اُن کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اُن کا رب اُن کو خوش خبری دیتا ہے، اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں اُن کے لیے دائمی نعمتیں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔“

20۔ ﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ
اَجْرًا عَظِيْمًا o﴾ (التوبة: 74)

”اور جو اللہ کی راہ میں جہاد وقتال کرے، پھر شہید ہو جائے یا غازی ہو، تو ہم اُسے بڑا اجر دیں گے۔“

21۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ
اَلِيْمٍ o تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o يَغْفِرْ
لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ
طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ o وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ
مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ o﴾ (الصف: 10 تا 13)

”اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ تم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ پھر اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا، تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن میں

نہریں بہتی ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والے باغوں میں تمہیں عمدہ گھر عطا کرے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی! اور ایک اور چیز جس کی تم تمنا رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح۔ اور (اے نبیؐ!) آپ ایمان والوں کو خوش خبری دے دیں۔''

22۔ ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْاَدْبَارَ ○ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا إِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○﴾ (الانفال: 16-15)

''اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے لشکر سے ہو تو پیٹھ نہ دکھاؤ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ دکھائی تو اُس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ البتہ اگر پیچھے ہٹنا جنگی چال کے لیے ہو یا اپنے دوسرے لشکر سے جا ملنے کے لیے ہو تو اس کی اجازت ہے۔''

23۔ ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾ (التوبة: 111)

''بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کے جان و مال خرید لیے ہیں کہ وہ انہیں ان کے بدلے میں جنت دے گا، وہ اللہ کی راہ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔''

24۔ ﴿قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهٖ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِينَ ○﴾

(التوبة: 24)

”کہہ دیجیے، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا، تمہارا وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہارے رہنے کے گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، (یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

درج بالا قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد وقتال کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قرآنِ مجید میں تین پاروں کے حجم کے برابر ایسی آیات موجود ہیں جن کا تعلق جہاد وقتال سے ہے۔

جہاد قرآن کی رُو سے فرض ہے۔ یہ دفاعی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔ جہاد اللہ کی راہ میں اُن کافروں کے خلاف کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے ملک پر حملہ کریں یا اسلام کے لیے خطرہ بن جائیں۔ یا اسلام کی راہ میں اپنے کفر وشرک اور ظلم وستم کی وجہ سے رکاوٹ بنیں۔ غیر مسلموں کے کافرانہ اور ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ کر کے اُن کو ذمی بنانا بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ پہلے قریب کے کفار سے نپٹا جائے گا، پھر دور والوں سے۔ یہ جہاد وقتال اُس وقت تک جاری رہے گا، جب تک دنیا میں کفر وشرک کے غلبے کا فتنہ باقی ہے۔ اگر مسلمان جہاد نہیں کریں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کریں گے۔ جہاد ہر حال میں کیا جائے گا۔ خواہ وسائل کم ہوں یا زیادہ۔ اقدامی جہاد کے لیے چند شرائط ہیں، مگر مدافعانہ جہاد کے لیے کوئی شرط نہیں۔ وہ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ مسلمانوں کو جہاد کا شوق دلایا گیا ہے۔ وہ اپنا تحفظ اور دفاع بھی کریں گے اور میدانِ جنگ میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے ثابت قدمی بھی دکھائیں گے۔ اللہ سبحانہٗ کا وعدہ ہے کہ وہ سچے مسلمانوں کو ہمیشہ فتح وکامرانی عطا فرمائے گا۔ جہاد سے جی چرانا منافقت کی علامت

ہے۔ جو مجاہد فتح پائے وہ غازی ہے اور جو مارا جائے وہ شہید ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔

احادیث اور جہاد و قتال:

خود نبی ﷺ نے 27 غزوات میں حصہ لے کر جہاد کیا۔ 56 سرایا بھیجے۔ ذیل میں جہاد سے متعلق احادیث پیش کی جاتی ہیں:

1۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ، قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اِیْمَانٌ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ. قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: " اَلْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ." قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: " حَجٌّ مَّبْرُوْرٌ.")) (بخاری و مسلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: مقبول حج۔"

2۔ ((عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ، قَالَ: سَاَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ : اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اِیْمَانٌ بِاللّٰهِ وَجِهَادٌ فِیْ سَبِیْلِهٖ. ......)) (بخاری و مسلم)

"حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اُس کی راہ میں جہاد کرنا۔"

3۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَثَلُ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ، لَا یَفْتُرُ مِنْ صِیَامٍ وَلَا صَلٰوةٍ حَتّٰی یَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ.)) (بخاری و مسلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کی مثال ایسے شخص کی ہے جو روزے رکھتا ہو،

قیام کرتا ہو، قرآن کی تلاوت کرتا ہو، روزے اور (نفل) نماز میں کوتاہی نہ کرتا ہو، یہاں تک کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا مجاہد واپس لوٹ آئے۔"

4۔((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيْمَانٌ بِي وَتَصْدِيْقٌ بِرُسُلِي، أَنْ أَرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيْمَةٍ، أَوْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ .))

(بخاری و مسلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ اُس کے راستے میں جو شخص جہاد کرے گا، اُسے صرف مجھ پر اور پیغمبروں پر ایمان کا جذبہ گھر سے نکالے گا، تو میں ایسے شخص کو ثواب یا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس لاؤں گا، یا اُسے جنت میں داخل کروں گا۔"

5۔ ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ لَا تَطِيْبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنِّي، وَلَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ، مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُوْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ. وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَوَدِدْتُ أَنْ أُقْتَلَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، ثُمَّ أُحْيٰى، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيٰى، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيٰى، ثُمَّ أُقْتَلُ .)) (بخاری و مسلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ کچھ مسلمان ایسے ہیں جو مجھ سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے (مگر) میں اُن کے لیے سواری کا انتظام نہیں کرسکتا...... تو میں کبھی کسی ایسے لشکر سے پیچھے نہ رہوں جو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلتا ہے۔ اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری

جان ہے، میں پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہوں۔"

6۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ .))

(صحیح مسلم)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ اُس کے دل میں جہاد کا شوق اُبھرا تو وہ منافقت کے ایک حصے پر مرا۔"

7۔ ((عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ ، عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ لَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُجَهِّزْ غَازِيًا ، اَوْ يَخْلُفْ غَازِيًا فِیْ اَهْلِهٖ بِخَيْرٍ ، اَصَابَهُ اللّٰهُ بِقَارِعَةٍ ...... قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ .)) (سنن ابی داؤد)

"حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نہ خود جہاد کیا، نہ کسی مجاہد کو جہاد کا سامان فراہم کیا اور نہ کسی مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی بھلائی کے ساتھ دیکھ بھال کی ، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔"

8۔ ((عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: رِبَاطُ يَوْمٍ ...... فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا .))

(بخاری و مسلم)

"سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں ایک دن سرحدوں پر پہرہ دینا ، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔"

9۔ ((عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَغَدْوَةٌ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ أَوْ رَوْحَةٌ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا. ")) (بخاری و مسلم)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں ایک صبح جانا اور ایک شام جانا، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اُس سے بہتر ہے۔“

10۔ ((عَنْ سُلْمَانَ الْفَارِسِيِّ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: رِبَاطُ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، خَيْرٌ مِّنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَّقِيَامِهٖ، وَإِنْ مَاتَ جَرٰى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهٗ وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ، وَأَمِنَ الْفَتَّانَ.)) (صحیح مسلم)

”حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات سرحدوں پر پہرہ دینا ایک مہینے کے روزوں اور اس (کی راتوں) کے قیام سے بہتر ہے۔ اگر وہ شخص اسی حالت میں فوت ہو جائے تو جو عمل وہ کرتا تھا، وہ برابر جاری رہے گا اور وہ قبر کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔“

11۔ ((عَنْ أَبِيْ عَبْسٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَتَمَسَّهُ النَّارُ.)) (صحیح بخاری)

”حضرت ابوعبس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے اُس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی۔“

12۔ ((عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَهَا فَقَدْ عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ إِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ.)) (بخاری و مسلم)

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں۔ پھر جو اس کا قائل ہو گیا تو اس نے اپنا مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچالیا، سوائے اُس کے حق کے اور اُس کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔"

((نوٹ :...... بعض حالات میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور جزیہ لے کر بھی ذمیوں کے خلاف جہاد نہیں کیا جائے گا۔))

13۔ ((عَنْ زَيْدِ بْنِ خَالِدٍ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰه فَقَدْ غَزَا ، وَمَنْ خَلَفَ غَازِيا فِيْ اَهْلِه ...... فَقَدْ غَزَا .)) (بخاری و مسلم)

"حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو ساز و سامان مہیا کیا، اُس نے بھی جہاد کیا۔ اور جس نے کسی مجاہد کے اہل و عیال کی دیکھ بھال کی اُس نے بھی جہاد میں حصہ لیا۔"

14۔ ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: عَيْنَانِ لَا تَمَسُّهُمَا النَّارُ : عَيْنٌ بَكَتْ فِيْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ .)) (ترمذی)

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی۔ دوسری وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں رات بھر پہرہ دیتی رہی۔"

15۔ ((عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى رضی اللہ عنہ ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ ، فَقَالَ: اَلرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانُهٗ ، فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ

كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ، فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ .))

(بخاری ، مسلم ، ابو داؤد ، نسائی)

"حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے پوچھا: ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک اس لیے لڑتا ہے کہ اُس کی بہادری کی نمائش ہو تو ان میں سے کوئی اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو محض اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا حکم بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔"

16۔ ((عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ ، اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ قَاتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ ، فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ ، وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، اَوْ نُكِبَ نَكْبَةً ...... فَاِنَّهَا تَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَغْزَرِ مَا كَانَتْ ، لَوْنُهَا الزَّعْفَرَانُ ، وَرِيْحُهَا الْمِسْكُ . وَمَنْ خَرَجَ بِهٖ خُرَاجٌ ...... فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، فَاِنَّ عَلَيْهِ طَابَعَ الشُّهَدَاءِ .)) (ترمذی، ابو داؤد ، نسائی)

"حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس کسی نے اللہ کے راستے میں اونٹنی کا دودھ دوہنے کے وقت کے برابر جہاد کیا، اُس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور جس شخص کو اللہ کی راہ میں زخم لگا، یا چوٹ لگی تو وہ زخم یا چوٹ قیامت کے دن اتنی بڑی ہوگی جتنی دنیا میں بڑی سے بڑی ہو۔ اُس کے خون کا رنگ زعفران کی طرح ہوگا۔ اُس کی خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔ اور جس آدمی کو اللہ کی راہ میں پھوڑا نکل آیا تو بے شک اس پر شہیدوں کا نشان ہے۔"

17۔ ((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابُهٗ

حَتّٰى سَبَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ اِلٰى بَدْرٍ ، وَجَاءَ الْمُشْرِكُوْنَ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿قُوْمُوْا اِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ قَالَ عُمَيْرُ بْنُ الْحَمَّامِ: بَخْ بَخْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا حَمَلَكَ عَلٰى قَوْلِكَ: بَخْ بَخْ. قَالَ: لَا ، وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِلَّا رِجَاءَ اَنْ اَكُوْنَ مِنْ اَهْلِهَا. قَالَ: فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا. قَالَ: فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرْنِهٖ ، فَجَعَلَ يَاْكُلُ مِنْهُنَّ. ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ اَنَا حَيِيْتُ حَتّٰى اٰكُلَ تَمَرَاتِيْ اِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ. قَالَ: فَرَمٰى بِمَا كَانَ مَعَهٗ مِنَ التَّمْرِ ، ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتّٰى قُتِلَ.))

(صحيح مسلم ، كتاب الامارة ، حديث نمبر: 4915)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام روانہ ہوئے ، یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اتنے میں مشرکین بھی آ گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کھڑے ہو جاؤ! اُس جنت میں جانے کے لیے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔“

یہ سن کر حضرت عمیر بن حمام رضی اللہ عنہما نے کہا: ”واہ واہ۔“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ”یہ تم نے کیوں کہا؟“ اُس نے جواب دیا: ”اللہ کی قسم! یا رسول اللہ ﷺ! صرف اس اُمید پر کہ میں جنتی ہو جاؤں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بے شک تو جنتی ہے۔“ راوی نے کہا: ”اُس شخص نے اپنے ترکش سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگا۔ پھر کہنے لگا: اگر میں یہ کھجوریں کھاتا رہا تو زندگی لمبی ہو جائے گی۔ راوی نے کہا: پھر اُس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر شہید ہو گیا۔“

18۔ ((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما ، اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

قَالَ: اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُکَفِّرُ کُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ .))

(صحیح مسلم)

"حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہید ہونا قرض کے سوا تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔"

19۔ ((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ ، یُحِبُّ اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَهٗ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ ، اِلَّا الشَّهِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا ، فَیُقْتَلَ عَشَرَ مَرَّاتٍ لِمَا یَرٰی مِنَ الْکَرَامَةِ .)) (بخاری و مسلم)

"حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص جو جنت میں جائے گا، کبھی دنیا میں واپس لوٹنا پسند نہیں کرے گا، اگرچہ اُسے روئے زمین کی ساری دولت دی جائے، لیکن شہید یہ آرزو کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جا کر دس بار شہید ہو۔ کیونکہ اُسے شہادت کا مقام و مرتبہ معلوم ہوگا۔"

20۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا یُکْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُکْلَمُ فِیْ سَبِیْلِهٖ...... اِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَجُرْحُهٗ یَثْعَبُ...... دَمًا ، اَللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ ، وَالرِّیْحُ رِیْحُ الْمِسْكِ .)) (بخاری و مسلم)

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہوتا ہے...... اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اُس کی راہ میں کون زخمی ہوا...... تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، جس کا رنگ خون جیسا ہی ہوگا، مگر خوشبو کستوری جیسی خوشبو ہوگی۔"

21۔ ((عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فِیْهِمْ ،

فَذَكَرَ لَهُمْ اَنَّ الْجِهَادَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَالْاِيْمَانَ بِاللّٰهِ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَءَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، يُكَفِّرُ عَنِّيْ خَطَايَايَ؟ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، اِنْ قُتِلْتَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ . ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ قُلْتَ؟ فَقَالَ: اَرَءَيْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، اَيُكَفِّرُ عَنِّيْ خَطَايَايَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ ، اِلَّا الدَّيْنَ ، فَاِنَّ جِبْرِيْلَ قَالَ لِيْ ذٰلِكَ .)) (صحيح مسلم)

’’حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر صحابہ کرام کو بتایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا افضل کام ہیں۔ یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوکر کہنے لگا: ’’یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ بتائیں اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ہاں! اگر تو اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہو اور ثواب کی خاطر ایسا کرے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹے اور پھر شہید ہو جائے تو تیرے گناہ معاف ہو جائیں گے۔‘‘ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس آدمی سے دریافت فرمایا: ’’تو نے کیا پوچھا تھا؟‘‘

وہ بولا: ’’اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا اس سے میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’ہاں! جب تو ثابت قدم ہو، ثواب کی نیت رکھے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹے۔ البتہ قرض معاف نہ ہوگا۔ مجھے جبرائیل علیہ السلام نے یہی بتایا ہے۔‘‘

22۔ ((عَنِ ابْنِ عُمَرَ ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِذَا

تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ وَأَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ، سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ.)) (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: 3462)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ: جب تم بیع عینہ کروگے، بیلوں کی دُمیں تھامے کھیتی باڑی سے خوش رہو گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کردے گا، جسے اُس وقت تک تم سے نہیں ہٹائے گا، جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہیں لوٹو گے۔ (اور جہاد نہیں کروگے۔)''

غور کیجیے اس حدیث میں صرف جہاد کو دین قرار دیا گیا ہے۔

23۔ ((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّينُ قَائِمًا، تُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتّٰى تَقُومَ السَّاعَةُ.)) (صحیح مسلم)

''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔ قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرتی رہے گی۔''

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں جہاد وقتال کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے کہ جہاد وقتال ایک فریضہ ہے۔ ایمان لانے کے بعد جہاد افضل عمل ہے۔ جہاد ایک عبادت ہے۔ مجاہد سے فتح ونصرت اور مالِ غنیمت کا وعدہ ہے یا پھر جنت کا وعدہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جہاد کیا اور صحابہ کرام کو اس کی ترغیب فرمائی۔ جہاد سے جی چرانا منافقت ہے۔ جہاد کو چھوڑ دینے میں ذلت اور مصیبت ہے۔ ایک دن رات اسلامی سرحدوں پر پہرہ دینا، ساری دنیا کے مال و دولت سے بہتر ہے۔ راہِ جہاد میں جن قدموں پر گردوغبار پڑ جائے اُن قدموں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ''جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔'' (ابو داؤد، کتاب الجهاد)

مجاہد کے لیے سازو سامان مہیا کرنا بھی جہاد ہے۔ قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

دفاعی اور جارحانہ جہاد:

لیکن اسلام اپنے دفاع کے لیے بھی مسلمانوں کو جہاد کرنے کی اجازت دیتا ہے اور اپنے خلاف کسی ممکنہ خطرے کے خلاف جارحانہ جہاد کا اعلان بھی کرتا ہے۔ اس بارے میں قرآن واحادیث کی تصریحات واضح ہیں۔

جب مسلمانوں کے علاقے پر کفار حملہ کردیں تو اس صورت میں اسلام اپنے ماننے والوں کو دفاعی جہاد کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ اسے قتال فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں لڑنے کا نام دیتا ہے۔ سیرت نبوی ﷺ میں اس کی مثالیں غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد اور غزوۂ خندق ہیں۔ دفاعی جہاد کے لیے کسی قسم کی کوئی شرط نہیں۔ یہ ہر حال میں اور ہر صورت میں کیا جائے گا۔ البتہ جارحانہ جہاد کے لیے چند شرائط ہیں۔

اسی طرح اسلام اپنے خلاف دشمنوں کے ممکنہ خطرے کے پیش نظر اپنے پیروکاروں کو جارحانہ جہاد کی اجازت بھی دیتا ہے۔ سیرت طیبہ میں اس کی درج ذیل مثالیں موجود ہیں۔

1۔ فتح مکہ
2۔ غزوۂ حنین
3۔ غزوۂ طائف
4۔ غزوۂ تبوک

اس کے علاوہ خلافت راشدہ کے دور میں ایران اور مصر کے خلاف جنگ بھی جارحانہ جہاد کی مثالیں ہیں۔

انگریزوں کے ''خود کاشتہ پودے'' اور آلۂ کار، نبوت کے جھوٹے مدعی مرزا غلام احمد قادیانی نے بھی غامدی صاحب کی طرح جہاد کو حرام قرار دیا تھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

دراصل قادیانی تحریک انگریزوں کے اشارے پر برپا ہی اس لیے کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد وحریت ختم کر دیا جائے۔

لیکن الحمدللہ، اب غیروں کی سازشوں اور غامدی صاحب جیسے لوگوں کی مفاد پرستیوں، ہرزہ سرائیوں اور مغرب کی ہم نوائیوں کے باوجود حالات کا رُخ بدل چکا ہے۔ مسلمان مجاہدین نے جہاد کی برکت سے روس جیسی سپر پاور کا غرور خاک میں ملایا ہے، جو بیسویں صدی کا عظیم معجزہ ہے۔ اب وہ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں کو افغانستان اور عراق میں ناکوں چنے چبوا رہے ہیں اور ایک نہ ایک دن ان سب کو وہاں سے دُم دبا کر بھاگنا پڑے گا۔

شہید کے فضائل

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

اسلام میں شہید کے لیے بڑی فضیلت ہے اور اُسے اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔

شہید وہ شخص ہے جو دین کی سربلندی کے لیے کافروں اور اسلام کے دشمنوں سے لڑتا ہوا اپنی جان دے دیتا ہے اور اس طرح اپنے ایمان پر سچائی کی گواہی دے دیتا ہے۔

قرآن و حدیث میں شہید کے لیے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔

قرآن اور شہید:

قرآنِ مجید میں شہید کے لیے شُھَدَآءُ کا لفظ جمع کی صورت میں درج ذیل مقامات پر آیا ہے۔ پہلے مقام کی تصریح امام ابن جریر طبریؒ نے اپنی تفسیر میں اور امام بغویؒ نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں کر دی ہے کہ اس سے مراد وہ مسلمان ہیں جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں۔

1۔ ﴿ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء: 69)

”اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوگا، جن پر اللہ نے انعام کیا۔ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت۔“

دوسرا مقام سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 141 ہے، جس میں یہ الفاظ آئے ہیں:

2۔ ﴿ وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾ (آل عمران: 141)

”اور وہ (اللہ) تم میں سے کچھ کو شہید بنائے۔“

اس کی تفسیر میں بھی شُھَدَآءَ سے وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو راہِ حق میں شہید ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفسیر میں امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ:

((اَیْ یُکْرِمَکُمْ بِالشَّهَادَةِ، اَیْ لِیُقْتَلَ قَوْمٌ فَیَکُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَی النَّاسِ بِاَعْمَالِهِمْ.)) (تفسیر قرطبی، جلد 4، ص: 218)

”یعنی تمھیں شہادت کا اعزاز بخشے۔ کچھ لوگ شہید ہوکر اپنے اعمال کے ذریعے لوگوں پر گواہ بنیں۔“

اسی آیت کی تفسیر میں شیخ احمد مصطفیٰ مراغی لکھتے ہیں کہ:

((اَیْ وَلِیُکْرِمَ نَاسًا مِنْکُمْ بِالشَّهَادَةِ وَالْقَتْلِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ.))

(تفسیر مراغی، جلد 4، ص: 80)

”مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں میں سے بعض کو اللہ کی راہ میں شہادت کے مرتبے پر فائز کرے۔“

اس کے علاوہ شہیدوں اور شہادت کے حوالے سے قرآنِ مجید کی درج ذیل آیات دیکھیے:

3۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ o﴾

(التوبۃ: 111)

"بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کے جان و مال خرید لیے ہیں کہ وہ اُنہیں ان کے بدلے میں جنت دے گا۔ وہ اللہ کی راہ میں دوسروں کو ہلاک بھی کرتے ہیں اور خود شہید بھی ہوتے ہیں۔ یہ اللہ کے ذمے ایک پکا وعدہ ہے جو توریت، انجیل اور قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا (اے مسلمانو!) اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ کیا ہے، خوشیاں مناؤ اور یہی ہے سب سے بڑی کامیابی۔"

4۔ ﴿وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ﴾ (محمد: 4)

"اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہوئے، اللہ اُن کے اعمال ہرگز ضائع نہ کرے گا۔"

5۔ ﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ o لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ o﴾ (الحج: 58-59)

"اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی۔ پھر وہ شہید کر دیے گئے یا فوت ہو گئے، اللہ ضرور اُنہیں اچھا رزق دے گا۔ بے شک اللہ ہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ وہ اُن کو ایسا ٹھکانہ دے گا، جسے وہ پسند کریں گے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور تحمل والا ہے۔"

6۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ o﴾ (البقرۃ: 154)

''اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں، اُنہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اُن کی زندگی کی خبر نہیں۔''

7۔ ﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾ (النساء: 74)

''اور جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے پھر شہید ہو جائے یا غازی، تو ہم اُسے بڑا اجر دیں گے۔''

8۔ ﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

(آل عمران: 154)

''پھر وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی، اپنا گھر بار چھوڑا، جو میری راہ میں ستائے گئے، جنہوں نے جہاد کیا اور شہید ہوئے، میں ضرور اُن کی خطائیں اُن سے دور کروں گا اور اُنہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا، جن میں نہریں جاری ہوں گی اور یہ سب اللہ کی طرف سے اُنہیں اجر ملے گا۔ اور بہترین اجر تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

9۔ ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (آل عمران: 169-170)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں، اُنہیں مردہ نہ سمجھو، وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور اُنہیں روزی ملتی ہے۔ وہ اس پر خوش ہیں جو اللہ نے اُن پر فضل فرمایا۔ اور جو لوگ اُن کے پیچھے دنیا میں ہیں اور ابھی تک اُن سے نہیں ملے، اُن کے بارے میں بھی یہ خیال کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ان کے لیے بھی

نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

10۔ ﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ ۝﴾

(آل عمران: 157-158)

''اور اگر تم اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤ یا وفات پاؤ، دونوں صورتوں میں تمہیں اللہ کی طرف سے جو بخشش اور رحمت نصیب ہوگی، وہ اس مال و دولت سے بہتر ہے، جسے لوگ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم وفات پاؤ یا شہید ہو جاؤ، ہر حال میں اللہ ہی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

11۔ ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِينَ وَحَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيمًا ۝﴾ (النساء: 69-70)

''اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کریں گے، وہ آخرت میں اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت! یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ کا علم کافی ہے۔''

12۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝﴾ (آل عمران: 139-140)

''اور تم ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو، بلکہ تمہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ۔ اگر تم نے چوٹ کھائی ہے تو کیا ہوا، اس سے پہلے تمہارا دشمن بھی اسی طرح

کی چوٹ کھا چکا ہے۔ اور ہم ایسے واقعات کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی، تاکہ اللہ سچے اور مخلص مسلمانوں کی پہچان کرادے اور تم میں سے کچھ کو شہید بنادے۔ اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا...... اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو چھانٹ لے اور ان کے ہاتھوں کافروں کا زور توڑ دے۔"

مذکورہ بالا آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں شہید کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ:

1۔ شہید کو قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کی صف میں جگہ ملے گی۔ اور اُن کی معیت نصیب ہوگی۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے اُن اہل ایمان کے جان و مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد و قتال کر کے غازی بن جاتے ہیں یا شہید ہو جاتے ہیں۔

3۔ آخرت میں شہید کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔ اُن کو خاص رزق عطا ہوگا۔

4۔ جو اللہ کی راہ میں مارا جائے اُسے مردہ نہ کہا جائے، بلکہ اُسے شہید کہا جائے۔

5۔ مجاہد غازی ہو یا شہید دونوں صورتوں میں بڑے اجر کا مستحق ہے۔

6۔ شہید کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں اور وہ جنت کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

احادیث اور شہید:

قرآنی آیات کے بعد اب ہم چند ایسی احادیث درج کریں گے، جن میں شہید کے فضائل و درجات بیان کیے گئے ہیں:

1۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْلَا اَنَّ رِجَالًا مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ لَا تَطِیْبُ اَنْفُسُهُمْ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنِّیْ، وَلَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُهُمْ عَلَیْهِ، مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِیَّةٍ تَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ

أُقْتَلُ .)) (بخاری و مسلم)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ کچھ مسلمان ایسے ہیں جو مجھ سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے، مگر میں اُن کے لیے سواری کا بندوبست نہیں کر پاتا، تو میں کبھی ایسے لشکر کے پیچھے نہ رہتا جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتا۔ اُس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔''

2۔ ((عَنْ أَنَسٍ رضي الله عنه ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْ أَحَدٍ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ ، يُحِبُّ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَلَهُ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا الشَّهِيْدُ يَتَمَنّٰى أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا ، فَيُقْتَلُ عَشَرَ مَرَّاتٍ ، لِمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ .)) (بخاری و مسلم)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی شخص جو جنت میں چلا گیا کبھی واپس دنیا کی طرف لوٹنا پسند نہیں کرے گا، اگرچہ اُسے روئے زمین کی تمام دولت دے دی جائے، مگر شہید یہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور دس بار شہید کیا جائے، کیونکہ اُسے شہادت کا مقام و مرتبہ معلوم ہو چکا ہوگا۔''

3۔ ((عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِيْ عُمَيْرَةَ رضي الله عنه ، أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ نَفْسٍ مُسْلِمَةٍ يَقْبِضُهَا رَبُّهَا ، تُحِبُّ أَنْ تَرْجِعَ إِلَيْكُمْ ، وَأَنَّ لَهَا الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا ، غَيْرُ الشَّهِيْدِ...... قَالَ ابْنُ أَبِيْ عُمَيْرَةَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَأَنْ أُقْتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، أَحَبُّ إِلَيَّ

مِنْ اَنْ یَکُوْنَ لِیْ اَهْلُ الْوَبَرِ وَالْمَدَرِ......)) (سنن نسائی)

''حضرت عبدالرحمٰن بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سوائے شہید کے کوئی مسلمان جس کی رب نے جان قبض کی ہوگی تمہاری طرف واپس آنا پسند نہ کرے گا، اگرچہ اُسے دنیا بھر کا مال و دولت دے دیا جائے۔'' ابن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اللہ کی راہ میں شہید ہونا اس سے زیادہ پسند ہے کہ مجھے خیموں اور عمارتوں میں رہنے والوں کا مالک بنا دیا جائے۔''

4۔ ((عَنْ حَسْنَاءَ بِنْتِ مُعَاوِيَةَ ، قَالَتْ: حَدَّثَنَا عَمِّي ، قَالَ: قُلْتُ لِلنَّبِيِّ ﷺ: مَنْ فِي الْجَنَّةِ؟ قَالَ: اَلنَّبِيُّ فِي الْجَنَّةِ، وَالشَّهِيْدُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْمَوْلُوْدُ فِي الْجَنَّةِ، وَالْوَئِيْدُ فِي الْجَنَّةِ .))

(سنن ابی داؤد)

''حضرت حسناء بنت معاویہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ مجھے میرے چچا نے بتایا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، جنت میں کون جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نبی جنت میں، شہید جنت میں، بچے جنت میں اور زندہ درگور کیے گئے بچے جنت میں جائیں گے۔''

5۔ ((عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "اِنَّ اَبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ . " فَقَامَ رَجُلٌ رَثُّ الْهَيْئَةِ فَقَالَ: يَا اَبَا مُوْسٰى! اَنْتَ سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ هٰذَا؟ قَالَ: نَعَمْ . فَرَجَعَ اِلٰى اَصْحَابِهٖ، فَقَالَ: اَقْرَءُ عَلَيْكُمُ السَّلَامَ، ثُمَّ كَسَرَ جَفْنَ سَيْفِهٖ، فَاَلْقَاهُ، ثُمَّ مَشٰى بِسَيْفِهٖ اِلَى الْعَدُوِّ فَضَرَبَ بِهٖ حَتّٰى قُتِلَ .)) (صحیح مسلم)

''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک جنت کے دروازے تلواروں کے سائے تلے ہیں۔" یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا جو پراگندہ حال تھا۔ اُس نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ! تو نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بات فرماتے خود سنا ہے؟ اُس نے جواب دیا: "جی ہاں۔" (یہ سن کر) وہ اپنے ساتھیوں کی طرف گیا اور اُن کو سلام کیا۔ اس کے بعد اُس نے تلوار کی میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی طرف گیا۔ پھر تلوار چلاتے چلاتے شہید ہو گیا۔"

6۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلشَّهِیْدُ لاَ یَجِدُ اَلَمَ الْقَتْلِ اِلاَّ كَمَا یَجِدُ اَحَدُكُمْ اَلَمَ الْقَرْصَةِ))

(ترمذی، نسائی، دارمی)

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہید کو شہید ہوتے وقت صرف اتنی تکلیف ہوتی ہے، جتنی تم میں سے کسی کو چیونٹی کے کاٹنے کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔"

7۔ ((عَنِ الْمِقْدَامِ بْنِ مَعْدِیْ كَرِبَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لِلشَّهِیْدِ عِنْدَ اللّٰهِ سِتُّ خِصَالٍ: یُغْفَرُ لَهٗ فِیْ اَوَّلِ دَفْعَةٍ، وَیُرٰی مَقْعَدَهٗ مِنَ الْجَنَّةِ، وَیُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَیَاْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْاَكْبَرِ، وَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِهٖ تَاجُ الْوَقَارِ، اَلْیَاقُوْتَةُ مِنْهَا خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا، وَیُزَوَّجُ ثِنْتَیْنِ وَسَبْعِیْنَ زَوْجَةً مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ، وَیُشَفَّعُ فِیْ سَبْعِیْنَ مِنْ اَقْرِبَاءِهٖ.)) (ترمذی، ابن ماجہ)

"حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہید کے لیے چھ انعامات ہیں:

(1) اُس کے جسم سے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اُس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

(2) اُسے جنت میں اُس کا مقام دکھایا جاتا ہے۔

(3) وہ قبر کے عذاب سے بچ جاتا ہے اور اُسے قیامت کی بڑی گھبراہٹ سے امن حاصل ہوتا ہے۔

(4) اُس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جاتا ہے، جس کا ایک یاقوت دنیا بھر سے زیادہ قیمتی ہے۔

(5) اُس کا نکاح بہتر (72) حوروں سے کیا جاتا ہے۔

(6) وہ اپنے ستر (70) رشتہ داروں کی شفاعت کرے گا۔''

8۔ ((عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَأَصْحَابُهٗ حَتّٰى سَبَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ اِلٰى بَدْرٍ، وَجَاءَ الْمُشْرِكُوْنَ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿ قُوْمُوْا اِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ. ﴾

قَالَ عُمَيْرُ بْنُ الْحَمَّامِ: بَخٍ بَخٍ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا يَحْمِلُكَ عَلٰى قَوْلِكَ: بَخٍ بَخٍ. قَالَ: لَا، وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِلَّا رَجَاءَ اَنْ اَكُوْنَ مِنْ اَهْلِهَا. قَالَ: فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا. قَالَ: فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرَنِهٖ، فَجَعَلَ يَاْكُلُ مِنْهُنَّ. ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ اَنَا حَيِيْتُ حَتّٰى اٰكُلَ تَمَرَاتِيْ اِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ. قَالَ: فَرَمٰى بِمَا كَانَ مَعَهٗ مِنَ التَّمْرِ، ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتّٰى قُتِلَ.)) (صحیح مسلم)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم روانہ ہوئے، یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اتنے میں مشرکین بھی آ گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کھڑے ہو جاؤ! اُس جنت میں جانے کے لیے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واہ واہ۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ

نے اُن سے پوچھا: ''یہ تم نے کیوں کہا؟'' اُس نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! یا رسول اللہ ﷺ! صرف اس اُمید پر کہ میں جنتی ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک تو جنتی ہے۔'' راوی نے کہا: ''اُس شخص نے اپنے ترکش سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگا۔ پھر کہنے لگا: اگر میں یہ کھجوریں کھاتا رہا تو زندگی لمبی ہو جائے گی۔ راوی نے کہا: پھر اُس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر شہید ہو گیا۔''

9۔ ((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما ، اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُكَفِّرُ كُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ .))

(صحیح مسلم)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہید ہونا قرض کے سوا تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

10۔ ((عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فِیْهِمْ ، فَذَكَرَ لَهُمْ اَنَّ الْجِهَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰهِ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَءَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، یُكَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ .

ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَیْفَ قُلْتَ؟

فَقَالَ: اَرَءَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، اَیُكَفِّرُ عَنِّیْ خَطَایَایَ؟

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَیْرُ مُدْبِرٍ ، اِلَّا الدَّیْنَ ، فَاِنَّ جِبْرِیْلَ قَالَ لِیْ ذٰلِكَ .)) (صحیح مسلم)

''حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر

صحابہ کرام کو بتایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا افضل کام ہیں۔
یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ بتائیں اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! اگر تو اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہو اور ثواب کی خاطر ایسا کرے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹے اور پھر شہید ہو جائے تو تیرے گناہ معاف ہو جائیں گے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُس آدمی سے دریافت فرمایا: ''تو نے کیا پوچھا تھا؟''
وہ بولا: ''اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں تو کیا اس سے میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! جب تو ثابت قدم ہو، ثواب کی نیت رکھے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹے۔ البتہ قرض معاف نہ ہوگا۔ مجھے جرائیل علیہ السلام نے یہی بتایا ہے۔''

11۔ ((عَنْ مَسْرُوْقٍ قَالَ: سَأَلْنَا عَبْدَ اللّٰهِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ ، عَنْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ:
﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾
قَالَ: اِنَّا قَدْ سَاَلْنَا عَنْ ذٰلِكَ .
فَقَالَ: اَرْوَاحُهُمْ فِيْ اَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ ، لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَآءَتْ ، ثُمَّ تَاْوِيْ اِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيْلِ ، فَاطَّلَعَ اِلَيْهِمْ رَبُّهُمُ اطِّلَاعَةً فَقَالَ: هَلْ تَشْتَهُوْنَ شَيْئًا؟ قَالُوْا: اَيَّ شَيْءٍ نَشْتَهِيْ وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا . فَفَعَلَ ذٰلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ . فَلَمَّا رَاَوْا اَنَّهُمْ لَنْ يُتْرَكُوْا مِنْ اَنْ

يَسْأَلُوا ...... قَالُوا: يَا رَبِّ! نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتَّى نُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ مَرَّةً أُخْرَى ، فَلَمَّا رَأَى أَنْ لَيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوا .)) (صحیح مسلم)

''مسروق رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا کہ:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴾ (آل عمران: 169)

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں اُن کو مردہ نہ سمجھو، وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور اُنہیں روزی ملتی ہے۔''

تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے اس آیت کے بارے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''شہیدوں کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہیں۔ جن کے لیے عرش کے پاس فانوس لٹکے ہوئے ہیں۔ وہ جہاں چاہتے ہیں جنت میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ پھر واپس ان فانوسوں میں آ کر بسیرا کرتے ہیں۔ ان کا رب اُن سے پوچھتا ہے، تمہیں اور کچھ چاہیے؟ وہ جواب دیتے ہیں: ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہم جنت میں ہیں۔ جہاں چاہتے ہیں اُڑتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سے تین بار پوچھتا ہے اور ہر بار وہ یہی جواب دیتے ہیں۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے مزید پوچھا جاتا رہے گا تو عرض کرتے ہیں:

اے ہمارے رب! ہم چاہتے ہیں کہ تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دے، تا کہ ہم تیری راہ میں ایک دفعہ پھر شہید ہوں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان سے یہ اقرار لے لیتا ہے کہ اُنہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں تو ان سے پوچھنا چھوڑ دیتا ہے۔''

12۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
''میں نے اُس رات کو دو آدمی دیکھے جو میرے پاس آئے اور مجھے ساتھ لے کر ایک درخت پر چڑھ گئے۔ پھر وہ مجھے ایک ایسے مکان میں لے گئے جو اتنا خوب صورت اور عمدہ تھا کہ اُس جیسا مکان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ وہ دونوں بولے: ((هٰذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ)) ''یہ مکان شہیدوں کا گھر ہے۔''

(صحیح بخاری ، حدیث نمبر: 1386)

13۔ ((عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ: أَنَّ أُمَّ الرُّبَيِّعِ بِنْتَ الْبَرَاءِ ...... وَهِيَ أُمُّ حَارِثَةَ بْنِ سُرَاقَةَ ...... أَتَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ! أَلَا تُحَدِّثُنِي عَنْ حَارِثَةَ؟ وَكَانَ قُتِلَ يَوْمَ بَدْرٍ ، أَصَابَهُ سَهْمٌ غَرْبٌ ، فَإِنْ كَانَ فِي الْجَنَّةِ صَبَرْتُ ، وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذٰلِكَ اجْتَهَدْتُ عَلَيْهِ فِي الْبُكَاءِ . قَالَ: يَا أُمَّ حَارِثَةَ! إِنَّهَا جِنَانٌ فِي الْجَنَّةِ ، وَإِنَّ ابْنَكِ أَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْأَعْلٰى .)) (صحیح بخاری ، حدیث نمبر: 2809)

''حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ اُمّ ربیع بنت براء رضی اللہ عنہا جو کہ حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں، نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حارثہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے؟ (کہ اُن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ حارثہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں ایک اندھا تیر لگنے سے شہید ہوئے تھے۔) اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کرلوں اور اگر کہیں اور ہے تو میں اُسے خوب رولوں۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے حارثہ کی ماں! جنت میں بہت سے درجے ہیں۔ تیرا بیٹا فردوسِ اعلیٰ میں ہے۔''

14۔ ((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : يَضْحَكُ اللّٰهُ لِرَجُلَيْنِ يَقْتُلُ أَحَدُهُمَا الْآخَرَ كِلَاهُمَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ . قَالُوا:

وَكَيْفَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: يُقْتَلُ هٰذَا فَيَلِجُ الْجَنَّةَ . ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَى الْاٰخَرِ فَيَهْدِيْهِ إِلَى الْإِسْلَامِ ، ثُمَّ يُجَاهِدُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُسْتَشْهَدُ .)) (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 2826، صحیح مسلم، حدیث نمبر: 4892، 4894، سنن نسائی، موطا امام مالکؒ، السنن الکبریٰ، بیہقی، مشکوٰۃ المصابیح، حدیث نمبر: 3807)

"اللہ تعالیٰ کو ان دو آدمیوں پر ہنسی آئے گی جن میں سے ایک نے دوسرے کو شہید کیا ہوگا، مگر دونوں جنت میں جائیں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! وہ کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جو آدمی شہید ہوگا وہ تو جنت میں جائے گا، مگر اللہ تعالیٰ اُس کے شہید کرنے والے کو توبہ کی توفیق دے گا، پھر اُسے اسلام کی ہدایت دے گا، پھر وہ بھی مسلمان ہونے کے بعد اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہوگا۔ (وہ بھی جنت میں جائے گا۔)"

15۔ ((عَنِ الْبَرَاءِ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِالْحَدِيْدِ فَقَالَ:

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! أُقَاتِلُ أَوْ أُسْلِمُ؟

قَالَ: أَسْلِمْ ثُمَّ قَاتِلْ .

فَأَسْلَمَ ثُمَّ قَاتَلَ فَقُتِلَ ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:

عَمِلَ قَلِيْلًا وَأُجِرَ كَثِيْرًا .)) (صحیح بخاری، حدیث نمبر: 2808)

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص لوہے کی (جنگی) ٹوپی پہن کر آیا اور عرض کیا:

یا رسول اللہ ﷺ! میں قتال کروں یا اسلام لاؤں؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

اسلام لاؤ، پھر قتال کرو۔

چنانچہ وہ آدمی ایمان لایا اور پھر اسی وقت جہاد میں لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص نے عمل تھوڑا کیا اور اجر زیادہ پا گیا۔"

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں شہید کا مقام ومرتبہ یوں واضح ہوجاتا ہے کہ:

1۔ خود نبی ﷺ نے بار بار شہید ہونے کی تمنا کی ہے۔

2۔ شہید جنت میں جانے کے بعد دنیا میں دوبارہ آنے کی آرزو کرے گا، تاکہ وہ دوبارہ شہید ہوکر جنت کا اعلیٰ ترین مقام حاصل کرے۔

3۔ شہادت کا درجہ دنیا بھر کے مال ودولت سے زیادہ قیمتی ہے۔

4۔ شہید کے لیے جنت کا وعدہ ہے۔ شہادت کا صلہ جنت ہے۔

5۔ شہادت کے وقت شہید کو اتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی، جتنی تکلیف ایک چیونٹی کے کاٹنے سے انسان کو ہوتی ہے۔

6۔ شہید کو قبر ہی میں اُس کا جنت میں ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔

7۔ شہید قبر کے عذاب سے محفوظ رہے گا۔

8۔ شہید قیامت کی بڑی گھبراہٹ سے امن میں رہے گا۔

9۔ قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

10۔ شہید کو آخرت میں عزت ووقار کا تاج پہنایا جائے گا۔

جب قرآن وحدیث میں جہاد وقتال اور شہادت کے بارے میں اس قدر نصوص اور واضح احکام موجود ہیں اور ان پر نبی ﷺ نے، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، خلفائے راشدین نے، اور اُس کے بعد سے لے کر آج تک اہل اسلام نے ہر دَور میں عمل کیا ہے تو غامدی صاحب کس منہ سے جہاد جیسے واضح اور منصوص حکم کا انکار کر سکتے ہیں اور جب وہ اس کا انکار کرتے ہیں تو کیوں نہ اُن کو بھی مرزا قادیانی کی طرح دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے؟

10۔ مالِ غنیمت کی بحث

غامدی صاحب نے مالِ غنیمت میں مجاہدین کے مقررہ حصے کا بھی انکار کیا ہے اور اُن کا

یہ انکار قابل فہم بھی ہے کیونکہ جو شخص سرے سے کفار کے خلاف جہاد ہی کو نہیں مانتا وہ مال غنیمت پر مجاہدین کے حق کو کیسے تسلیم کرے گا۔ چنانچہ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''زمانۂ رسالت کی یہ جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات وجوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے حکم پر میدان میں اُترے اور براہ راست اُس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے۔ لہٰذا ان جنگوں کے مال غنیمت پر اُن کا کوئی حق اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا۔''

(میزان، 607، طبع سوم مئی 2008، لاہور)

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:

''اموال غنیمت سے متعلق اس بحث سے واضح ہے کہ یہ اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاہدین کا کوئی ابدی حق ان میں قائم نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی حکومت اُسے ہر حال میں ادا کرنے کی پابند ہو۔ وہ اپنی تمدنی ضرورتوں اور اپنے حالات کے لحاظ سے جو طریقہ چاہے، اس معاملہ میں اختیار کر سکتی ہے۔''

(میزان، ص 609، طبع سوم مئی 2008، لاہور)

حالانکہ اس پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ مال غنیمت کا 4/5 حصہ مجاہدین کے لیے اور 1/5 حصہ بیت المال کے لیے ہے۔ چنانچہ موسوعۃ الاجماع میں ہے کہ

1۔ ((اتفقوا المسلمون علی ان الغنیمة مقسومة مخموسة، خمسها لامام، واربعة اخماسها للذین غنموها))

(موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی، ج2، ص49، طبع دمشق)

''اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے ایک حصہ امام (بیت المال) کے لیے اور چار حصے ان (مجاہدین) میں تقسیم کیے جائیں گے جنہوں نے وہ مال غنیمت حاصل کیا ہو۔''

اسی طرح 'بدایۃ المجتہد' میں ہے کہ:

2۔ ((واجمع جمهور العلماء علی ان اربعة اخماس الغنيمة للغانمين اذا خرجوا باذن الامام)) (ابن رشد، بداية المجتهد، ج1 ص286)

''جمہور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ مال غنیمت کے چار حصے ان (مجاہدین) میں تقسیم کیے جائیں گے جنہوں نے وہ مال غنیمت حاصل کیا ہو اور یہ حصے امام (حکمران) کی اجازت سے نکالے جائیں گے۔ (اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوگا)۔''

لکھتا ہے کہ:

((والاربعة الاخماس الباقية ملك للغانمين من غير خلاف بين الائمة بدليل اسناد الحق فی الغنيمة للغانمين فی قوله تعالی (غنمتم) اسنده اليهم اسناد الملك الی مالكه))

(الدکتور وهبة زهيلی، الفقه الاسلامی وادلته، ج5، ص533)

''ائمہ مجتہدین کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ایک حصہ بیت المال کے لیے نکالنے کے بعد باقی چار حصے مجاہدین کی ملکیت ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غَنِمْتُمْ (تو غنیمت پاؤ) فرمایا ہے اور اس میں ملکیت کی نسبت اس کے مالکوں کی طرف کی گئی ہے۔''

4۔ مولانا شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'سیرت النبی ﷺ' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا۔ اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کی رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔'' (شبلی نعمانی و سید سلیمان ندوی، سیرت النبیؐ ج7، ص45، مطبوعہ مکتبہ مدنیہ لاہور)

5۔ شبلی نعمانی اپنی کتاب 'الفاروق' میں فتح قادسیہ کے مالِ غنیمت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"مالِ غنیمت حسب قاعدہ تقسیم ہو کر پانچواں حصہ دربارِ خلافت میں بھیجا گیا۔"

(الفاروق، ص:۱۱۶)

6۔ خود غامدی صاحب کے 'استاد امام' مولانا امین احسن اصلاحی بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مال غنیمت کا 4/5 حصہ مجاہدین کا حق ہے۔ اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں لکھتے ہیں کہ:

"فرمایا کہ اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یعنی جاہلیت کا یہ دستور کہ جو شخص جو مال واسباب لوٹے وہ اس کا ہے، ختم ہوا۔ اب سارا مال غنیمت اکٹھا کیا جائے گا اور اس میں سے پانچواں حصہ اللہ ورسول ﷺ کا حق نکال کر بقیہ مال مجاہدین میں تقسیم ہوگا۔" (تدبر قرآن، ج3، ص481، طبع مئی 1983ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت میں کفار کے خلاف جہاد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے، مال غنیمت میں مجاہدین کا حق ہمیشہ کے لیے مسلم ہے اور وہ کل مال کا 4/5 ہے۔ اور باقی 1/5 حصہ بیت المال میں اجتماعی مقاصد کے لیے مخصوص ہے۔

11۔ کیا غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ لینا جائز نہیں؟

جزیہ وہ معمولی سالانہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنے غیر مسلم ذمیوں سے ان کے جان ومال کی حفاظت کے بدلے میں لیتی ہے۔

قرآن مجید میں اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) سے لڑنے اور ان سے جزیہ لینے کا حکم اس طرح آیا ہے۔

﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

﴿حَتّٰی يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبة: 29)

''(اے مسلمانو!) تم اہل کتاب سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر جو ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور نہ وہ دین حق کو مانتے ہیں یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی شریعت میں غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ لینے کا حکم ہے اور یہ عارضی حکم نہیں ہے باقی قیامت تک ہمیشہ کے لیے ہے۔ چنانچہ 'موسوعۃ الاجماع' میں ہے کہ:

((اجمع المسلمون علی جواز اخذ الجزية))

(سعدی ابو حبیب، موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی، ج1، ص261، طبع دمشق)

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ (ذمیوں سے) جزیہ لیا جائے گا۔''

پھر مزید لکھا ہے کہ اہل کتاب ذمیوں سے جزیہ لینے کے وجوب پر اتفاق ہے۔

((اتفقوا علی وجوب اخذ الجزية من اليهود والنصاری))

(موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی، ج1، ص262، طبع دمشق)

''اس پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ یہودی اور عیسائی ذمیوں سے جزیہ لینا واجب ہے۔''

خود نبی ﷺ نے غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ لیا تھا۔ چنانچہ شبلی نعمانی اپنی کتاب ''سیرت النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں:

''جزیہ غیر مسلم رعایا سے ان کی حفاظت اور ذمہ داری کے معاوضہ میں لیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار متعین نہ تھی نبی کریم ﷺ نے اپنے زمانہ میں ہر مستطیع بالغ مرد سے ایک دینار وصول کرنے کا حکم دیا تھا۔'' (سیرت النبی ﷺ، ج2، ص52)

اپنی کتاب 'الفاروق' میں بھی شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جزیہ کی رقم کے ساتھ اجناس اور غلہ بھی لے لیتے تھے:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جہاں جہاں جزیہ مقرر کیا، اس کے ساتھ جنس اور غلہ بھی شامل کیا۔'' (الفاروق ص311)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن وسنت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل اور اجماع امت کی رو سے اسلامی حکومت ہر زمانے میں کفار کے خلفا جہاد بھی کر سکتی ہے اور غیر مسلم رعایا یعنی ذمیوں پر جزیہ بھی عائد کر سکتی ہے۔

لیکن غامدی صاحب کا اصرار یہی ہے کہ آج مسلمانوں کی طرف سے نہ تو کفار (جن کو غامدی صاحب منکرین حق کہتے ہیں) کے خلاف جہاد جائز ہے اور نہ ان کو ذمیوں سے جزیہ لینے کا حق ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اس سے واضح ہے کہ یہ محض قتال نہ تھا، بلکہ اللہ کا عذاب تھا جو اتمامِ حجت کے بعد سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلہ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہودی ونصاریٰ پر اور اس کے بعد عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انہیں محکوم اور زیر دست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے قتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم وعدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اللہ کی راہ میں قتال اب یہی ہے۔ اس کے سوا کسی مقصد کے لیے بھی دین کے نام پر جنگ نہیں کی جا سکتی۔''

(میزان، ص601، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد اور جزیے کی مخالفت کر کے غامدی صاحب اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری نہیں کر رہے بلکہ غیر مسلموں کی غم خواری اور نمک حلالی کر رہے ہیں۔



باب 7:

فقہی مسائل

1۔ کھانے پینے کی کون کون سی اشیاء حرام ہیں؟

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں حرام ہیں مگر غامدی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت میں بس چار چیزیں ہی حرام ہیں اور وہ یہ ہیں:

''مردار، خون، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔''

چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے اسے (انسان کو) بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ قرآن نے اسی بنا پر بعض جگہ ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾ اور بعض جگہ 'اِنَّمَا' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔''

(میزان، ص 632، 633 طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

قرآن مجید کی جن آیات میں 'اِنَّمَا' (جیسے البقرہ 173) اور ﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾ (الانعام: 145) کے الفاظ آئے ہیں اور ان کے جو چار چیزوں کو حرام کہا گیا ہے تو وہاں دراصل حرام اشیاء کی تفصیل بیان کرنا مقصد نہیں ہے بلکہ مشرکین کے بعض غلط عقائد کی تردید مقصود ہے۔ چونکہ مشرکین نے اپنی اوہام پرستی (Superstitions) سے بہت سی حلال چیزیں بھی اپنے اوپر حرام کر لی تھیں اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ملت ابراہیمی

کا پیروکار سمجھتے تھے اس لیے قرآن نے ان کی اس وہم پرستی اور جھوٹے دعوے کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ دین ابراہیمی میں تو صرف چار چیزیں ہی حرام تھیں، مگر تم نے ان کے علاوہ بہت سی دوسری چیزوں کو اپنے لیے حرام قرار دے رکھا ہے لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ جھوٹا ہے کہ تم دین ابراہیمی کے پیروکار ہو۔

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾ (البقرۃ: 173)

''اللہ نے جو چیزیں تمہارے لیے حرام قرار دی ہیں، وہ مردار ہے، خون ہے، سؤر کا گوشت ہے اور ہر وہ جانور ہے جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ پھر جو کوئی مجبور ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

چنانچہ انہی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں کہ:

''یہ اشارہ ہے ان چیزوں کی طرف جو اصلاً ملت ابراہیم میں حرام ٹھہرائی گئی تھیں اور مقصود اس سے ہرگز حرام وحلال کی تفصیل پیش کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مشرکین کی تردید ہے کہ انہوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت چوپایوں میں سے بعض کو جو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، ملت ابراہیم علیہ السلام میں صرف یہ یہ چیزیں حرام تھیں۔ بالکل اسی سیاق میں یہی بات سورۂ انعام میں اس طرح فرمائی گئی ہے۔

﴿قُلْ لَّا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ إِلَّا أَنْ يَكُونَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَسْفُوحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيرٍ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ﴾ (الانعام: 145)

''کہہ دو کہ مجھے جو وحی کی گئی ہے اس میں تو کسی کھانے والے کے لیے میں بجز

اس کے کسی چیز کو حرام نہیں پاتا کہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون یا سوٗر کا گوشت، یہ چیزیں ناپاک ہیں، یا پھر اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کسی چیز کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کر دیا جائے۔" (تدبر قرآن، ج1، ص414، طبع مئی 1983ء لاہور)

پھر مولانا اصلاحی مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ کے الفاظ پر ان کے سیاق وسباق کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے مشرکین کے سامنے اس بات کی وضاحت کرائی جا رہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملت ابراہیم کی نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے، مجھ پر ملت ابراہیم علیہ السلام کے ضابطۂ حلت وحرمت سے متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ فلاں فلاں چیزوں کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی حرام نہیں ٹھہرائی گئی۔" (تدبر قرآن، ج1، ص414، طبع مئی 1983ء لاہور)

پھر اسی آیت کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگ زیر بحث آیت کو اس کے موقع ومحل سے بالکل الگ کر کے اس سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ اسلام میں بس یہی چیزیں حرام ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی حرام نہیں ہے لیکن یہ خیال صریحاً غلط ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی تردید کے لیے دوسری باتوں سے قطع نظر تنہا یہی بات کافی ہے کہ زیر بحث آیت میں "میتة" کا جو لفظ آیا ہے سورۂ مائدہ کی آیت 3 میں اس کی وضاحت میں پانچ چیزیں گنائی گئی ہیں۔ پھر مزید بعض چیزوں کی بھی حرمت بیان ہوئی ہے جن کی طرف آیت زیر بحث میں کوئی اشارہ نہیں ہے۔"

(تدبر قرآن، ج1، ص414، طبع مئی 1983ء لاہور)

اس طرح اگرچہ غامدی صاحب کے اس موقف ...... کہ شریعت میں صرف چار چیزیں ہی حرام ہیں ...... کی تردید کے لیے تنہا ان کے استاد مولانا اصلاحی کی تحریر ہی کافی ہے تاہم انہوں

نے جو 'إِنَّمَا' کے حصر کی بات لکھی تھی تو ہمیں اس کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

یہ درست ہے کہ عربیت کی رو سے 'إِنَّمَا' کا لفظ عام طور پر حصر کا فائدہ دیتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس لفظ سے ہر جگہ حصر ہی مراد ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات یہ حصر کے مفہوم کے بغیر بھی مستعمل ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

﴿إِنَّمَآ أَنتَ نَذِيرٌ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۝﴾ (هود: 12)

''آپ تو صرف خبردار کرنے والے ہیں اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔''

کیا اس مقام کو دیکھ کر کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ صرف 'نذیر' ہی تھے کیونکہ یہاں 'إِنَّمَا' حصر کا کلمہ استعمال ہوا ہے؟ اور کیا آپ ﷺ 'نذیر' کے علاوہ 'بشیر' نہ تھے؟ اور کیا آپ ﷺ 'نذیر' اور 'بشیر' کے علاوہ بھی بہت سی دوسری صفات جیسے مزمل، مدثر، شاہد، مبشر، داعی الی اللہ، سراج منیر وغیرہ سے متصف نہ تھے۔ مثال کے طور پر درج ذیل مقام پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو 'نذیر' کے علاوہ 'بشیر' کا صفاتی نام بھی دیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۝﴾ (البقرة: 119)

''بے شک ہم نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بشیر (خوشخبری دینے والا) اور نذیر (خبردار کرنے والا) بنا کر بھیجا ہے اور دوزخیوں کے بارے میں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے دعوے کے برعکس 'إِنَّمَا' کے لفظ سے ہر جگہ حصر مراد لینا درست نہیں ہے۔

2۔ کیا حلال و حرام کا فیصلہ انسانی فطرت کرتی ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ جس طرح شریعت کی رو سے بعض اشیاء حرام ہیں،

اسی طرح بعض چیزوں کو انسان کی فطرت بھی حرام قرار دیتی ہے۔ اس چیز کو وہ 'بیان فطرت' کا نام دیتے ہیں جو دراصل فطرت انسانی کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ گویا ان کے ہاں اشیاء کی حلت وحرمت کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ شریعت کا ہے اور دوسرا انسان کی فطرت کا اور یہ دونوں دائرے اپنی الگ الگ حیثیت سے چیزوں کی حلت وحرمت کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''انسان کی فطرت اس معاملے میں بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ کیا چیز طیب اور کیا خبیث ہے۔ وہ ہمیشہ جانتا ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔''

(میزان، ص532، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

غامدی صاحب نیچریوں (Naturalists) کی طرح فطرت کو شریعت کا قائم مقام بناتے اور اسے حلال وحرام اور طیب وخبیث کا فیصلہ کرنے کے لیے حکم بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ اختیار صرف اور صرف اللہ کی شریعت کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے حلال وحرام یا طیب وخبیث ہونے کا فیصلہ کرے۔ انسانی فطرت کا یہ کام ہرگز نہیں ہے۔ اوپر کے اقتباس میں جس طرح انہوں نے اپنی خطابت کے جوہر دکھائے ہیں اور تحریر کے جوش میں انسانی فطرت کی ثنا خوانی میں یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ:

> ''وہ (انسان) جانتا ہے کہ گھوڑے اور گدھے دستر خوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔''

تو قارئین کرام! غور کیجیے کس طرح غامدی صاحب گھوڑے اور گدھے کے ذکر میں پورا 'اونٹ' نگل گئے ہیں۔ بائیبل میں ایسی حرکت کو ''مچھر چھاننا اور اونٹ نگلنا'' کہا گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اونٹ سواری کا جانور بھی ہے، شرعی اور فطری طور پر حلال بھی ہے اور اس کا

گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ لیکن کیا کیجئے، غامدی صاحب ہمیں 'فطرت' کے نام پر 'غیر فطری دھوکا' دیتے ہیں۔

پھر غامدی صاحب یہ انکشاف بھی کرتے ہیں کہ:

''سؤر انعام کی قسم کے بہائم میں سے ہے، لیکن وہ درندوں کی طرح گوشت بھی کھاتا ہے، پھر کیا اسے کھانے کا جانور سمجھا جائے یا نہ کھانے کا؟''

(میزان، ص632، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

غامدی صاحب کی لاعلمی کا حال دیکھئے وہ سؤر کو گوشت کھانے والا جانور ظاہر کر رہے ہیں جب کہ وہ گوشت خور جانور ہرگز نہیں ہے اس کے دانت بھی درندوں کے دانتوں کی طرح نوکیلے نہیں ہوتے بلکہ چپٹے ہوتے ہیں۔ بلکہ چیرنے والا جانور ہے اور گندگی اور غلاظت اس کی مرغوب ترین غذا ہے۔ سؤر کو گوشت کھانے والا جانور کہنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ بلی اور شیر گھاس کھانے والے جانور ہیں۔

2۔ کیا کافر کسی مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے؟

اسلامی شریعت کی رو سے کسی کافر کو کسی مسلمان کی وراثت سے حصہ نہیں ملتا کیونکہ اس پر اجماعِ امت ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا یہ حکم عام ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔

اس کے برعکس غامدی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ مذکورہ بالا حکم صرف نبی ﷺ کے زمانے کے مشرکین اور اہل کتاب کے بارے میں تھا کیونکہ وہی لوگ کافر تھے اور اس کے بعد سے آج تک دنیا میں کوئی کافر نہیں پایا جاتا لہٰذا مذکورہ بالا حکم موجودہ دور کے لیے نہیں ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نبی ﷺ نے اسی کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ کے بارے میں فرمایا:

((لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم .))

(بخاری، رقم6764)

''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔''

یعنی اتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرین حق اللہ اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔'' (میزان، ص525۔526، طبع مئی 2008ء لاہور)

غامدی صاحب نے ایک طرف حدیث کا غلط ترجمہ کیا ہے صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔'' پھر دوسری طرف یہ غلط دعویٰ کیا ہے کہ یہ حکم صرف عہد نبوی کے ساتھ خاص تھا۔ جب کہ اسلامی شریعت میں یہ حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور موجودہ دور کے کافروں کے لیے بھی یہ حکم موثر ہے۔ چنانچہ اس بارے میں ائمہ اربعہ کی رائے یہ ہے کہ:

1۔ ((اختلاف الدین بین المورث والوارث الاربعة ، فلا یرث المسلم کافرا ، ولا الکافر مسلما))

(الدکتور وھبة زھیلی، الفقه الاسلامی وادلته، ج8،ص263)

''مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر میت اور اس کے وارث کے درمیان اسلام اور کسی دوسرے مذہب کا اختلاف ہو تو 'وارث' کو وراثت نہیں دی جائے گی۔''

2۔ علامہ ابن رشد نے اپنی کتاب 'بدایۃ المجتہد' میں اس پر اجماع امت نقل کیا ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

((اجمع المسلمون علی ان الکافر لا یرث المسلم لقوله تعالیٰ: ﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾ ولما

ثبت من قوله عليه الصلوٰة والسلام "لا يرث المسلم الكافر ولا الكافر المسلم)) (ابن رشد، بداية المجتهد، ج2، ص264)

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہ دے گا۔'' اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''کوئی مسلمان کسی کافر کا اور کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔''

3۔ اسلامی فقہ کے انسائیکلوپیڈیا 'موسوعۃ الاجماع' میں تمام فقہائے اسلام کا اس بارے میں اجماع بیان کیا گیا ہے کہ کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔

((وَقَدْ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰی اَنَّ الْكَافِرَ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمَ))

(موسوعة الاجماع، ج2، ص984)

''اور تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں ہو سکتا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور اجماع امت کے خلاف ہے کہ شریعت کا یہ حکم صرف عہد نبوی کے ساتھ خاص تھا، آج کے دور میں یہ حکم باقی نہیں رہا اور اب غیر مسلم بھی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔

3۔ 'کلالہ' کی غلط تعریف:

غامدی صاحب وراثت کے حوالے سے 'کلالہ' کی تعریف بھی اجماعِ امت کے خلاف کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

'''کلالہ' کو کسی طرح مرنے والے کے لیے اسم صفت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تغیر حجت قاطع ہے کہ قرآن مجید نے یہ لفظ یہاں پہلے معنی میں، یعنی اس شخص کے لیے جس کے پیچھے اولاد اور والد، دونوں میں سے کوئی نہ ہو، استعمال نہیں کیا ہے۔'' (میزان، ص530، طبع مئی 2008ء لاہور)

لیکن 'کلالہ' کی یہ تعریف نہ صرف اجماعِ امت کے خلاف ہے بلکہ خود غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی کے موقف کے بھی خلاف ہے جنہوں نے 'کلالہ' کی وہی تعریف لکھی ہے جس پر اجماعِ امت ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' میں لکھتے ہیں کہ:

''کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اصول میں کوئی ہو، نہ فروع میں، صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں۔'' (تدبر قرآن، ج2، ص349، طبع 1983ء لاہور)

فقہائے اسلام نے 'کلالہ' کی متفقہ تعریف یہ کی ہے:

((اَلْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّ الْکَلَالَۃَ مَنْ لَا وَلَدَ لَہٗ وَاِنْ نَزَلَ ، وَلَا وَالِدَ لَہٗ وَاِنْ عَلَا))

(سعدی ابو حبیب، موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی، ج2، ص1001، طبع 1984ء، دمشق)

''اس پر اجماع ہے کہ کلالہ وہ شخص ہے جس کی اولاد میں کوئی نہ ہو نیچے تک اور والدین میں کوئی نہ ہو اوپر تک۔''

چنانچہ کلالہ شخص کی میراث اس کے والدین اور اولاد نہ ہونے کے سبب سے اس کے بہن بھائیوں کو ملتی ہے۔

عربی زبان کے مشہور و مستند لغت 'لسان العرب' میں بھی 'کلالہ' کی یہ تعریف موجود ہے کہ:

((والکلالۃ: الرجل الذی لا ولد لہ ولا والد))

(ابن منظور، لسان العرب، تحت، کلل)

''اور کلالہ وہ آدمی ہے جس کی نہ اولاد میں کوئی موجود ہو اور نہ والدین میں کوئی موجود ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب 'کلالہ' کی تعریف میں بھی اجماعِ امت کی مخالفت کرتے ہیں۔

4۔شہید کے غسل کا مسئلہ

اس بات پر علمائے اسلام کا اتفاق اور اجماع ہے کہ شہید (جو کہ کفار اور مشرکین سے جنگ کرتے ہوئے شہادت پا جائے) کو غسل نہیں دیا جائے گا مگر غامدی صاحب اس متفق علیہ اور اجماعی مسئلے کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"عام حالات میں یہ (میت کا غسل) ہر مسلمان کو دینا ضروری ہے۔ لیکن کسی غیر معمولی صورت حال میں اگر میت کا غسل اور اس کی تجہیز و تکفین باعث زحمت ہو جائے تو اسے غسل اور تجہیز و تکفین کے بغیر بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ (بخاری، رقم 1347) میں ہے کہ احد کے شہدا کو رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح دفن کر دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ ہمارے فقہا نے اسے شہادت کی موت سے متعلق قرار دیا ہے، دراں حالیکہ یہ ایک عام استثنا ہے جو دین کے اسی اصول پر مبنی ہے جو اس کے تمام احکام میں ملحوظ ہے۔" (میزان، ص 647، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ غیر معمولی حالات کی وجہ سے غزوۂ احد کے شہیدوں کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔ اگر مجبوری یا اضطراری کی حالت نہ ہوتی شہید کو بھی غسل دینا ضروری ہے۔

2۔ عام مسلمان کی میت کو بھی غیر معمولی حالات یعنی مجبوری اور اضطرار کی صورت میں غسل نہ دینا جائز ہے۔

اب ہم ان دونوں نکات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

1۔شہید کی میت کا غسل:

1۔ شہدائے اُحد کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔ صحیح بخاری میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِيْ دِمَائِهِمْ وَلَمْ يُغَسَّلُوْا......))

(صحیح بخاری، کتاب الجنائز حدیث 1343)

''اور (نبی ﷺ) نے ان (شہداء) کو ان کے خون آلود کپڑوں ہی میں دفن کر دینے کا حکم دیا اور ان کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔''

انہی سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت میں ہے کہ:

((فَاَمَرَ بِدَفْنِهِمْ بِدِمَائِهِمْ وَلَمْ يُغَسِّلْهُمْ))

(صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1353)

''پھر آپ ﷺ نے ان (شہداء) کو ان کے خون آلود کپڑوں ہی میں دفن کرنے کا حکم دیا اور ان کو غسل نہیں دیا۔''

2۔ سنن ابی داؤد میں ایک اور شہید کی میت کو غسل نہ دیئے جانے کا واقعہ موجود ہے جسے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس طرح روایت کیا ہے کہ:

((رُمِيَ رَجُلٌ بِسَهْمٍ فِي صَدْرِهِ اَوْ فِي حَلْقِهِ فَمَاتَ فَأُدْرِجَ فِي ثِيَابِهِ كَمَا هُوَ، قَالَ: وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ))

(ابوداؤد، کتاب الجنائز، حدیث 3133)

''ایک شخص کے سینے یا حلق میں تیر لگا جس سے وہ شہید ہو گیا۔ اسے اس کے انہی (خون آلود) کپڑوں میں لپیٹ کر دفن کر دیا گیا جو وہ پہنے ہوئے تھا۔'' سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس موقع پر ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔''

3۔ شہید کو غسل نہ دینے کا سبب:

شہید کو غسل نہ دیئے جانے کا سبب یہ ہے کہ اس کے زخموں کا خون قیامت کے دن خوشبو سے مہکے گا اس لیے اس کے خون آلود کپڑوں اور زخموں کو دھونے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں چند احادیث ذیل میں بیان کی جاتی ہیں:

1۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَا يُكْلَمُ اَحَدٌ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ، وَاللهُ اَعْلَمُ بِمَنْ يُكْلَمُ فِيْ سَبِيْلِهٖ، اِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ اللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ

وَالرِّيْحُ رِيْحُ الْمِسْكِ))

(صحیح بخاری، کتاب الجهاد، حدیث 2803، جامع ترمذی، فضائل الجهاد، حدیث 1656)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اللہ کی راہ میں جس کو کوئی زخم لگتا ہے۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے وہ قیامت کے دن اسی حالت میں آئے گا اور اس کے خون کا رنگ خون جیسا ہوگا مگر اس سے مشک (کستوری) کی خوشبو آئے گی۔"

2۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ:

((وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ، اَوْ نُكِبَ نُكْبَةً، فَإِنَّهَا تَجِيْءُ يَـوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَغْزَرِ مَا كَانَتْ، لَوْنُهَا لَوْنُ الزَّعْفَرَانِ وَرِيْحُهَا رِيْحُ الْمِسْكِ......))

(ابو داود، کتاب الجهاد، حدیث 2541، جامع ترمذی، کتاب الجهاد، حدیث 1657)

"اور جسے اللہ کی راہ میں زخم لگا، یا اس نے گر کر چوٹ کھائی تو اس کا زخم جو دنیا میں بہت تازہ تھا، ایسے حالت میں قیامت کے دن آئے گا۔ اس کا رنگ زعفران کا اور خوشبو مشک (کستوری) کی ہوگی۔"

یہی مضمون سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2795 میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

3۔ مسند احمد میں ہے کہ نبی ﷺ نے شہید کی میت کو غسل دینے سے منع فرمایا ہے:

((لَا تُغَسِّلُوْهُمْ فَإِنَّ كُلَّ جُرْحٍ يَفُوْحُ مِسْكًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

(مسند احمد)

"ان (شہیدوں) کو غسل نہ دو کیونکہ قیامت کے دن ان کے ہر زخم سے مشک (کستوری) کی خوشبو مہکے گی۔"

مطلب یہ ہے کہ شہید کے زخموں کو نہ دھویا جائے کیونکہ قیامت کے دن انہی زخموں سے مشک کی خوشبو پھیلے گی۔

مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ نے شہید کی میت کو غسل دیئے جانے سے منع فرمایا ہے کیونکہ قیامت کے دن وہ اپنے انہی خون آلود کپڑوں اور بہتے ہوئے لہو کے ساتھ اٹھیں گے اور ان سے مشک (کستوری) کی خوشبو مہکتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کو شہیدوں کا گلگوں رنگین لباس بہت پسند ہے۔

رہا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ شہدائے احد کو محض ''غیر معمولی حالات'' کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا تھا تو یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہوسکتی کہ اگر انہی ''غیر معمولی حالات'' میں شہداء کے لیے قبریں کھودنے کا پر مشقت کام کیا جاسکتا تھا تو ان کو غسل دینے کا کام کیوں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہوسکتا ہے پانی کی کمیابی کے سبب سے ایسا کیا گیا تھا تو یہ امکان اس لیے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ ایسی صورت میں غسل کے بجائے تیمّم کی رخصت پر عمل کیا جاسکتا تھا۔ کیونکہ قرآن نے تیمّم کو غسل کا قائم مقام قرار دیا ہے۔ جب کہ یہ امر ثابت ہے کہ شہدائے احد کی میتوں کو تیمّم نہیں کرایا گیا تھا۔

2۔ مسلمان کی میت کا غسل:

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ ''غیر معمولی حالات'' میں مسلمان کی میت کو بغیر غسل دیئے دفن کیا جاسکتا ہے مگر امت کے اہل علم میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ 'غیر معمولی حالات' ایک اضافی اصطلاح (Vague Term) ہے۔ کسی کی موت کا صدمہ بجائے خود ایک غیر معمولی حالت ہوتی ہے۔ حادثے میں زخمی ہو جانے کے بعد کسی آدمی کا مرنا بھی ایک غیر معمولی صورت حال ہے۔ سفر کے دوران کسی شخص کی ہلاکت بھی بجائے خود ایک ''غیر معمولی'' حالت ہے۔ لیکن ان تمام ''غیر معمولی حالات'' میں بھی مسلمان کی میت کو غسل دینا واجب ہے۔ لیکن اگر میت کو غسل دینا کسی وقت ممکن نہ ہو تو پھر اسے تیمّم کرایا جائے گا، جیسا کہ اگر کسی ایسی جگہ کوئی مرد انتقال کر جائے جہاں صرف اجنبی عورتیں ہی موجود ہوں تو وہ عورتیں اس مرد کی میت کو تیمّم کراسکتی ہیں۔ اس کے برعکس صورت

ہوتو اجنبی مرد بھی کسی عورت کی میت کو تیمم کرا سکتے ہیں۔ کیونکہ بغیر غسل یا تیمّم کے عام مسلمان کی میت کو دفن کرنا جائز نہیں ہے۔

غامدی صاحب یہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ شہید کو بھی اگر ممکن ہو تو غسل دیا جانا ضروری ہے اور یہ کہ ''غیر معمولی حالات'' میں عام مسلمان کی میت کو بغیر غسل (اور کفن) کے دفنایا جا سکتا ہے، لیکن کیا وہ اپنے ان دعاوی کے حق میں کوئی ایسی دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ نبی ﷺ یا صحابہ کرام نے کسی شہید (جس نے کفار و مشرکین کے خلاف لڑتے ہوئے شہادت پائی ہو) کو غسل دیا ہو؟ یا آپ ﷺ اور صحابہ کرام نے کسی عام مسلمان کی میت کو بغیر غسل (یا تیمّم) کے دفن کیا ہو؟ ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین.



باب 8:

متفرقات

1۔ کیا معروف اور منکر کا تعین انسانی فطرت کرتی ہے؟

غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ معروف اور منکر کا تعین شریعت نہیں کرتی بلکہ انسانی فطرت کرتی ہے۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''پورا دین خوب و ناخوب کے شعور پر مبنی ان حقائق سے مل کر مکمل ہوتا ہے جو انسانی فطرت میں روز اول سے ودیعت ہیں اور جنہیں قرآن معروف اور منکر سے تعبیر کرتا ہے۔'' (میزان، ص 47، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''تواصی بالحق، اور 'تواصی بالصبر' کے معنی اپنے ماحول میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کے ہیں۔ یہ حق کو ماننے کا بدیہی تقاضا ہے جسے قرآن نے 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' سے بھی تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو عقل و فطرت کی رو سے معروف ہیں، اپنے قریبی ماحول میں لوگوں کو ان کی تلقین کی جائے اور جو منکر ہیں، ان سے لوگوں کو روکا جائے۔''

(حوالہ بالا، ص 74)

وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''پہلی چیز (فطرت کے حقائق) کا تعلق ایمان واخلاق کے بنیادی حقائق سے ہے اور اس کے ایک بڑے حصے کو وہ (قرآن) اپنی اصطلاح میں معروف و منکر

سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت اِبا کرتی اور انہیں برا سمجھتی ہے۔ قرآن ان کی کوئی جامع و مانع فہرست پیش نہیں کرتا، بلکہ اس حقیقت کو مان کر کہ اس کے مخاطبین ابتدا ہی سے معروف و منکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتے ہیں، ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ معروف کو اپنائیں اور منکر کو چھوڑ دیں۔'' (حوالہ بالا، ص 45)

غامدی صاحب کا یہ نظریہ بالکل بے اصل اور غلط ہے کہ معروف اور منکر کا تعین اسلامی شریعت نہیں کرتی بلکہ انسانی فطرت کرتی ہے۔

مثال کے طور پر غصے کو لیجیے جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور جو بجائے خود نہ تو معروف ہے اور نہ منکر۔ لیکن شریعت ہمیں بتاتی ہیں کہ فلاں موقع پر اس کا اظہار معروف ہے اور فلاں موقع پر اس کا اظہار معروف نہیں ہے بلکہ منکر ہے۔ لہٰذا معروف و منکر کا تعین شریعت کا کام ہوا نہ کہ فطرتِ انسانی کا۔

اسی طرح دوسری مثال سامنے لائیے۔ انسانی فطرت کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ رقص اور موسیقی معروف ہیں کہ منکر۔ یہ صرف شریعت ہے جو یہ حکم لگاتی ہے کہ یہ دونوں چیزیں حرام ہیں۔

غامدی صاحب جس انسانی فطرت کو معروف و منکر کے تعین کا اختیار سونپ رہے ہیں اور جسے معروف و منکر کے حتمی فیصلے کے لیے قاضی مقرر کر رہے ہیں اس کی چند خصوصیات قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہیں:

1۔ انسان جلد باز ہے:

﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (الانبیاء: 37)

''انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔''

﴿وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا٥﴾ (بنی اسرائیل: 11)

2۔ انسان بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ٥﴾ (ابراهیم : 34)

''بے شک اللہ بہت بے انصاف اور بڑا ناشکرا ہے۔''

3۔ انسان بڑا ظالم اور نادان ہے:

﴿وَ حَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا٥﴾ (الاحزاب : 72)

''اور انسان نے اسے (بارِ امانت کو) اٹھالیا۔ بے شک وہ ظالم اور نادان ہے۔''

4۔ انسان بڑا تنگ دل ہے:

﴿وَ كَانَ الْإِنْسَانُ قَتُورًا٥﴾ (بنی اسرائیل : 100)

''اور انسان بڑا تنگ دل ہے۔''

5۔ انسان جھگڑالو ہے:

﴿وَ كَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا٥﴾ (الکهف : 54)

''اور انسان سب سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔''

6۔ انسان کی فطرت میں حرص اور لالچ ہے:

﴿وَ أُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ (النساء : 128)

''اور حرص اور لالچ تو انسانوں کی فطرت میں ہے۔''

7۔ انسان دولت پرست ہے:

﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ٥﴾ (العادیات : 8)

''اور بے شک اسے مال ودولت سے بڑا پیار ہے۔''

8۔ انسان بخیل ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا٥﴾ (المعارج : 21)

''اور جب اسے (انسان کو) خوشحالی ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔''

9۔ خوش حالی میں انسان اترانے اور فخر کرنے لگتا ہے:

﴿إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا﴾ (الشوری : 48)

"جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے۔"

10۔ انسان تنگ دستی اور بدحالی میں بے صبری اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے:

﴿إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًاo﴾ (المعارج : 20)

"جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔"

11۔ انسانی فطرت میں چند خواہشات یعنی جنس، اولاد، مال و دولت، سواری اور مویشی (یعنی پالتو جانوروں) کی محبت رکھ دی گئی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾

(ال عمران : 14)

"لوگوں کے لیے جن خواہشوں کی محبت خوش نما بنا دی گئی ہے وہ ہیں بیویاں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے اعلیٰ گھوڑے، مویشی اور کھیتی۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جس انسان کی فطرت میں یہ اوصاف موجود ہیں کہ وہ جلد باز، ظالم، ناشکرا، بے انصاف، نادان، تنگ دل، جھگڑالو، حریص لالچی، دولت پرست، بخیل، اترانے اور فخر وغرور کرنے والا، تنگدستی اور بدحالی میں بے صبرا اور مایوس ہو اور جو خواہشات نفسانی میں گرفتار ہو وہ معروف اور منکر کا تعین کیسے کر سکتا ہے؟ بلکہ وہ محتاج ہے وحی کی ہدایت کا اور شریعت کا جو اس کی رہنمائی کرے اور بتا دے کہ معروف کیا ہے اور منکر کیا؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اصطلاح میں 'معروف' کا لفظ ہر اچھائی، نیکی اور نیک کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح 'منکر' کا لفظ ہر برائی، بدی اور برے کام کے لیے مستعمل ہے۔

معروف کے لیے 'خیر' اور منکر کے لیے 'شر' مترادف الفاظ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو 'معروف' پسند ہے اور 'منکر' ناپسند۔

قرآن مجید میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ جو کہ فرد اور حکومت

دونوں کی ذمہ داری ہے۔

شریعت کے جملہ اوامر (وہ کام جن کے کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے) کا تعلق 'معروف' سے ہے اور اس کے تمام نواہی (وہ کام جن کے کرنے سے ہمیں روکا گیا ہے) منکر کہلاتے ہیں۔

اور ظاہر ہے شریعت کے اوامر ونواہی کی تعداد سینکڑوں سے کم نہیں ہے۔

معروف اور منکر کا تعین اسلامی شریعت کے ذریعے ہوتا ہے جس کے چار مآخذ ہیں: قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔

چونکہ تنہا انسانی عقل یہ ہرگز معلوم نہیں کر سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا چیز معروف ہے اور کیا منکر، اس لیے وحی الٰہی کی ہدایت کے ذریعے انسان کی رہنمائی کی گئی کہ فلاں چیز معروف ہے اور فلاں منکر۔ یہ خیر ہے وہ شر، یہ حلال ہے وہ حرام اور یہ جائز ہے اور وہ ناجائز۔

انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنی فطرت کے مطابق پسند کرتا ہے اور وہ اس کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو اپنی فطرت کے مطابق ناپسند کرتا ہے مگر وہی چیز اس کے حق میں فائدہ مند ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ عَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡـًٔا وَّ ہُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَ عَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡـًٔا وَّ ہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۠﴾ (البقرۃ: 216)

''اور ہو سکتا ہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو مگر وہی تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اصل میں اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

2۔ شریعت اور عمل صالح کا فرق

غامدی صاحب شریعت اور ایمان وعمل صالح کے بارے میں فرق کے اپنی کتاب 'میزان' میں لکھتے ہیں:

''ایمان کے بعد دین کا اہم ترین مطالبہ تزکیۂ اخلاق ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان خلق اور خالق، دونوں سے متعلق اپنے عمل کو پاکیزہ بنائے۔ یہی وہ چیز ہے جسے عمل صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تمام شریعت اسی کی فرع ہے۔ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو بے شک، تبدیل بھی ہوئی ہے، لیکن ایمان اور عمل صالح اصل دین ہیں، ان میں کوئی ترمیم وتغیر کبھی نہیں ہوا۔''

(میزان، ص 197، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے ہاں:

1۔ تمام شریعت عمل صالح کی فرع ہے۔

2۔ تمدن اور حالات کی تبدیلی سے شریعت تبدیل ہوئی ہے لیکن ایمان اور عمل صالح میں کبھی کوئی ترمیم وتغیر نہیں ہوا کیونکہ وہ اصل دین ہیں۔ اب ہم ان دونوں نکات کا علمی جائزہ لیں گے:

1۔ کیا تمام شریعت عمل صالح کی فرع ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بنیادی طور پر غلط ہے کہ شریعت عمل صالح کی فرع ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ شریعت اصل ہے اور عمل صالح اس کی فرع ہے۔ شریعت تمام اعمال صالحہ کی جامع ہے اور ہر عمل صالح شریعت میں داخل ہے۔

مثال کے طور پر شریعت میں تمام عبادات نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ...... شامل ہیں، لیکن نماز ایک الگ عمل صالح ہے، روزہ ایک الگ عمل صالح ہے، زکوٰۃ ایک الگ عمل صالح ہے اور حج ایک الگ عمل صالح ہے۔ گویا اعمال صالحہ کا مجموعہ شریعت کہلائے گا اور شریعت اعمال صالحہ کا جزء نہیں کہلائے گی۔ لہٰذا شریعت اصل ہے اور عمل صالح اُس کی فرع ہے اس لیے غامدی صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ شریعت عمل صالح کی فرع ہے۔

2۔ کیا شریعت کی تبدیلی کے ساتھ ایمان اور عمل صالح میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں ہوا؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ تمدن اور حالات کی تبدیلی سے شریعت تو تبدیل ہوئی ہے لیکن ایمان اور عمل صالح میں کبھی کوئی ترمیم وتغیر نہیں ہوا کیونکہ وہ اصل دین ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہر امت کے لیے نجات کا انحصار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ لیکن یہ دعویٰ ہرگز درست نہیں کہ ہر امت کے ایمان اور عمل صالح میں کبھی کوئی ترمیم وتغیر نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر نبی کا کلمہ اسلام مختلف تھا اور ہر امت صرف اپنے اور اپنے سے قبل کے انبیاء کرام کی نبوت ورسالت پر ایمان لانے کی مکلّف تھی۔ مثال کے طور پر قوم نوح علیہ السلام پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لانا لازم نہ تھا۔ اسی طرح قوم شعیب علیہ السلام بھی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کی پابند نہ تھی۔ اس کے علاوہ قومِ عاد کے لیے یہ ضروری نہ تھا کہ وہ قرآن مجید پر ایمان لاتی اور اسی طرح قوم ثمود بھی توریت اور انجیل پر ایمان لانے کی مکلّف نہ تھی۔ اس لیے یہ دعویٰ کرنا غلط ہے کہ ہر امت کے ایمان میں کبھی کوئی ترمیم وتغیر نہیں ہوا۔

اسی طرح ہر امت کی شریعتیں الگ الگ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال صالحہ بھی الگ الگ تھے اور یوں ہر امت کے عمل صالح میں ترمیم وتغیر ہوتا رہا۔

اگر یہ کہا جائے کہ تمام انبیائے کرام کے ہاں دین اور اس کے بنیادی اعمال مشترک تھے جیسے ایک اللہ کی عبادت (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قربانی وغیرہ) حقوق العباد (جیسے والدین سے حسن سلوک) اور اچھے اخلاق (جیسے سچ بولنا، امانت ودیانت اور ایفائے عہد وغیرہ) تو پھر بھی جب ان کی شریعتیں جدا جدا تھیں تو ان کی پیروی کے نتیجے میں ان کے اعمال صالحہ بھی جدا جدا ہو گئے۔

مثال کے طور پر اگر ایک شریعت میں چربی کا استعمال اور ہفتے کے دن شکار کرنا منع تھا تو

اس شریعت کے پیروکاروں کے لیے یہی عمل صالح تھا کہ وہ چربی کا استعمال ترک کر دیں اور ہفتے کے دن شکار نہ کریں۔ اسی طرح اگر کسی شریعت میں یہ پابندیاں نہ تھیں تو ان کے لیے عمل صالح یہ ہوا کہ وہ چربی کا استعمال بھی کر سکتے ہیں اور ہفتے کے دن شکار بھی کر سکتے ہیں۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ شریعت تو تبدیل ہوتی رہی ہے مگر ایمان اور عمل صالح میں کوئی ترمیم و تغیر کبھی نہیں ہوا، ایک غیر معقول، غیر حقیقی اور بے اصل بات ہے۔

رہی یہ بات کہ آخرت میں نجات کا دار و مدار ایمان اور عمل صالح پر ہے تو یہ بالکل درست ہے تاہم اس میں بھی ہر امت صرف اپنے ہی دور کے معیارِ ایمان اور محض اپنی ہی شریعت کے عمل صالح کی پابند رہی ہے۔

3۔ دعوت کے 'قانون' کی تلقین و نصیحت؟

غامدی صاحب کے ہاں دعوت و تبلیغ ایک ایسا 'قانون' ہے، جس کی تلقین و نصیحت تو ہو سکتی ہے مگر اس کی تنفیذ نہیں ہو سکتی، چنانچہ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں 'قانونِ دعوت' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

> ''اللہ تعالیٰ نے جہاں سیاست، معیشت، عبادات اور بعض دوسرے معاملات میں اپنی شریعت انسانوں کو دی ہے وہاں دعوت کے لیے بھی ایک مفصل قانون اس شریعت میں واضح فرمایا ہے۔'' (ص 534، طبع مئی 2008ء لاہور)

وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''دین کا ایک اہم مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں حق کو اختیار کریں وہ اسے اختیار کر لینے کے بعد دوسروں کو بھی برابر اس کی تلقین و نصیحت کرتے رہیں۔ دین کا یہی مطالبہ ہے جس کے لیے بالعموم دعوت و تبلیغ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔'' (ص 534، طبع مئی 2008ء لاہور)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ ایسا انوکھا قانون ہے، جس کی تلقین و نصیحت کی جاسکتی ہے مگر ایک اسلامی حکومت بھی اس 'قانون' کو نافذ (Enforce) نہیں کر سکتی۔

لیکن غور کیجیے، کسی مسلمان کو غامدی صاحب کی مذکورہ عبارتیں پڑھ کر اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ان میں دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کی بات کر رہے ہیں کیونکہ انہوں نے ان عبارتوں میں محض 'دین' اور پھر 'حق' کے الفاظ اس طرح استعمال کیے ہیں جن سے کسی پادری کی مشنری سرگرمیاں اور کسی پنڈت کی ہندومت کا پرچار بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ غامدی صاحب اس طرح کے پرفریب اور ذومعنی کلام کے ماہر ہیں۔

4۔ کیا تصوف اسلام سے الگ ایک متوازی دین ہے؟

وہ تصوف جس کی بنیاد عجمیت اور ویدانت پر ہے وہ واقعی خلاف اسلام ہے لیکن جس تصوف کی بنیاد حدیث جبریل علیہ السلام کے مطابق 'احسان' پر ہے وہ ہرگز غیر اسلامی نہیں ہے۔ تزکیہ نفس کے حوالے سے مسلم معاشرے میں صوفیائے کرام کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ جنوبی ایشیا میں اسلام کو لوگوں تک پہنچانے میں جتنا کام صوفیاء نے کیا ہے کسی اور سے نہیں ہو سکا۔ صرف ایک مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی دینی خدمات سینکڑوں علماء کے کام پر بھاری ہیں۔ جہاں تک کالی بھیڑوں کا تعلق ہے تو وہ ہر طبقے میں موجود ہوتی ہیں، کیا علماء دین میں علمائے حق کے ساتھ ساتھ علمائے سوء کا وجود نہیں۔ یہی حال صوفیاء کا بھی ہیں ان میں بھی جہاں ایک طرف خداترس، مخلص اور متقی حضرات موجود ہیں وہاں دوسری جانب جعلی ڈبہ پیروں کی کمی نہیں مگر اس کے باوجود پورے تصوف کو علی الاطلاق غلط اور غیر اسلامی نہیں کہا جاسکتا۔

مگر غامدی صاحب تصوف کو خلاف اسلام قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے خانقاہی نظام کی بنیاد جس دین پر رکھی گئی ہے اس کے لیے ہمارے ہاں تصوف کی اصطلاح رائج ہے۔ یہ اس دین کے اصول و مبادی سے بالکل مختلف ایک متوازی دین ہے جس کی دعوت قرآن مجید نے بنی آدم کو دی ہے۔''

(برہان، ص146، طبع ستمبر 2001ء لاہور)

''تصوف فی الواقع ایک متوازی دین ہے جسے دینِ خداوندی کی رُوح اور حقیقت کے نام سے اس امت میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' (حوالہ بالا، ص173)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب ہر طرح کے تصوف کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امت مسلمہ کے جلیل القدر صوفیائے کرام کے بارے میں ان کی کیا رائے ہو سکتی ہے؟

5۔ طالب علم غامدی صاحب کی 'قطعیات' شطحیات اور دعاوی

غامدی صاحب اپنی معرکۃ الآ را تصنیف 'میزان' جو ان کے بقول پورے سترہ (17) سال کے عرصے میں لکھی گئی، اس کے مندرجات کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ:

''یہ ایک طالب علم کا نتیجۂ فکر و تحقیق ہے اور اسی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔''

(میزان، ص......طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

مگر یہ بات ان کی تضاد بیانی، دجل و فریب اور منافقت پر مبنی ہے کیونکہ اسی کتاب کے ذریعے وہ تمام قدیم وجدید علما، فقہا، مفسرین اور محدثین و مجتہدین کو قرآن وسنت سمجھانے کے لیے اپنے خانہ ساز اور من گھڑت اصول سکھانا چاہتے ہیں۔ بہت سے دینی معاملات اور شرعی امور کے بارے میں اپنی اختلافی رائے کو حتمی اور قطعی قرار دیتے ہیں۔ ہم ذیل میں ان کی اسی کتاب میزان سے ان کی بعض قطعیات اور دعاوی پیش کرتے ہیں:

1۔ ''سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (ص14)

حالانکہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور بے اصل ہے کیونکہ کسی حدیث یا سنت کے ثبوت کے لیے وہ معیار ہرگز نہیں ہے جو قرآن کے ثبوت کے لیے معیار مقرر ہے۔

2۔ ''اس (قرآن کو سمجھنے) کے لیے قرآن سے باہر کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' (ص22)

3۔ ''ہر معاملے میں یہی کتاب قول فیصل اور صحیفۂ معیار ہے۔ تمام اختلافات میں یہی مرجع

قرار پائے گی۔'' (ص24)

4۔ ''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔'' (ص25)

5۔ ''یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی صرف ایک ہی قراءت ہے۔'' (ص32)

6۔ ''یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیّز نہیں کر سکتے یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں۔'' (ص33)

7۔ ''حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوء فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔'' (ص35)

8۔ ''سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔'' (ص47)

9۔ ''قرآن کی تمام سورتیں آپس میں توام بنا کر اور سات ابواب کی صورت میں مرتب کی گئی ہیں۔'' (ص53)

10۔ ''جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔'' (ص60)

11۔ ''نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔'' (ص61)

12۔ ''یہی معاملہ سنت کا ہے۔ دین کی جو ہدایت اس ذریعے سے ملی ہے، اس کے متعلق بھی یہ بات اس سے پہلے پوری قطعیت کے ساتھ واضح ہو چکی ہے کہ نبی ﷺ نے اسے قرآن ہی کی طرح پورے اہتمام کے ساتھ جاری فرمایا ہے، ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح امت کے اجماع سے ثابت ہے،

یہ بھی اسی طرح اجماع ہی سے اخذ کی جاتی ہے۔ سنت سے متعلق یہ حقائق چونکہ بالکل قطعی ہیں، اس لیے خبر واحد اگر سنت کے منافی ہے اور دونوں میں توفیق کی کوئی صورت تلاش نہیں کی جا سکتی تو اسے لامحالہ رد ہی کیا جائے گا۔'' (ص 62)

13۔ ''دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔'' (ص 64)

14۔ اب کسی شخص کے لیے نہ وحی والہام کا امکان ہے اور نہ مخاطبہ ومکاشفہ کا۔ ختم نبوت کے بعد اس طرح کی سب چیزیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہیں۔'' (ص 150)

15۔ ''شفاعت کے بارے میں یہ قرآن کا نقطۂ نظر ہے۔ اس سلسلہ کی روایتوں کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور اس سے کوئی چیز متجاوز نظر آئے تو اسے راویوں کے تصرفات سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔'' (ص 149)

16۔ ''قرآن مجید، سنت اور حدیث ...... یہ تینوں محل تدبر ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر پر قائم رہنے کے لیے جو چیزیں ہمارے نزدیک ہر طالب علم کے پیش نظر رہنی چاہئیں، وہ ایک ترتیب کے ساتھ ہم یہاں بیان کریں گے۔'' (ص 15)

17۔ ''لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ یہ سب رشتے بھی حرام ہیں۔'' (ص 38)

''قرآن کا مدعا لاریب یہی ہے۔'' (ص 38)

18۔ ''قرآن کے اسلوب سے واقف اس کا کوئی طالب علم اس کے سمجھنے میں ہرگز غلطی نہیں کر سکتا۔'' (ص 38)

19۔ یہ قرآن کی ترتیب ہے۔ اسے اگر تدبر کی نگاہ سے دیکھیے تو سورتوں کے پس منظر اور زمانۂ نزول کو سمجھنے اور قرآن کے مخاطبین، بلکہ بحیثیت مجموعی سورتوں کے موضوع اور مدعا کی تعیین میں بھی جو رہنمائی اس سے قرآن کے طالب علم کو حاصل ہوتی ہے، وہ قرآن سے باہر کسی دوسرے ذریعے سے ہرگز نہیں ہوسکتی۔'' (ص 55)

20۔ ''زکوٰۃ کے مصارف پر تملیک ذاتی کی جو شرط ہمارے فقہا نے عائد کی ہے اس کے لیے کوئی ماخذ قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے، اس وجہ سے زکوٰۃ جس طرح فرد کے

ہاتھ میں دی جاسکتی، اسی طرح اس کی بہبود کے کاموں میں بھی خرچ کی جاسکتی ہے۔''
(ص352)

21۔ ''ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کرسکتی ہے۔'' (ص353)

22۔ ''لہٰذا یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ان الفاظ کے معنی یہاں اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے کہ دین سرزمین عرب میں پورا کا پورا اللہ کے لیے ہوجائے۔'' (ص597)

23۔ ''لہٰذا یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کرکے انہیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اس کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔'' (ص601)

24۔ سورۂ احزاب کی جس آیت (59) میں ازواج مطہرات، نبی ﷺ کی بیٹیوں اور عام مسلمانوں عورتوں کو چادر کے ذریعے پردے کا حکم دیا گیا ہے اس کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں: ''یہ کوئی پردے کا حکم نہ تھا بلکہ مسلمان عورتوں کے لیے الگ شناخت قائم کردینے کی ایک وقتی تدبیر تھی جو اوباشوں اور تہمت تراشنے والوں کے شر سے مسلمان عورتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی۔'' (حوالہ بالا ص470)

25۔ اسلام میں بعض جرائم پر موت کی سزا ہے جیسے قصاص، حرابہ یعنی ڈاکہ، ارتداد اور شادی شدہ شخص کے زنا پر رجم یعنی سنگساری کی سزا وغیرہ مگر غامدی صاحب کیا دعویٰ فرماتے ہیں کہ:

''موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں نہیں دی جاسکتی۔'' (حوالہ، بالا ص611)

قارئین ان چند نمونوں سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ کیسا عجیب طالب علم ہے جو 'قطعیت' کے ساتھ پوری امت مسلمہ کے فقہاء، مجتہدین، محدثین اور مفسرین کو اپنا 'دین الٰہی'

سکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں یہ سب حضرات دین سے ناواقف اور ناآشنا تھے۔

6۔ غامدی صاحب کی عربی دانی

کچھ عرصہ پہلے ماہنامہ 'ساحل' کراچی کی اشاعت اپریل 2007ء میں محترم ڈاکٹر رضوان علی ندوی صاحب نے غامدی صاحب کی عربی دانی کا بھانڈا پھوڑا تھا اور ان کی بعض عربی عبارات میں غلطیوں کی بھرمار کی نشاندہی کی تھی۔

ہم ذیل میں غامدی صاحب کی 'شاہکار' کتاب 'میزان' کے حوالے سے ان کی عربیت کی بعض غلطیوں کی طرف اشارات کریں گے۔

خانہ کعبہ کو بیت اللہ بھی کہا جاتا ہے جو عربیت کی رو سے مرکب اضافی ہے جس کا ترجمہ ہے 'اللہ کا گھر' لیکن غامدی صاحب اسے البیت الحرام لکھنے کی بجائے (جیسا کہ سورۃ المائدہ آیت 97 میں ہے) اسے ہمیشہ 'بیت الحرام' لکھنے کے عادی ہیں اور جس کے معنی ہیں 'حرام کا گھر' جو نہ صرف عربیت کے خلاف ہے بلکہ شعائر اللہ کی توہین کے زمرے میں آتا ہے اسے کمپوزنگ کی غلطی بھی نہیں مانا جا سکتا کیونکہ نصف درجن سے زیادہ مقامات پر یہ غلطی نادانستہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مقامات یہ ہیں:

1۔ ''بیت الحرام کا حج کیا جائے۔'' (میزان، ص 73، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

2۔ ''خدا کی زمین پر اس کی عبادت کے اولین مرکز بیت الحرام کی تولیت انہیں عطا کی گئی۔'' (حوالہ بالا، ص 170)

3۔ ''ہم ام القریٰ مکہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی اس مسجد کے لیے عزم سفر کرتے ہیں جسے بیت الحرام کہا جاتا ہے۔'' (حوالہ بالا، ص 371)

4۔ ''تلبیہ اس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔ (حوالہ، بالا ص 373)

5۔ بیت الحرام کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش اپنا یہ حق سمجھتے تھے کہ وہ جس کو چاہیں حج وعمرہ کے لیے حرم میں آنے دیں اور جس کو چاہیں، اس کی حاضری سے محروم کر دیں۔

(حوالہ بالا، ص376)

6۔ بیت الحرام: یہ وہی معبد ہے جسے قرآن میں 'البیت، البیت العتیق' اور المسجد الحرام کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔" (حوالہ بالا، ص384)

7۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تقریباً چار ہزار سال پہلے جب اللہ کے حکم سے یہاں آئے تو بیت الحرام امتدادِ زمانہ کی ستم رانیوں سے گر چکا تھا اور اس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ (حوالہ بالا، ص384)

8۔ "بیت الحرام کی زیارت کے لیے آنے والے اس (زمزم) سے اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔" (حوالہ بالا، ص583)

9۔ "بیت الحرام کا دروازہ زمین سے کوئی دو میٹر اونچا ہے۔" (حوالہ بالا، ص385)

10۔ اسی طرح وہ مکے اور مدینے کو حرم لکھنے کی بجائے حرام لکھتے ہیں: مکے اور مدینے کو حرم قرار دیا گیا ہے مگر غامدی صاحب ان کو حرام لکھتے ہیں:

"آپ ﷺ نے لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح مکہ کو حرام ٹھہرایا ہے میں نے اسی طرح مدینہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔" (حوالہ بالا، ص401)

11۔ سورۃ البقرہ آیت 198 کے ترجمے میں مشعر حرام یا المشعر الحرام کو مشعر الحرام لکھا ہے جو کہ عربیت کے خلاف اور اردو زبان کے لحاظ سے غلط ہے:

"جب عرفات سے چلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو۔" (حوالہ بالا، ص381)

یہ حال ہے غامدی صاحب کا جن کو عربی دانی کا زعم باطل ہے جو کلامِ جاہلیت کے ماہر اور عربی لغت و بلاغت کے امام بنتے ہیں۔

7۔ دوسروں کے خلاف طنز اور طعن و تشنیع کا انداز

جو لوگ غامدی صاحب کے کسی نقطۂ نظر سے اختلاف کا 'گناہ' کر بیٹھیں ان کے خلاف

وہ کبر نفس اور غرور علمی کے ساتھ طنز اور طعن و تشنیع کا کیسا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لیے یہاں پر صرف دو مثالیں دی جا رہی ہیں۔

1۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں:

''ڈاکٹر صاحب کس اہرام کو ڈھانے کے لیے کیا سنگریزے نکال کر لائے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دین و شریعت کو ان کے غوامض میں اتر کر پڑھنا اور سمجھنا تو خیر ایک مشکل کام ہے ہی، ان دلیلوں سے تو معلوم ہوا کہ اپنے گردو پیش کی حقیقتوں کو دیکھنا اور تھوڑی دیر کے لیے ان پر غور کر لینا بھی غالباً شب و روز کی 'انقلابی مصروفیات' میں اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔''

(برہان، ص245، طبع جون 2006ء لاہور)

2۔ ڈاکٹر محمود الحسن عارف صاحب کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اس تفسیر (تدبر قرآن) کو کچھ کچھ سمجھ لینے میں کامیاب ہو جاتے، لیکن انہوں نے اس پر تنقید لکھنے کی کوشش کی ہے اور دیکھئے کس مبلغ علم کے ساتھ کی ہے۔''

(برہان، ص301۔302 طبع جون 2006ء لاہور)

یہ دوسروں کو اخلاقیات اور احترام انسانیت کا درس دینے والے کا اندازِ تخاطب ہے اور جب خود ان پر اس انداز میں تنقید کی جائے تو چیخ کر کہنے لگتے ہیں کہ ہم پر تنقید کرنے والوں کا انداز علمی نہیں ہوتا بلکہ وہ محض طنز اور طعن و تعریض سے کام لیتے ہیں۔



باب 9:

فکری تضادات

غامدی صاحب کے ہاں فکری تضادات کی بھرمار ہے۔ وہ ایک جگہ ایک بات لکھتے ہیں تو دوسری جگہ اس کے خلاف بات کہتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور یہ بھی سچ ہے کہ

دروغ گورا حافظہ نباشد

ہم آئندہ سطور میں ان کے بعض فکری تضادات دکھا رہے ہیں جو زیادہ تر ان کی ایک ہی کتاب 'میزان' طبع سوم مئی 2008ء میں موجود ہیں۔

1۔ نجات کے لیے مطلوب ایمان میں تضاد (پانچ چیزوں سے ایمان عبارت ہے اور صرف دو چیزوں سے بھی):

ایمان سے کیا مراد ہے؟ اس کی وضاحت میں غامدی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ (ایمان) بھی پانچ ہی چیزوں سے عبارت ہے:

1۔ اللہ پر ایمان

2۔ فرشتوں پر ایمان

3۔ نبیوں پر ایمان

4۔ کتابوں پر ایمان

5۔ روزِ جزا پر ایمان (میزان، ص73، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

پھر نجات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ایمان اور عمل لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا جس طرح ایمان کے ساتھ عمل ضروری

ہے، اسی طرح عمل کے ساتھ ایمان بھی ضروری ہے۔ نجات کے لیے قرآن نے ہر جگہ اسے شرط اولین قرار دیا ہے۔'' (حوالہ بالا، ص85)

مگر اپنے ایک باتصویر انٹرویو میں جوان کے زیر سرپرستی چلنے والے مصعب سکول سسٹم (جوہر ٹاؤن لاہور) کے سالانہ مجلّہ 'مصعبی' بابت 2008۔2009 میں چھپا ہے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ غیر مسلم بھی، خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی نجات پا سکتا ہے اور جنت کا حقدار ہے بشرطیکہ وہ خدا اور آخرت پر یقین رکھے، اچھے کام کرے اور جرائم سے دور رہے۔ اصل سوال اور غامدی صاحب کا جواب یہ ہے:

سوال: کیا جنت میں صرف مسلمان ہی جائیں گے یا کوئی نیک غیر مسلم بھی جنت میں جا سکتا ہے؟

جواب: جنت میں جانے کا معیار قرآن میں بیان ہے، خدا اور آخرت پر یقین، اچھے اعمال کرنا اور جرائم سے دور رہنا۔ خواہ اب وہ مسلمان ہو، عیسائی ہو، یہودی ہو یا کسی بھی مذہب کو ماننے والا جنت کا حقدار ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب ایک جگہ تو ایمان کو پانچ امور سے عبارت بتاتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ پر، فرشتوں پر، نبیوں پر، کتابوں پر اور روزِ جزا پر ایمان لانا ہے۔ اور اسی کو قرآن کی رو سے نجات کے لیے شرط اولین قرار دیتے ہیں مگر دوسری جگہ اسی ایمان کو صرف دو امور...... خدا اور آخرت پر یقین میں منحصر اور محدود مانتے ہیں جس کی بنا پر ہر غیر مسلم خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اسے بھی جنت اور نجات کا پروانہ دیتے ہیں۔

حالانکہ قرآن کی رو سے نبیوں، فرشتوں اور الہامی کتب کو نہ ماننے والا بھی غیر مسلم اور کافر ہے بلکہ کسی ایک نبی کا منکر بھی سب نبیوں کا منکر ہے اور وہ نجات اور جنت کا حقدار نہیں ہو سکتا۔ اور صحیح حدیث میں ہے کہ جو حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں رکھتا وہ بھی نجات نہیں پا سکتا اور وہ دوزخی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ، لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِہِ الْاُمَّةِ: یَهُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ، ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ)) (صحیح مسلم، رقم: 386)

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ اس امت کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے، خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی، جو میری رسالت کی خبر سنے اور اس پیغام کو جو میں لایا ہوں نہ مانے اور پھر دوزخیوں میں شامل نہ ہو۔''

2۔ سنن کی تعداد میں تضاد:

جناب غامدی صاحب کے ہاں اُمورِ سنت اور دین میں بھی تضادات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ داڑھی کو کبھی سنت اور دین کہتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاں ایک وقت میں وضو اور تیمم سنت اور دین ہوتے ہیں اور دوسرے وقت وہ ان دونوں کو سنت اور دین کے دائرے سے نکال باہر کرتے ہیں۔ وہ کبھی حرمین شریفین کی حرمت کو سنت اور دین قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے الگ کر دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں کبھی اشہرِ حرم سنت اور دین ہوتے ہیں اور کبھی دین نہیں ہوتے۔ کبھی طلاق اُن کے نزدیک سنت اور دین ہے اور کبھی سنت اور دین نہیں ہے۔ کبھی سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت سنت ہوتی ہے اور کبھی اُسے سنت کے اُمور سے خارج کر دیا جاتا ہے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر بار اپنے اس تغیر و تبدل کو وہ پوری قطعیت کے ساتھ سنت اور دین کہتے پھرتے ہیں اور پھر بالکل قطعیت کے ساتھ اُسے سنت اور دین کے اعزاز سے محروم بھی کر دیتے ہیں ؎

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غامدی صاحب جون 1991ء میں داڑھی کو سنت مانتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط بنام جناب شیر محمد اختر صاحب میں لکھتے ہیں کہ:

''رجم کا معاملہ چونکہ دوسری قسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، اس وجہ سے میں نے اس

پر بحث کی اور عام رائے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ورنہ داڑھی، ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔"

(جاوید غامدی صاحب کا خط بنام جناب شیر محمد اختر صاحب، بحوالہ ماہنامہ اشراق، شمارہ جون 1991ء، ص 32)

اس کے بعد جب مئی 1998ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) اُمور پر مشتمل سنت اور دین کی ایک مکمل اور جامع فہرست جاری فرمائی تو اس میں داڑھی کی سنت کو شامل نہیں کیا اور اسے اس فہرست سے غائب کر دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ لکھا ہے کہ:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) جانوروں کا تذکیہ۔ (6) نکاح۔ (7) نکاح کا خطبہ۔ (8) مونچھیں پست رکھنا۔ (9) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (10) بغل کے بال صاف کرنا۔ (11) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (12) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (13) ناک، منہ اور دانتوں ک صفائی۔ (14) استنجا۔ (15) غسلِ جنابت۔ (16) میت کا غسل۔ (17) تجہیز و تکفین۔ (18) تدفین۔ (19) وضو۔ (20) تیمم۔ (21) اذان۔ (22) اقامت۔ (23) نماز کے لیے مساجد کا اہتمام۔ (24) شب و روز کی پانچ لازمی نمازیں۔ (25) نمازِ جمعہ۔ (26) نمازِ عیدین۔ (27) نمازِ جنازہ۔ (28) روزہ۔ (29) اعتکاف۔

(30)عید الفطر۔ (31)صدقہ ، عید الفطر۔ (32)زکوٰۃ۔ (33)ہدی۔ (34)طواف۔ (35)حرمین شریفین کی حرمت۔ (36)اشہر حرم۔ (37)حج و عمرہ۔ (38)عید الاضحیٰ۔ (39)عید الاضحیٰ کی قربانی۔ (40)ایام تشریق میں نمازوں کے بعد تکبیریں۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی، اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں، اُمت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی 1998، ص35)

اس کے بعد اپریل 2002ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) سنتوں کے اس دین کو صرف ستائیس (27) سنتوں میں تبدیل کر کے اسی دین کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر لیا۔

سُنتیں جب گھٹ گئیں تو دین کامل ہو گیا
غامدی کو گوہرِ مقصود حاصل ہو گیا

چنانچہ سنتوں کی ایک اور فہرست جاری فرماتے ہوئے لکھا:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (9) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔

(10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب۔ (13) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (14) غسلِ جنابت۔ (15) میت کا غسل۔ (16) تجہیز و تکفین۔ (17) تدفین۔ (18) عید الفطر۔ (19) عید الاضحیٰ۔ (20) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ (21) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات۔ (22) زکوٰۃ اور اس کے متعلقات۔ (23) نماز اور اس کے متعلقات۔ (24) روزہ اور صدقہ فطر۔ (25) اعتکاف۔ (26) قربانی۔ (27) حج و عمرہ اور ان کے متعلقات۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

(میزان، ص 10، طبع دوم، اپریل 2002ء)

سنت کی اس ترمیم شدہ فہرست پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے داڑھی حسب معمول غائب ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تیرہ (13) اُمور کو سنت سے خارج کر دیا گیا ہے جن میں وضو، تیمم، حرمین شریفین کی حرمت، ہدی، طلاق، اشہر حرم، نمازِ عیدین، نمازِ جنازہ، نمازِ جمعہ، نماز کے لیے مساجد کا اہتمام وغیرہ شامل ہیں۔

پھر اس کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ لی تو غامدی صاحب نے بھی مئی 2008ء میں سنت کی مزید ترمیم شدہ فہرست جاری کرتے ہوئے لکھا:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

عبادات:

(1) نماز۔ (2) زکوٰۃ اور صدقہ فطر۔ (3) روزہ و اعتکاف۔ (4) حج و عمرہ۔

(5) قربانی اور ایامِ تشریق کی تکبیر۔

معاشرت:

(1) نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔ (2) حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب۔

خورد و نوش:

(1) سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ (2) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم و آداب:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (9) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض ونفاس کے بعد غسل۔ (13) غسلِ جنابت۔ (14) میت کا غسل۔ (15) تجہیز وتکفین۔ (16) تدفین۔ (17) عید الفطر۔ (18) عید الاضحیٰ۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

(اُصول ومبادی، ص10، 11، طبع فروری 2005ء)

اب ہم سنت کی اس مزید ترمیم شدہ تیسری فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ اس میں:

1۔ خورد ونوش کے تحت ''سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے

جانور کی حرمت'' کے عنوان سے ایک نئی سنت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن سنت کی ستائیس (27) کی تعداد کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ترکیب کی گئی ہے کہ ''اعتکاف'' کی الگ سنت کو روزے کی سنت کے ساتھ ملا دیا گیا تاکہ گنتی کا میزانیہ (Total) پورا رہے اور کسی ممکنہ اعتراض سے بچا جا سکے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

2۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں ''روزہ اور صدقہ فطر'' ایک سنت تھی۔ تیسری ترمیم شدہ فہرست میں ''روزہ اور اعتکاف'' ایک سنت قرار پائی۔

3۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں زکوٰۃ کی سنت کے ساتھ صدقہ فطر کی سنت شامل نہ تھی بلکہ وہ اس سے الگ ایک سنت تھی مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں زکوٰۃ کی سنت کے ساتھ صدقہ فطر کی سنت کو ملا کر دو سنتوں کی ایک سنت بن گئی۔

4۔ دوسری ترمیم شدہ سنت میں نماز کی سنت کے ساتھ اس کے متعلقات بھی شامل تھے مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں نماز کی سنت سے اس کے متعلقات غائب کر دیے گئے۔

5۔ دوسری ترمیم شدہ سنت میں حج و عمرہ کی سنت کے ساتھ اُن کے متعلقات بھی شامل تھے مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں حج و عمرہ کے متعلقات حذف کر دیے گئے۔

6۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں اعتکاف ایک مستقل سنت تھی جسے تیسری ترمیم شدہ فہرست میں روزے کے ساتھ شامل کر کے ''روزہ و اعتکاف'' کی ایک ہی سنت بنا لی گئی، اس طرح گویا اب اعتکاف نصف سنت قرار پائی جو پہلے پوری سنت تھی۔

7۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں قربانی ایک مستقل اور الگ سنت تھی مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں اُس کے ساتھ ''ایام تشریق کی تکبیر'' نامی سنت شامل کر کے اُسے ایک ہی سنت بنا لیا گیا۔

یاد رہے کہ ''ایامِ تشریف کی تکبیروں'' والی سنت مئی 1998ء کی پہلی فہرست میں موجود

تھی جو اپریل 2002ء کی فہرست سے خارج کر دی گئی اور پھر 2005ء کی فہرست میں اُسے دوبارہ شامل کر لیا گیا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نے سنت اور دین کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے جس میں وہ اپنے من مانے طریقے سے حسب خواہش ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں، اور اس شریعت سازی کے نتیجے میں ان کے ہاں کھلے تضادات جنم لیتے ہیں۔

3۔ حدیث پر غور کرنے میں تضاد:

غامدی صاحب کے ہاں ''اُصول سازی'' اور ''اُصول شکنی'' عام ہے۔ وہ دوسروں کو جن اُصولوں کا پابند کرتے ہیں خود اُن اُصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ جو اُصول وہ اپنے لیے بناتے ہیں خود ان پر بھی کاربند نہیں ہوتے۔

احادیث پر بحث واستدلال کرنے کے لیے اُنہوں نے ایک اُصول بیان کیا ہے کہ اس باب کی تمام روایات کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے مگر مرتد کی سزا کے بارے میں انہوں نے خود اس اُصول کی پابندی نہیں کی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''چوتھی چیز یہ ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس باب کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے لیکن اسی باب کی تمام روایتوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔'' (میزان، ص 64-65، طبع سوم، مئی 2008ء)
>
> (اصول و مبادی، ص 72، طبع فروری 2005ء)

مگر جب مرتد کی سزا کا معاملہ آیا تو اس پر بحث واستدلال کرتے وقت انہوں نے اس باب کی کئی احادیث چھوڑ کر صرف ایک حدیث کو لے کر اپنی غلط رائے قائم کر لی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے:
((من بدّل دینہ فاقتلوہ)) ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کردو۔'' ہمارے فقہاء اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رُو سے لازماً قتل کردیا جائے گا۔'' (برہان، ص139، طبع چہارم، جون2006ء)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ:

''لیکن فقہا کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم تو بے شک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا بلکہ صرف اُنہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآن مجید میں اُمیین یا مشرکین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔''

(برہان، ص140، طبع چہارم، جون2006ء)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

''ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ اُنہوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود وتعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کردیا جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔''

(برہان، ص143، طبع چہارم، جون2006ء)

دیکھیے، مرتد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب صرف ایک حدیث کو مدار بنا کر اس معاملے میں بحث و استدلال فرما رہے ہیں (اور وہ بھی لغت عرب کے خلاف معنی لے رہے ہیں) اور اس باب کی درج ذیل احادیث سے اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر

رکھی ہیں۔

1۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عن عبداللّٰہ قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا یحل دم امرئٍ مسلم یشھد أن لا الٰہ إلاّ اللّٰہ، وانّی رسول اللّٰہ الّا باحدی ثلاث: النفس بالنفس، والثیب الزانی، والمفارق لدینہ التارك للجماعۃ.)) (صحیح بخاری، رقم: 2878)

''حضرت عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، ماسوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔''

یہی حدیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد میں بھی موجود ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔

2۔ دوسری حدیث جس سے غامدی صاحب نے مرتد کے مسئلے میں چشم پوشی کی ہے وہ سنن ابی داؤد کی حدیث ہے کہ:

((عن ابی امامۃ بن سھل قال: کنا مع عثمان وھو محصور فی الدار، وکان فی الدار مدخل من دخلہ سمع کلام من علی البلاط. فدخلہ عثمان، فخرج الینا وھو متغیر لونہ، فقال: انھم لیتواعدوننی بالقتل آنفاً. قال: قلنا یکفیکھم اللّٰہ یا امیر المؤمنین! قال: ولم یقتلوننی؟ سمعت رسول اللّٰہ یقول: لا یحل دم امرئٍ مسلم الاّ باحدی ثلاث: کفر بعد إسلام، أو زنا بعد

احصان، أو قتل نفس بغير نفس، فوالله ما زنيت في جاهلية ولا في إسلام قط، ولا احببت ان لي بديني بدلا منذ هداني الله، ولا قتلت نفسا فبم يقتلونني؟))

(سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، حدیث نمبر4502)

''حضرت ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اسکے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہو جائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کر دے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

اس طرح غامدی صاحب اپنے مسلمہ اُصولوں کی خود ہی دھجیاں بکھیرتے ہیں اور فکری تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

4۔ کیا امام زہریؒ غیر ثقہ راوی ہیں اور معتبر بھی؟

غامدی صاحب کے تضادات میں سے ایک تضاد یہ ہے کہ وہ مشہور محدث اور فقیہ امام

ابن شہاب زہریؒ کو غیر ثقہ اور نا قابل اعتبار راوی بھی قرار دیتے ہیں مگر پھر اُنہی کی روایت کردہ احادیث سے استدلال بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ غامدی صاحب نے صحاح کی مشہور حدیث ''سبعہ حرف'' پر بحث کرتے ہوئے اُس کے ایک راوی امام زہریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اُن (امام زہریؒ) کی کوئی روایت بھی، بالخصوص اس طرح کے اہم معاملات میں قابل قبول نہیں ہو سکتی۔'' (میزان، ص 31، طبع سوم، مئی 2008ء)

اس مقام پر غامدی صاحب نے امام زہریؒ کو غیر ثقہ اور نا قابل اعتبار راوی قرار دیا ہے اور اُن کی کوئی روایت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ امام ابن شہاب زہریؒ کو محدثین، فقہاء اور ائمہ جرح و تعدیل نے ثقہ بلکہ اوثق اور قابل اعتبار راوی قرار دیا ہے۔

چنانچہ امام ابن حجر عسقلانی نے ''تقریب'' (جلد 2، ص 207) میں، امام ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' (جلد 4، ص 40) میں اور امام ابن حبان نے ''کتاب الثقات'' (جلد 3، ص 4) میں اُن کو ثقہ اور قابل اعتبار راوی تسلیم کیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی شہرہ آفاق کتاب 'الفاروق' میں امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کو نہایت مستند راوی قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تمام محدثین کے نزدیک حدیث کے دو سلسلے سب سے زیادہ مستند ہیں اور محدثین اس سلسلے کو زنجیر زر (سلسلۃ الذہب) کہتے ہیں، یعنی اوّل وہ حدیث جس کی روایت کے سلسلے میں امام مالک، نافع رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ہوں۔ دوسری وہ حدیث جس کی روایت کے سلسلے میں زہری، سالم رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ واقع ہوں۔'' (الفاروق، ص 428)

لطف کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب نے اپنی جس کتاب ''میزان'' میں امام زہریؒ کو غیر ثقہ اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اُسی کتاب کے تقریباً ہر باب میں اُن کی درجنوں مرویات کو صحیح مان کر اُن سے اپنے حق میں استدلال بھی کیا ہے۔

مثال کے طور پر اپنی کتاب ''میزان'' کے درج ذیل مقامات پر غامدی صاحب نے امام زہریؒ ہی کی روایت کردہ احادیث سے استدلال کیا ہے:

1۔ ص 171 پر کافر اور مسلم کی وراثت سے متعلق صحیح بخاری کی حدیث نمبر 6764

2۔ ص 254 پر قانون جہاد سے متعلق اجر وثواب کے بارے میں صحیح بخاری کی حدیث نمبر 2787

3۔ ص 297 پر حدود وتعزیرات میں قتل خطا سے متعلق صحیح بخاری کی حدیث نمبر 1499

4۔ ص 337 پر قسم اور کفارہ سے متعلق ابوداؤد کی حدیث نمبر 3290

اس طرح غامدی صاحب کے ہاں یہ کھلا تضاد پایا جاتا ہے کہ وہ امام زہریؒ کو ایک جگہ غیر ثقہ اور غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہوں پر اُن کو ثقہ اور معتبر قرار دے کر اُن کی روایت کردہ احادیث سے استدلال بھی کرتے ہیں۔ کیا یہ اُصول پرستی ہے یا خواہش پرستی؟

5۔ قرآن وسنت کے مقدم ومؤخر ہونے میں تضاد:

غامدی صاحب کے ہاں یہ بھی کھلا تضاد موجود ہے کہ وہ کبھی قرآن کو سنت پر مقدم مانتے ہیں اور کبھی سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ ایک جگہ قرآن کو ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر شخص پابند ہے کہ اس (قرآن) پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے۔''

(میزان ص 24، طبع سوم مئی 2008ء)

پھر اسی کتاب ''میزان'' میں آگے چل کر سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔''

(میزان ص 47، طبع سوم مئی 2008ء)

ہم جانتے ہیں کہ غامدی صاحب نے ان دونوں مقامات پر حرف ''پر'' اور حرف ''سے'' کا مغالطہ دیا ہے مگر یہ مغالطہ اس وقت مغالطہ نہیں رہتا بلکہ ایک کھلا تضاد بن کر سامنے آتا ہے

جب اسے اُردو زبان کے درج ذیل دو جملوں کی روشنی میں دیکھا جائے:

1۔ اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کو مقدم نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

2۔ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ سے مقدم ہیں۔

کیا کوئی آدمی جو اُردو زبان جانتا ہے مذکورہ دونوں فقروں میں کھلا تضاد نہیں پائے گا؟

6۔ پنجگانہ نماز فرض بھی ہے سنت بھی ہے مگر اس کی رکعتیں فرض ہیں:

''نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے'' (حوالہ بالا، ص308)

''نماز سنت ہے۔'' (حوالہ بالا، ص14)

''نماز کی فرض رکعتیں یہی ہیں۔'' (حوالہ بالا، ص312)

7۔ روزہ سنت بھی ہے اور فرض بھی اور قانون بھی:

''روزہ سنت ہے۔'' (میزان، ص14، طبع سوم مئی 2008)

''ایمان والوں پر روزہ اُسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح اُن سے پہلوں پر فرض کیا گیا۔'' (حوالہ بالا، ص347)

''روزہ کا قانون: انبیا علیہ السلام کے دین میں روزے کا جو قانون ہمیشہ رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُسی کے مطابق روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔'' (حوالہ بالا، ص367)

''روزے کا یہ قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواترِ عملی سے ثابت ہے اور قرآن مجید نے بڑی حد تک اس کی تفصیل کر دی ہے۔ (حوالہ بالا، ص369)

8۔ زکوٰۃ قانون بھی ہے فرض بھی اور سنت بھی:

''زکوٰۃ سنت ہے۔'' (میزان، ص14 طبع سوم مئی 2008ء)

''لہٰذا یہ (زکوٰۃ) پہلے سے موجود ایک سنت تھی۔'' (حوالہ بالا، ص347)

''زکوٰۃ کا قانون: زکوٰۃ کا قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواترِ عملی سے ہم تک

پہنچا ہے۔" (میزان،ص350،طبع سوم مئی 2008)

"زکوٰۃ کا قانون یہی ہے۔" (حوالہ بالا،ص 352)

"زکوٰۃ کی فرضیت" (میزان،ص137 طبع دوم اپریل2002ء)

9۔ حج سنت ہے بھی، فرض بھی اور اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت وحمایت بھی:

"حج سنت ہے۔" (میزان،ص14،طبع سوم مئی2008ء)

"یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض قرار دی گئی ہے۔" (حوالہ بالا،ص374)

"حج اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت وحمایت کا علامتی اظہار ہے۔" (حوالہ بالا،ص263)

10۔ حج وعمرہ کا تلبیہ کس نے مقرر کیا؟ اللہ تعالیٰ نے یا نبی ﷺ نے؟

تلبیہ کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے حالانکہ یہ پورے قرآن میں کہیں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"حج وعمرہ کے لیے تنہا یہی ذکر (تلبیہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔"

(میزان،ص388،طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

پھر ایک حدیث کے مطابق لکھتے ہیں کہ:

"چنانچہ فرمایا ہے کہ جبریل امین نے مجھے ہدایت کی ہے کہ اسے بلند آواز سے کہا جائے۔" (حوالہ بالا،ص396)

11۔ قربانی قانون بھی ہے، سنت بھی، نفل بھی اور رسوم وآداب بھی:

وہ قربانی کو قانون قرار دیتے ہیں:

"قربانی کا قانون: قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے: قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہوسکتی ہے۔"

(میزان،ص405،طبع سوم مئی 2008)

''قربانی کا قانون یہی ہے۔'' (حوالہ بالا ص406)

پھر یہی قربانی نفل ہو جاتی ہے:

''یہی قربانی ہے جو حج وعمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔'' (حوالہ، بالا، ص404)

پھر کبھی یہ قربانی رسوم وآداب کا حصہ بن جاتی ہے:

''قربانی رسوم وآداب میں سے ہے۔'' (حوالہ بالا ص649)

12۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ، سنت بھی ہیں اور رسوم وآداب بھی:

''عید الفطر اور عید الاضحیٰ، سنت ہیں۔'' (میزان، ص14، طبع سوم مئی 2008ء)

''یہ رسوم وآداب میں سے ہیں۔'' (حوالہ بالا ص648)

13۔ قانون اتمامِ حجت کا تعلق پہلے صرف رسول ﷺ سے تھا پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہو گیا:

''(جہاد وقتال کی) دوسری صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمام حجت سے ہے جو اس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم سے اور انہی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنہیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا ہے۔ (میزان، ص580، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

پھر رسول ﷺ کے بعد اس قانون اتمامِ حجت کا تعلق صحابہ کرام کے ساتھ قائم ہو گیا:

''اس کے لازمی نتیجہ یہ تھا کہ رسولوں کی طرف سے اتمام حجت کے بعد دنیا ہی میں جزا وسزا کے قانون کا اطلاق ان قوموں پر بھی کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور جزیرہ نما میں اپنی حکومت مستحکم کر لینے کے بعد صحابہ کرام اس اعلان کے ساتھ ان اقوام پر حملہ آور ہو گئے کہ اسلام قبول کرو یا زبردست بن کر جزیہ دینے کے لیے

تیار ہو جاؤ۔ اس کے سوا اب زندہ رہنے کی کوئی صورت تمہارے لیے باقی نہیں رہی۔'' (حوالہ، بالا، ص 601)

14۔ وارث کے حق میں وصیت جائز بھی ناجائز بھی:

وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اللہ کی طرف سے اس قانون کے نازل ہو جانے کے بعد اب کسی مرنے والے کو رشتہ داری کی بنیاد پر اللہ کے ٹھہرائے ہوئے وارثوں کے حق میں وصیت کا اختیار باقی نہیں رہا۔'' (میزان، ص 525، طبع سوم، مئی 2008ء)

پھر چند سطروں کے بعد یہ لکھتے ہیں کہ:

''تاہم اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وارثوں کی کوئی ضرورت یا اُن میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اس طرح کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو اس صورت میں اُن کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔'' (حوالہ بالا)

15۔ حدیث سے شرعی حکم ثابت بھی ہوتا ہے اور ثابت نہیں بھی ہوتا:

غامدی صاحب پہلے تو ہر حدیث کو خبر واحد (اخبار آحاد) قرار دیتے ہیں پھر اسے دین سے خارج کر دیتے ہیں اور اس کے ذریعے سے کسی عقیدہ وعمل اور شرعی حکم کو نہیں مانتے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔'' (میزان، ص 15، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

مگر پھر ایک حدیث کے ذریعے جو خبر واحد ہے، مدینے کے حرم ہونے کو مانتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''حرم مدینہ کے بارے میں آپ ﷺ نے لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح مکہ کو حرام ٹھہرایا ہے، میں نے اسی طرح مدینہ کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

(میزان، ص 401، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

16۔ کبھی صرف قرآن میزان ہے تو کبھی سنت بھی میزان

غامدی صاحب کبھی صرف قرآن کو میزان قرار دیتے ہیں اور کبھی اس کے ساتھ سنت کو بھی میزان ٹھہراتے ہیں۔ کبھی ایک میزان اور کبھی دو میزانیں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''قرآن میزان ہے...... چنانچہ تولنے کے لیے یہی ہے۔ اس دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس پر اسے تولا جا سکے۔'' (میزان، ص 22، طبع دوم اپریل 2002ء)

''ہر چیز اب اسی میزان (قرآن) پر تولی جائے گی۔''

(میزان حصہ اوّل، ص 140، طبع 1985ء)

مگر دوسرے موقع پر صرف قرآن ہی میزان نہ رہا بلکہ قرآن کے ساتھ سنت بھی میزان بن گئی۔ پہلے ایک میزان تھی، اب دو ہو گئیں اور تضاد بالکل واضح ہو گیا۔ چنانچہ ''اشراق'' جس کے مدیر غامدی صاحب ہیں، میں یہ اشتہار عرصے تک چھپتا رہا کہ:

''قاری محترم!

اشراق ایک تحریک ہے، علمی تحریک ...... فکر و نظر کو قرآن و سنت کی میزان میں تولنے کی تحریک......''

(ماہنامہ اشراق، بابت اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر اور دسمبر 1991ء)

اس طرح غامدی صاحب ایک طرف صرف قرآن کو میزان قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف سنت کو بھی میزان مانتے ہیں اور یہ چیز بھی اُن کے ہاں کھلے تضاد کی صورت میں موجود ہے۔

17۔ حدیث سے قرآنی حکم کی تحدید ہونے میں تضاد:

غامدی صاحب پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے کسی حکم کی

تحدید نہیں ہو سکتی اور یہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایسا ہونے سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے جو کسی حال میں صحیح نہیں۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کر سکتا۔''

(میزان، ص 25، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 24، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اپنے اس دعوے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔

(میزان، ص 35، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی، ص 36، طبع فروری 2005ء، لاہور)

مگر پھر اپنے اس دعوے کے خلاف حدیث سے قرآن کے حکم کی تحدید بھی مان لی ہے اور اس کے نتیجے میں معلوم نہیں قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کی حیثیت مشتبہ ہو گئی ہے یا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر قرآنی حکم:

﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ (النساء: 34)

''اور اُن کو مارو۔''

بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ نے اس کی حد 'غیر مبرح' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کہ پایدار اثر چھوڑے۔''

(میزان، ص 423، طبع سوم 2008ء، لاہور)

(قانون معاشرت، ص 30، طبع اوّل، مئی 2005ء لاہور)

اس طرح غامدی صاحب پہلے اپنے جی سے ایک اصول گھڑتے اور پھر اپنے اس موضوعہ اصول کا خود ہی خون کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ایسے تضادات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

18۔ قرآنی الفاظ کے صرف معروف معنی مراد لینا

غامدی صاحب قرآن مجید کے الفاظ کے صرف معروف معنی لینے کو جائز سمجھتے ہیں اور اگر معروف معنی نہ لیے جائیں تو ان کے نزدیک ایسا کرنا ناجائز ہے۔

وہ اپنے موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اس قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیش نظر رہنے چاہئیں، ان سے ہٹ کر ان کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جا سکتی۔''

(میزان، ص 18، طبع دوم اپریل 2002ء)

اس کے بعد اپنے موقف کو درج ذیل مثالوں سے واضح کرتے ہیں:

''وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ میں اَلنَّجْمُ کے معنی ''تاروں'' ہی کے ہو سکتے ہیں۔ إِلا إِذَا تَمَنّٰى میں لفظ تَمَنّٰى کا مفہوم خواہش اور ارمان ہی ہے۔ أَفَلا يَنْظُرُوْنَ إِلَى الْإِبِلِ میں الْإِبِلِ کا لفظ اونٹ ہی کے لیے آیا ہے۔ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ میں بَيْضٌ انڈوں ہی کے معنی میں ہے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ میں نَحَرْ کا لفظ قربانی ہی کے لیے ہے۔ اور اسے ''بوٹیوں'' اور ''تلاوت'' اور ''بادل'' اور ''انڈوں'' کی چھپی ہوئی جھلی اور ''سینہ پر ہاتھ باندھنے'' کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔'' (حوالہ مذکورہ، ص 18، 19)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں ہر جگہ اس کے الفاظ کے صرف معروف معنی ہی لیے جا سکتے ہیں اور ان سے ہٹ کر ان کی کوئی تاویل قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

حالاں کہ اہل علم جانتے ہیں کہ بعض اوقات قرآنی الفاظ کے معروف معنی کے سوا اس کے مجازی معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ جیسے یقین کے معروف معنی یقین ہی کے ہیں مگر یہ مجازی طور پر ''موت'' کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غامدی صاحب اپنے اس خود ساختہ اُصول کی خود خلاف ورزی کرتے ہیں اور ہر جگہ قرآنی الفاظ کے معروف معنی مراد نہیں لیتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اُلٹی تفسیر ''البیان'' (میں اسے اُلٹی تفسیر اس لیے کہتا ہوں کہ یہ آخری سورتوں سے ہوتی ہوئی اُلٹے رُخ پر پیچھے کو آ رہی ہے اور ابھی تک اس کی ایک جلد شائع ہوئی ہے جو سورۃ الملک سے سورۃ الناس تک ہے اور باقی تفسیر ابھی نامکمل ہے) میں درج ذیل مقامات پر قرآنی الفاظ کے معروف معنی مراد نہ لے کر اپنے بنائے ہوئے اُصول کو خود پامال کیا ہے۔

1۔ **پہلی مثال** سورۃ اللھب کے الفاظ ﴿ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ ﴾ کا ترجمہ غامدی صاحب نے یوں کیا ہے کہ:

''ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے۔'' (البیان، ص 260)

اب یہ فیصلہ کرنا اہل علم کا کام ہے کہ لفظ ''یدا'' کے معروف معنی ''بازو'' کے ہیں یا ''دونوں ہاتھ'' کے۔

2۔ **دوسری مثال** سورۃ العلق کی پہلی آیت ﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ﴾ کا ترجمہ غامدی صاحب نے یوں کیا ہے کہ:

''انہیں پڑھ کر سناؤ (اے پیغمبرؐ) اپنے اُس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے۔'' (البیان، ص 207)

اب یہ فیصلہ کرنا اہل علم کا کام ہے کہ عربی زبان میں لفظ اقرأ (بغیر علیٰ کے صلہ) کے معروف معنی ''پڑھ'' کے ہیں یا ''انہیں پڑھ کر سناؤ'' کے ہیں۔

3۔ **تیسری مثال** اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ﴾ (الملک: 24)

اس کا ترجمہ غامدی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:

''ان سے کہہ دو، وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں بویا۔'' (البیان، ص:25،26)

اب قارئین خود دیکھ سکتے ہیں کہ ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ میں ذَرَأَ (ذال کے ساتھ) کے معروف معنیٰ ''بونے'' کے ہیں یا ''پھیلانے'' کے۔

4۔ **چوتھی مثال** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿كَلَّا بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْآخِرَةَ﴾ (المدثر: 53)

اس آیت کا ترجمہ غامدی صاحب نے یوں کیا ہے کہ:

''بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) یہ قیامت کی توقع نہیں رکھتے۔'' (البیان، ص81)

اب یہ فیصلہ کرنا اہل علم کا کام ہے کہ آیت کے لفظ "يَخَافُوْنَ" کی قطعی دلالت اور اس کے معروف معنیٰ بقول غامدی صاحب ''توقع رکھنے'' کے ہیں یا اس لفظ کے معروف معنی ''خوف رکھنا یا ڈرنا'' کے ہیں۔

5۔ **پانچویں مثال** سورۃ الاعلیٰ میں آیت 4،5 میں ہے:

﴿وَالَّذِيْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰىo فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰىo﴾

اس کا ترجمہ غامدی صاحب نے یہ کیا ہے:

''اور جس نے سبزہ نکالا، پھر اُسے گھنا سرسبز وشاداب بنا دیا۔''

اہل علم جانتے ہیں کہ غُثَآءً اَحْوٰى کے معروف معنیٰ ''سیاہ کوڑا کرکٹ'' کے ہیں نہ کہ ''گھنا سرسبز وشاداب'' کے۔

6۔ **چھٹی مثال** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْo﴾ (المدثر: 4)

اس کا ترجمہ غامدی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:

''اور اپنے دامن دل کو پاک رکھو۔''

اب یہ اہل علم کا کام ہے کہ وہ یہ بتائیں کہ "ثِيَابَ" کے معروف معنیٰ ''کپڑے'' کے ہیں یا ''دامن دل'' کے۔ یہ چند مثالیں ہیں جن میں غامدی صاحب نے اپنے اس اُصول کو

توڑا ہے کہ قرآنی الفاظ کے صرف معروف معنی ہی لیے جا سکتے ہیں۔

19۔ تکفیر کے مسئلے میں تضاد

غامدی صاحب کے ہاں تکفیر کے مسئلے پر بھی تضاد موجود ہے۔ وہ خود دوسروں کی تکفیر کرتے ہیں مگر کسی اور کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ کسی دوسرے کی تکفیر کر سکے اور اُسے کافر قرار دے سکے۔

چنانچہ ایک سوال کے جواب میں غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے...... یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں۔''

(ماہنامہ اشراق، دسمبر 2000ء ص 54، 55)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کی رائے میں کوئی غیر نبی شخص کسی اور آدمی کی تکفیر نہیں کر سکتا اور اُسے کافر قرار نہیں دے سکتا۔

غامدی صاحب کی یہ رائے بالکل بے اصل اور غلط ہے۔ خلفائے راشدین سے لے کر آج تک اُن لوگوں کی تکفیر کی گئی ہے جو ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتے رہے ہیں۔ خود سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں مدعیانِ نبوت اور مانعین زکوٰۃ کو کافر قرار دے کر اُن کے خلاف تلوار سے جہاد کیا تھا۔ ماضی قریب میں اُمت مسلمہ نے جھوٹے مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی (ملعون) اور اُس کے پیروکاروں کو کافر قرار دیا تھا۔ پاکستان کے قریباً ایک ہزار علماء نے غلام احمد پرویز کو کافر قرار دیا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے غامدی صاحب نے اپنے گمراہ کن عقائد و نظریات کے پیش نظر خود تکفیر کی زد سے بچنے کے لیے تکفیر کا انکار کیا ہے۔

لیکن ہمیں اس پر تعجب آتا ہے کہ وہ خود تو تکفیر کی زد سے بچنے کے لیے حیلے بہانے تراش رہے ہیں مگر دوسروں کو تکفیر کا نشانہ بناتے ہوئے ذرا نہیں شرماتے۔ اُن کی اپنی تحریروں کی رُو سے شمالی افریقہ کے کروڑوں مسلمان غیر مسلم قرار پاتے ہیں اور اُمت مسلمہ کے تمام صوفیائے کرام کافر ٹھہرتے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تصوف کے بارے میں غامدی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ اسلام کے متوازی ایک دین ہے اور جب تصوف اسلام کے متوازی ایک دین ہے تو لامحالہ وہ اسلام سے الگ کوئی دین ہے اور جب کوئی شخص اسلام سے الگ اُسے اپنا دین بنائے گا تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ اس طرح غامدی صاحب نے بالواسطہ طور پر اُمت مسلمہ کے تمام صوفیائے کرام کی تکفیر کر کے اُن کو کافر ٹھہرایا ہے۔

چنانچہ تصوف کے بارے میں غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''تصوف فی الواقع ایک متوازی دین ہے۔'' (برہان، ص188، طبع جون 2006ء)

غامدی صاحب کی دوسری تحریریں جن کی رُو سے شمالی افریقہ (لیبیا، ٹیونس، الجزائر، مراکش اور صومالیہ وغیرہ) کے تمام مسلمان غیر مسلم قرار پاتے ہیں، وہ یہ ہیں:

1۔ ''قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔''

(میزان، ص25، 26 طبع دوم اپریل 2002ء)

2۔ ''یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قراءت ہے ...... اس کے علاوہ سب قراءتیں...... فتنہ عجم کے باقیات ہیں۔'' (میزان، ص32، طبع دوم، اپریل 2002ء)

کیا غامدی صاحب کی ان تحریروں کی رُو سے شمالی افریقہ (لیبیا، ٹیونس، الجزائر، مراکش اور صومالیہ وغیرہ) کے کروڑوں مسلمان غیر مسلم قرار نہیں پاتے؟ جی ہاں، غامدی صاحب نے ایک ہی تکفیری لاٹھی سے ان سب کو کافر قرار دے دیا ہے۔ کیونکہ شمالی افریقہ کے لوگ ''قراءت حفص'' نہیں بلکہ ''قراءت ورش'' کے مطابق قرآن پڑھتے ہیں اور جب ''قراءت حفص'' کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے تو لامحالہ شمالی افریقہ کے تمام مسلمان قرآن سے محروم ہیں اور غیر قرآن کو قرآن سمجھے

ہوئے ہیں اور جب وہ غیر قرآن کو قرآن سمجھے ہوئے ہیں تو قرآن کے منکر ٹھہرے کیونکہ جو قرآن کا منکر ہو جائے وہ ضرور کافر ہو جاتا ہے۔

غامدی صاحب کے نشترِ تکفیر کی زد صرف یہیں تک نہیں ہے بلکہ دنیا بھر میں جو اربوں مسلمان ''قراءت حفص'' کے علاوہ دوسری قراءتوں کو بھی قرآن سمجھتے ہوئے اُن کو پڑھ یا پڑھا رہے ہیں وہ سب مسلمان بھی بیک قلم غیر مسلم ٹھہرتے ہیں۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب ایک طرف تو تکفیر کو ناجائز سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اسے جائز قرار دے رہے ہیں اور یہ اُن کے ہاں کھلا تضاد پایا جاتا ہے۔



باب 10:

متفقہ اسلامی عقائد واعمال سے تقابل

جاوید غامدی صاحب کے عقائد ونظریات اُمت مسلمہ اور علمائے اسلام کے متفقہ اور اجماعی عقائد واعمال سے بالکل الگ اور مختلف ہیں۔ انہوں نے ''سبیل المؤمنین'' کو چھوڑ کر اُس ''غیر سبیل المؤمنین'' کو اختیار کر لیا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۟﴾

(النساء: 115)

''جو شخص رسولؐ کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کا رستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے گا حالاں کہ اس پر صحیح راستہ واضح ہو چکا ہو تو اسے ہم اُسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور پھر اسے جہنم میں داخل کریں گے جو بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

ذیل میں علمائے اسلام اور غامدی صاحب کے عقائد ونظریات کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس کے بعد ہر شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون راہِ حق پر ہے اور کون گمراہ ہے؟

غامدی صاحب کے عقائد ونظریات	متفقہ اسلامی عقائد واعمال
1۔ جو شخص صرف خدا اور آخرت پر یقین رکھتا ہو، خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی یا کوئی اور مذہب کا ماننے والا ہو، وہ نجات پاسکتا ہے اور جنت میں جا سکتا ہے۔	1۔ کوئی شخص مکمل ایمان یعنی اللہ پر، فرشتوں پر، نبیوں پر، کتابوں پر، آخرت پر اور اچھی بری تقدیر کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لائے بغیر نہ تو نجات پاسکتا ہے

	اور نہ جنت میں جا سکتا ہے۔
2۔ توریت، زبور اور انجیل آج بھی خدا کی کتابیں ہیں۔	2۔ توریت، زبور اور انجیل اللہ تعالیٰ کی کتابیں تھیں مگر وہ محفوظ نہ رہ سکیں اور قرآن کے نازل ہونے کے بعد وہ سب منسوخ ہو گئیں۔
3۔ دین کے مصادر قرآن کے علاوہ دین فطرت کے حقائق، سنت ابراہیمی اور قدیم صحائف بھی ہیں۔	3۔ دین وشریعت کے مصادر وماخذ قرآن، سنت، اجماع اور قیاس (اجتہاد) ہیں۔
4۔ معروف اور منکر کا تعین انسانی فطرت کرتی ہے۔	4۔ معروف ومنکر کا تعین وحی الٰہی سے ہوتا ہے۔
5۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔	5۔ جو شخص دین کے بنیادی امور یعنی ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے تو اسے کافر قرر دیا جا سکتا ہے۔
6۔ قرآن کی صرف ایک ہی قراءت درست ہے، باقی سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں۔	6۔ قرآنِ مجید کی سات یا دس (سبعہ یا عشرہ) قراءتیں متواتر اور صحیح ہیں۔
7۔ قرآن کا ایک نام میزان بھی ہے۔	7۔ میزان، قرآن کے ناموں میں سے کوئی نام نہیں ہے۔
8۔ قرآن کی متشابہ آیات کا بھی ایک واضح اور قطعی مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔	8۔ قرآن کی متشابہ آیات کا واضح اور قطعی مفہوم متعین نہیں کیا جا سکتا۔
9۔ سورۂ نصر مکی ہے۔	9۔ سورۂ نصر مدنی ہے۔

10۔ قرآن میں اصحاب الاخدود سے مراد دورِ نبویؐ کے قریش کے فراعنہ ہیں۔	10۔ اصحاب الاخدود کا واقعہ بعثت نبویؐ سے بہت پہلے زمانے کا ہے۔
11۔ سورۂ لہب میں ابولہب سے مراد قریش کے سردار ہیں۔	11۔ ابولہب سے نبی ﷺ کا کافر چچا مراد ہے۔
12۔ اصحاب الفیل کو پرندوں نے ہلاک نہیں کیا تھا بلکہ وہ قریش کے پتھراؤ اور آندھی سے ہلاک ہوئے تھے۔ پرندے صرف ان کی لاشوں کو کھانے کے لیے آئے تھے۔	12۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل پر ایسے پرندے بھیجے جنھوں نے اُن کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیا تھا۔
13۔ سنت قرآن سے مقدم ہے۔	13۔ قرآن سنت پر مقدم ہے۔
14۔ سنت صرف افعال کا نام ہے۔ اس کی ابتدا حضرت محمد ﷺ سے نہیں، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوتی ہے۔	14۔ سنت میں نبی ﷺ کے اقوال، افعال اور تقریرات (خاموش تائیدیں) سب شامل ہیں اور وہ حضرت محمد ﷺ سے شروع ہوتی ہے۔
15۔ سنت صرف ستائیس (27) اعمال کا نام ہے۔	15۔ سنتیں ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔
16۔ ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔ ان دونوں کا ثبوت اجماع اور عملی تواتر سے ہوتا ہے۔	16۔ ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن میں واضح فرق ہے۔ سنت کے ثبوت کے لیے اجماع شرط نہیں۔
17۔ حدیث سے کوئی اسلامی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔	17۔ حدیث سے بھی اسلامی عقائد اور اعمال ثابت ہوتے ہیں۔

18۔ حضورؐ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے بھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔	18۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے بہت اہتمام کیا تھا۔
19۔ ابن شہاب زہریؒ کی کوئی روایت بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ وہ ناقابل اعتبار راوی ہے۔	19۔ امام ابن شہاب زہریؒ روایتِ حدیث میں ثقہ اور معتبر راوی ہیں اور ان کی روایات قابل قبول ہیں۔
20۔ تیمّم کا حکم پہلی امتوں میں بھی تھا۔	20۔ تیمّم کا حکم صرف امت مسلمہ کے ساتھ خاص ہے۔
21۔ عورت بھی مردوں کی امامت کر سکتی ہے۔	21۔ عورت مردوں کی امام نہیں ہو سکتی۔
22۔ نماز کا کچھ حصہ غیر عربی زبان میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔	22۔ پوری نماز صرف عربی زبان میں ادا ہو سکتی ہے۔
23۔ عورتیں بھی باجماعت نماز میں امام کی غلطی پر بلند آواز سے ''سبحان اللہ'' کہہ سکتی ہیں۔	23۔ امام کی غلطی پر عورتوں کے لیے بلند آواز میں ''سبحان اللہ'' کہنا جائز نہیں ہے۔
24۔ شہید کی میت کو غسل دینا سنت ہے۔	24۔ شہید کی میت کو غسل دینا جائز نہیں۔
25۔ زکوٰۃ کا نصاب منصوص اور مقرر نہیں ہے۔	25۔ زکوٰۃ کا نصاب منصوص اور مقرر شدہ ہے۔
26۔ ریاست کسی بھی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر سکتی ہے۔	26۔ اسلامی ریاست کسی چیز یا شخص کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں کر سکتی۔
27۔ بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔	27۔ بنو ہاشم کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں۔

28۔ اسلامی ریاست نماز اور زکوٰۃ کے سوا کسی اور دینی حکم کے نفاذ کے لیے قانون کی طاقت استعمال نہیں کرسکتی۔	28۔ اسلامی ریاست تمام دینی احکام کے لیے پہلے اخلاقی طور پر اور پھر قانونی طاقت سے کام لے سکتی ہے
29۔ زکوٰۃ کی ایک مد العاملین علیہا بھی ہے جس سے مراد تمام سرکاری ملازمین ہیں۔	29۔ 'العاملین علیہا' کا مصرف صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے کام پر مامور ہوتے ہیں۔
30۔ حج اور عمرے میں سعی ضروری نہیں اس کے بغیر بھی حج اور عمرہ ہوسکتا ہے۔	30۔ سعی واجب (یا فرض) ہے اس کے بغیر حج یا عمرہ نہیں ہوتا۔
31۔طواف وداع ضروری نہیں ہے۔	31۔طواف وداع واجب ہے۔
32۔ قرآن کی رو سے کوئی شخص دو ایسی عورتوں کو بیک وقت اپنے نکاح میں نہیں رکھ سکتا جو آپس میں پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی ہوں۔	32۔ سنت کی رو سے یہ حکم ہے کہ کوئی شخص ایسی دو عورتوں کو اپنے نکاح میں جمع نہیں رکھ سکتا جو آپس میں پھوپھی بھتیجی یا خالہ بھانجی ہوں۔
33۔ قرآن کی رو سے بیوہ کو ایک سال تک نان ونفقہ دینا ضروری ہے۔	33۔ قرآن کا یہ حکم وراثت کے احکام نازل ہونے کے بعد منسوخ ہو چکا ہے۔
34۔ کلالہ سے مراد کسی شخص کے وہ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ اس کا تعلق اولاد اور والد کا نہ ہو۔	34۔ وراثت میں کلالہ وہ شخص ہے جس کی اولاد میں کوئی نہ ہو نیچے تک اور والدین میں کوئی نہ ہو اوپر تک، گویا جس کے نہ فروع ہوں اور نہ اصول۔
35۔اسلام میں موت کی سزا صرف دو جرائم (قتل نفس اور فساد فی الارض) پر دی	35۔اسلامی شریعت میں موت کی سزا بہت سے جرائم پر دی جاسکتی ہے۔

جاسکتی ہے۔	
36۔دیت کا قانون وقتی اور عارضی تھا۔	36۔دیت کا حکم اور قانون ہمیشہ کے لیے ہے۔
37۔قتل خطاء میں دیت کی مقدار تبدیل ہوسکتی ہے۔	37۔قتل خطاء میں دیت کی مقدار تبدیل نہیں ہوسکتی۔
38۔عورت اور مرد کی دیت برابر ہے۔	38۔عورت کی دیت، مرد کی دیت سے آدھی ہے۔
39۔ اب مرتد کی سزائے قتل باقی نہیں ہے۔	39۔ اسلام میں مرتد کے لیے قتل کی سزا ہمیشہ کے لیے ہے۔
40۔ زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ دونوں کی سزا صرف سو کوڑے ہیں۔	40۔ شادی شدہ زانی کی سزا از روئے سنت سنگساری ہے۔
41۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا قرآن سے ثابت ہے۔	41۔ چور کا دایاں ہاتھ کاٹنا صرف سنت سے ثابت ہے۔
42۔ شراب نوشی پر کوئی شرعی سزا نہیں ہے۔	42۔شراب نوشی کی شرعی سزا ہے جو اجماع کی رو سے اسّی کوڑے مقرر ہیں۔
43۔عورت کی گواہی حدود کے جرائم میں بھی معتبر ہے۔	43۔ حدود کے جرائم میں عورت کی شہادت معتبر نہیں۔
44۔ صرف عہد نبوی کے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے وارث نہیں ہوسکتے۔	44۔ کوئی کافر کسی مسلمان کا کبھی وارث نہیں ہوسکتا۔
45۔ اگر میت کی اولاد میں صرف بیٹیاں	45۔ میت کی اولاد میں صرف بیٹیاں ہی

وارث ہوں تو اُن کو والدین یا بیوی شوہر کے حصوں سے بچے ہوئے ترکے کا دوتہائی (2/3) حصہ ملے گا۔	ہوں تو ان کو کل ترکے کا دو تہائی (2/3) حصہ دیا جائے گا۔
46۔ سؤر کی کھال اور چربی وغیرہ کی تجارت اوران کا استعمال ممنوع نہیں۔	46۔ سؤر نجس العین ہے، لہٰذا اس کی کھال اور دوسرے اجزاء کا استعمال اور تجارت حرام ہے۔
47۔ عورت کے لیے دوپٹا پہننا شرعی حکم نہیں۔	47۔ عورت کے لیے دوپٹہ اور اوڑھنی پہننے کا حکم قرآن کی سورۃ النور آیت 31 سے ثابت ہے۔
48۔ کھانے کی صرف چار (4) چیزیں ہی حرام ہیں: خون، مردار، سؤر کا گوشت اور غیراللہ کے نام کا ذبیحہ۔	48۔ ان کے علاوہ کھانے کی بہت سی اور چیزیں بھی حرام ہیں جیسے کتے اور پالتو گدھے کا گوشت وغیرہ۔
49۔ کئی انبیاء قتل ہوئے مگر کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔	49۔ ازروئے قرآن بہت سے نبیوں اور رسولوں دونوں کو قتل کیا گیا۔
50۔ عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔	50۔ حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ اٹھا لیے گئے۔ وہ قیامت کے قریب دوبارہ دنیا میں آئیں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔
51۔ یاجوج ماجوج اور دجال سے مراد مغربی اقوام ہیں۔	51۔ یاجوج ماجوج اور دجال قربِ قیامت کی دو الگ الگ نشانیاں ہیں۔ احادیث کی رُو سے دجال ایک یہودی شخص ہوگا جو دائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔

52۔ جہاد و قتال کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔	52۔ جہاد وقتال ایک شرعی فریضہ ہے۔
53۔ کافروں کے خلاف جہاد کرنے کا حکم اب باقی نہیں رہا اور اب مفتوح کافروں سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔	53۔ کفار کے خلاف جہاد کا حکم ہمیشہ کے لیے ہے اور مفتوح کفار (ذمیوں) سے جزیہ لیا جا سکتا ہے۔
54۔ مفتوح کفار (ذمیوں) سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا۔	54۔ مفتوح کفار (ذمیوں) سے جزیہ لیا جا سکتا ہے۔
55۔ مالِ غنیمت پر مجاہدین کا کوئی ابدی حق نہیں ہے یہ اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔	55۔ مالِ غنیمت کا 4/5 حصہ مجاہدین کا حق ہے جو ان میں تقسیم کیا جائے گا؟

غامدی صاحب کے مذکورہ گمراہ کن عقائد ونظریات کے بارے میں ان کی تحریروں کے حوالہ جات:

1۔ مصعب سکول سسٹم لاہور سالانہ مجلّہ 'مصعبی' کے لیے دیئے گئے انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے غامدی صاحب نے کہا:

''انٹرویو نگار کا سوال: کیا جنت میں صرف مسلمان ہی جائیں گے یا کوئی نیک غیر مسلم بھی جنت میں جا سکتا ہے؟ غامدی صاحب کا جواب:

جنت میں جانے کا معیار قرآن میں بیان ہے، خدا اور آخرت پر یقین، اچھے اعمال کرنا اور جرائم سے دور رہنا۔ خواہ اب وہ مسلمان ہو، یہودی ہو، یا کسی بھی مذہب کو ماننے والا جنت کا حق دار ہے۔''

(سالانہ مجلّہ 'مصعبی' سال 2008۔2009ء، ص ۱۵، لاہور)

2۔ ''یہ سب کتابیں (توریت، زبور اور انجیل) خدا کی کتابیں ہیں۔''

(میزان، ص 151، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

3۔ ”قرآن کی دعوت اس کے پیش نظر جن مقدمات سے شروع ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:
(1) دین فطرت کے حقائق (2) سنت ابراہیمی (3) نبیوں کے صحائف۔“

(میزان، طبع دوم، ص 48، مطبوعہ اپریل 2002ء)

4۔ ”معروف ومنکر“...... وہ باتیں (ہیں) جو انسانی فطرت میں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور وہ جن سے فطرت ابا کرتی اور انہیں برا سمجھتی ہے...... انسان ابتداءی سے معروف ومنکر، دونوں کو پورے شعور کے ساتھ بالکل الگ الگ پہچانتا ہے۔“

(میزان، ص 49، طبع دوم، اپریل 2002ء)

5۔ ......”کسی کو کافر قرار دینا ایک قانونی معاملہ ہے۔ پیغمبر اپنے الہامی علم کی بنیاد پر کسی گروہ کی تکفیر کرتا ہے...... یہ حیثیت اب کسی کو حاصل نہیں۔“

(ماہنامہ اشراق، دسمبر 2000ء، ص 54، 55)

6۔ ......(ا) قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے اس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔“

(میزان، ص 25، 26، طبع دوم، اپریل 2002ء لاہور)

(ب)”یہ بالکل قطعی ہے کہ قرآن کی ایک ہی قراءت ہے...... اس کے علاوہ سب قراءتیں...... فتنہ عجم کے باقیات ہیں۔“ (میزان، ص 32، طبع دوم، اپریل 2002ء)

7۔ ......(ا)”قرآن...... میزان...... ہے۔“ (برہان، ص 140)

(ب) ﴿اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ﴾ (الشوریٰ: 17)

”اللہ وہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری، یعنی میزان نازل کی ہے۔“

اس آیت میں ”وَالْمِیْزَانَ“ سے پہلے ”و“ تفسیر کے لیے ہے۔ اس لیے

"المیزان" درحقیقت یہاں "الکتاب" ہی کا بیان ہے۔

(میزان،ص22،طبع دوم،اپریل2002ء)

8۔ ......"یہ بات ہی صحیح نہیں ہے کہ محکم اور متشابہ کو ہم پورے یقین کے ساتھ ایک دوسرے سے ممیز نہیں کر سکتے یا متشابہات کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں......لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ متشابہات کا مفہوم سمجھنا ممکن نہیں ہے۔"

(میزان،ص34،35،طبع دوم،اپریل2002ء)

9۔ ......"سورۂ کافرون کے بعد اور لہب سے پہلے اس سورہ (النصر) کے مقام سے واضح ہے کہ سورۂ کوثر کی طرح یہ بھی، اُمّ القریٰ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے مرحلۂ ہجرت و براءت میں آپ کے لیے ایک عظیم بشارت کی حیثیت سے نازل ہوئی ہے۔"

(البیان،ص252،مطبوعہ ستمبر1998ء)

10۔ ......"یہ ﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ٥ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ٥ ﴾ (البروج: 4۔5) قریش کے اُن فراعنہ کو جہنم کی وعید ہے جو مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنے کے لیے ظلم وستم کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ اُنھیں بتایا گیا ہے کہ وہ اگر اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو دوزخ کی اُس گھاٹی میں پھینک دیے جائیں گے جو ایندھن سے بھری ہوئی ہے۔"

(البیان،ص157،طبع ستمبر1998ء)

11۔ ...... ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾

"ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے اور وہ خود بھی ہلاک ہوا۔" (تفسیر) "بازو ٹوٹ گئے" یعنی اُس کے اعوان و انصار ہلاک ہوئے اور اس کی سیاسی قوت ختم ہوگئی۔"

(البیان،ص260،مطبوعہ ستمبر1998ء)

12۔ ......"اللہ تعالیٰ نے سافِ و حاصب کے طوفان سے اُنھیں (اصحاب الفیل کو) اس طرح پامال کیا کہ کوئی اُن کی لاشیں اٹھانے والا نہ رہا۔ وہ میدان میں پڑی تھیں اور

گوشت خوار پرندے اُنھیں نوچنے اور کھانے کے لیے، اُن پر جھپٹ رہے تھے......
آیت کا مدعا یہ ہے کہ تمھاری (قریش کی) مدافعت اگرچہ ایسی کمزور تھی کہ تم پہاڑوں میں چھپے ہوئے، اُنھیں کنکر پتھر مار رہے تھے، لیکن جب تم نے حوصلہ کیا اور جو کچھ تم کرسکتے تھے، کر ڈالا، تو اللہ نے اپنی سنت کے مطابق تمھاری مدد کی اور ساف و حاصب کا طوفان بھیج کر اپنی ایسی شان دکھائی کہ اُنھیں کھایا ہوا بھوسا بنا دیا۔"

(البیان، تفسیر سورۂ الفیل، ص: 240، 241)

13۔ ......"سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔"

(میزان، ص 52، طبع دوم، اپریل 2002ء)

14۔ ...... (ا) "سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں ......علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں۔"

(میزان، ص 65، طبع دوم، اپریل 2002ء)

(ب) "سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔"

(میزان، ص 10، طبع دوم، اپریل 2002ء لاہور)

15۔ ......اس (سنت) کے ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے، وہ یہ ہے:
(۱) "اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا، (۲) ملاقات کے موقع پر "السلام علیکم" اور اس کا جواب، (۳) چھینک آنے پر "الحمد للہ" اور اس کے جواب میں "یرحمک اللہ"، (۴) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت، (۵) مونچھیں پست رکھنا، (۶) زیر ناف کے بال مونڈنا، (۷) بغل کے بال صاف کرنا، (۸) لڑکوں کا ختنہ کرنا، (۹) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا، (۱۰) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی، (۱۱) استنجا، (۱۲) حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب،

(۱۳) حیض و نفاس کے بعد غسل، (۱۴) غسل جنابت، (۱۵) میت کا غسل، (۱۶) تجہیز و تکفین، (۱۷) تدفین، (۱۸) عیدالفطر، (۱۹) عیدالاضحیٰ، (۲۰) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ، (۲۱) نکاح وطلاق اور اس کے متعلقات، (۲۲) زکوٰۃ اور اس کے متعلقات، (۲۳) نماز اور اس کے متعلقات، (۲۴) روزہ اور صدقۂ فطر، (۲۵) اعتکاف، (۲۶) قربانی اور (۲۷) حج وعمرہ اوران کے متعلقات۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآنِ مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

(میزان، ص10، طبع دوم، اپریل، 2002ء، لاہور)

16۔ ......"سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔"

(میزان، ص10، طبع دوم، اپریل 2002ء)

17۔ ......"اس (حدیث) سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔"

(میزان، ص64، طبع دوم، اپریل 2002ء)

18۔ ......"نبی ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم انھیں ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی علم یقین کے درجے تک نہیں پہنچتا۔" (میزان، حصہ دوم، ص68، طبع اپریل 2002ء، لاہور)

19۔ ......"ان (امام ابن شہاب زہریؒ) کی کوئی روایت بھی، بالخصوص اس طرح کے اہم

معاملات میں قابل قبول نہیں ہوسکتی۔'' (میزان، ص31، طبع دوم، اپریل 2002ء)

20۔ وہ اپنی کتاب 'میزان' میں 'نماز کی شرائط' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''سفر، مرض یا پانی کی نایابی کی صورت میں، یہ دونوں (وضو اور غسل) مشکل ہو جائیں تو وہ تیمّم کرلے۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

''نماز کے لیے یہ چیزیں ہمیشہ ضروری رہی ہیں، تاہم عرب کے لوگ چونکہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے بعد صدیوں تک انبیاء علیہم السلام کی ہدایت سے محرومی کے باعث اس طرح کے بعض معاملات میں متنبہ نہیں رہے تھے، اس لیے قرآن نے ان کی تذکیر کے لیے ان میں سے زیادہ تر چیزیں پوری وضاحت کے ساتھ خود بیان کر دی ہیں۔'' (میزان، ص282، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

21۔ ''عورت مردوں کی امامت کرا سکتی ہے۔'' (ماہنامہ اشراق، مئی 2005ء ص35 تا 46)

22۔ ''نماز پڑھنے والا جس زبان میں چاہے، تسبیح وتحمید اور دعا ومناجات کی نوعیت کا کوئی ذکر اپنی نماز میں کر سکتا ہے۔'' ('میزان' ص293، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

23۔ ......''امام غلطی کرے اور اس پر خود متنبہ نہ ہو تو مقتدی اسے متنبہ کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے سنت یہ ہے کہ وہ ''سبحان اللہ'' کہیں گے عورتیں اپنی آواز بلند کرنا پسند نہ کریں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر متنبہ کر دیں۔''

(قانون عبادات، ص84، مطبوعہ اپریل 2005ء)

24۔ (ا) ''میت کا غسل سنت ہے۔'' (میزان، ص14، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

(ب) ''غیر معمولی صورت حال میں اگر میت کا غسل اور اس کی تجہیز وتکفین باعث زحمت ہو جائے تو اسے غسل اور تجہیز وتکفین کے بغیر بھی دفن کیا جا سکتا ہے۔ بخاری (رقم: 1347) میں ہے کہ احد کے شہدا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح دفن کر دینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ ہمارے فقہا نے اسے شہادت کی موت سے متعلق قرار دیا ہے درآں حالیکہ یہ

ایک عام استثنا ہے جو دین میں رخصت کے اسی اصول پر مبنی ہے جو اس کے تمام احکام میں ملحوظ ہے۔" (میزان، ص647، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

26،25۔ "ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، ان کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔" (قانونِ عبادات، ص119، طبع اپریل 2005ء)

27۔ "بنی ہاشم کے فقراء و مساکین کی ضرورتیں بھی زکوٰۃ کے اموال سے اب بغیر کسی تردّد کے پوری کی جا سکتی ہیں۔" (قانونِ عبادات، ص119، طبع اپریل 2005ء)

28۔ "ریاست اپنے مسلمان شہریوں کو کسی جرم کے ارتکاب سے روک سکتی اور اس پر سزا تو دے سکتی ہے لیکن دین کے ایجابی تقاضوں میں سے نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ کسی چیز کو بھی قانون کی طاقت سے لوگوں پر نافذ نہیں کر سکتی۔ وہ مثال کے طور پر...... جہاد و قتال کے لیے جبری بھرتی کا کوئی قانون نافذ نہیں کر سکتی۔"

(میزان، ص492، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

29۔ "'العاملین علیہا' یعنی ریاست کے تمام ملازمین کی خدمات کے معاوضے میں۔"

(میزان، ص351، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

30۔ "قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور 'تطوع' کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔"

(میزان، ص388، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

31۔ "حج کا طواف تو ایک ہی ہے جسے اصطلاح میں طواف افاضہ کہا جاتا ہے، لیکن حج و عمرہ سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کے لیے رخصت ہونے والوں کو رسول اللہ ﷺ نے ہدایت کی ہے کہ جاتے ہوئے بیت اللہ کا طواف کر کے جائیں۔"

(میزان، ص396، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

32۔ "قرآن کے الفاظ "وان تجمعوا بين الاختين" کے بعد یہ الفاظ محذوف ہیں

'وبین المرءة وعمتها وبین المرءة وخالتها'

(میزان، ص38، 416، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

33۔ ''شوہروں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ وہ اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان ونفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی وصیت کر جائیں۔''

(میزان، ص462، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

34۔ ''' کلالۃ سے مراد کسی شخص کے وہ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ اس کا تعلق اولاد اور والد کا نہ ہو۔'' (میزان، ص528، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

35۔ ...... (ا) ''ان دو جرائم (قتل نفس اور فساد فی الارض) کے سوا، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے۔'' (برہان، ص143، طبع چہارم، جون 2006ء)

(ب) ''اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ان دو جرائم (قتل نفس اور فساد فی الارض) کو چھوڑ کر، فرد ہو یا حکومت، یہ حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کی جان کے درپے ہو اور اسے قتل کر ڈالے۔''

(میزان، ص283، طبع دوم، اپریل 2002ء)

36۔ ...... ''چنانچہ اس (قرآن) نے اس (دیت کے) معاملے میں ''معروف'' کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ قرآن کے اس حکم کے مطابق ہر معاشرہ اپنے ہی معروف کا پابند ہے۔ ہمارے معاشرے میں دیت کا کوئی قانون چونکہ پہلے سے موجود نہیں ہے، اس وجہ سے ہمارے ارباب حل وعقد کو اختیار ہے کہ چاہیں تو عرب کے اس دستور کو برقرار رکھیں اور چاہیں تو اس کی کوئی دوسری صورت تجویز کریں۔ وہ جو صورت بھی اختیار کریں گے، معاشرہ اسے قبول کر لیتا ہے تو ہمارے لیے وہی ''معروف'' قرار پائے گی۔'' (برہان، ص18، 19، طبع چہارم، جون 2006ء)

37، 38۔ ''اسلام نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ عورت اور

مرد، غلام اور آزاد اور کافر اور مومن کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھہرائی ہے۔" (برہان، ص 18، طبع چہارم، جون 2006ء)

39۔ ...... "لیکن فقہاء کی یہ رائے (کہ ہر مرتد کی سزا قتل ہے) محل نظر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم (کہ جو شخص اپنا دین تبدیل کرے اُسے قتل کردو) تو بے شک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا، بلکہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآنِ مجید میں اُمیین یا مشرکین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔" (برہان، ص 140، طبع چہارم، جون 2006ء)

40۔ ...... "سورۂ نور میں ...... زنا کے عام مرتکبین کے لیے ایک متعین سزا ہمیشہ کے لیے مقرر کردی گئی ...... زانی مرد ہو یا عورت، اس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اس کی پاداش میں اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔"

(میزان، ص 299، 300، طبع دوم، اپریل 2002ء)

41۔ ...... "قطع ید کی یہ سزا ﴿ جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ﴾ ہے۔ لہٰذا مجرم کو دوسروں کے لیے عبرت بنا دینے میں عمل اور پاداش عمل کی مناسبت جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اسی طرح یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ ہی کاٹا جائے۔" (میزان، ص 306، 307، طبع دوم، اپریل 2006ء)

42۔ ......(ل) "یہ بالکل قطعی ہے کہ حضور ﷺ نے اگر شراب نوشی کے مجرموں کو پٹوایا تو شارع کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مسلمانوں کے حکمران کی حیثیت سے پٹوایا اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء نے بھی ان کے لیے چالیس کوڑے اور اسّی کوڑے کی یہ سزائیں اسی حیثیت سے مقرر کی ہیں۔ چنانچہ ہم پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یہ کوئی حد نہیں، بلکہ محض تعزیر ہے جسے مسلمانوں کا نظم اجتماعی، اگر چاہے تو برقرار رکھ سکتا ہے اور چاہے تو اپنے حالات کے لحاظ سے اس میں تغیر و تبدل کر سکتا ہے۔"

(برہان، ص 139، طبع چہارم، جون 2006ء)

(ب) ''یہ (شراب نوشی پر اسّی کوڑوں کی سزا) شریعت ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

(برہان، ص 138، طبع چہارم، جون 2006ء)

43۔ ...... ''حدود کے جرائم ہوں یا ان کے علاوہ کسی جرم کی شہادت، ہمارے نزدیک یہ قاضی کی صوابدید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا ہے اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا۔ اس میں عورت اور مرد کی تخصیص نہیں ہے۔''

(برہان، ص 27، طبع چہارم، جون 2006ء)

44۔ ...... ''نبی ﷺ نے اسی (قرابت نافعہ) کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ کے بارے میں فرمایا: ((لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ.)) بخاری، رقم: 6764. ''نہ مسلمان ان میں سے کسی کافر کے وارث ہوں گے اور نہ یہ کافر کسی مسلمان کے۔'' یعنی اِتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آگئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے۔''

(میزان، ص 171، طبع دوم، اپریل 2002ء لاہور)

45۔ ...... (ا) ''اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بچے ہوئے ترکے کا دوتہائی دیا جائے گا۔'' (میزان حصہ اوّل، ص 70، طبع مئی 1985ء)

(ب) ''وہ سب (والدین اور زوجین کے حصے) لازماً پہلے دیے جائیں گے اور اس کے بعد جو کچھ بچے گا، صرف وہی اولاد میں تقسیم ہوگا۔ لڑکے اگر تنہا ہوں تو اُنھیں بھی یہی ملے گا اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے لیے بھی یہی قاعدہ ہوگا۔ اسی طرح میت کی اولاد میں اگر تنہا لڑکیاں ہی ہوں تو اُنھیں بھی اس بچے ہوئے ترکے ہی کا دوتہائی یا آدھا دیا جائے گا، ان کے حصے پورے ترکے میں سے کسی حال میں ادا نہ ہوں گے۔'' (میزان، ص 168، طبع اپریل 2002ء)

46۔ ...... (ا) ''اُن علاقوں میں جہاں سؤر کا گوشت بطورِ خوراک استعمال نہیں کیا جاتا، وہاں اس کی کھال اور دوسرے جسمانی اجزاء کو تجارت اور دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممنوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' (ماہنامہ اشراق، شمارہ اکتوبر 1998ء، ص 79)

(ب) ''یہ سب چیزیں (خون، مردار، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ) جس طرح کہ قرآن کی ان آیات سے واضح ہے، صرف خورد و نوش کے لیے حرام ہیں۔ رہے ان کے دوسرے استعمالات تو وہ بالکل جائز ہیں۔''

(میزان، ص 320، طبع دوم، اپریل 2002ء)

47۔ ...... ''دوپٹہ ہمارے ہاں مسلمانوں کی تہذیبی روایت ہے، اس بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ دوپٹے کو اس لحاظ سے پیش کرنا کہ یہ شرعی حکم ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔'' (ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی 2002ء، ص 47)

48۔ ...... ''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے اسے (انسان کو) بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں۔ قرآن نے بعض جگہ: ﴿ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْمَا اُوْحِیَ اِلَیَّ ﴾ اور بعض جگہ ﴿ اِنَّمَا ﴾ کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔'' (میزان، ص 311، طبع اپریل 2002ء)

49۔ ...... ''اللہ تعالیٰ ان (رسولوں) کو کسی حال میں ان کی تکذیب کرنے والوں کے حوالے نہیں کرتا۔ نبیوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی تکذیب ہی نہیں کرتی، بارہا ان کے قتل کے درپے ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہو جاتی ہے...... لیکن قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے معاملے میں اللہ کا قانون مختلف ہے۔'' (میزان، حصہ اوّل، ص 21، مطبوعہ 1985ء)

50۔ ...... (ا) ''حضرت مسیح علیہ السلام کو یہود نے صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تو فرشتوں

نے اُن کی روح ہی قبض نہیں کی، اُن کا جسم بھی اُٹھا لے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے۔'' (میزان حصہ اوّل، ص 22، مطبوعہ 1985ء)

(ب) مسیح علیہ السلام کو جسم و روح کے ساتھ قبض کر لینے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا: جب اللہ نے کہا، اے عیسیٰ، میں تجھے قبض کر لینے والا ہوں......''

(میزان، حصہ اوّل، صفحہ 23، 24، مطبوعہ 1985ء)

51۔ ......'' ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے قیامت کے قریب یاجوج ماجوج ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یاجوج ماجوج کی اولاد یہ مغربی اقوام، عظیم فریب پر مبنی فکر و فلسفہ کی علم بردار ہیں اور اسی سبب سے نبی کریم ﷺ نے انھیں دجال (عظیم فریب کار) قرار دیا ہے۔ روایات میں دجال کی ایک صفت یہ بھی بیان ہوئی ہے کہ اس کی ایک آنکھ خراب ہوگی۔ یہ بھی درحقیقت مغربی اقوام کی انسان کے روحانی پہلو سے پہلو تہی اور صرف مادی پہلو کی جانب جھکاؤ کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح مغرب کی طرف سے سورج کا طلوع ہونا بھی غالباً مغربی اقوام کے سیاسی عروج ہی کے لیے کنایہ ہے۔''

(ماہنامہ ''اشراق'' شمارہ جنوری 1996ء، ص 61)

52۔ ......'' انھیں (نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کو) قتال کا جو حکم دیا گیا، اس کا تعلق شریعت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ اتمامِ حجت سے ہے۔''

(میزان، ص 264، طبع اپریل 2002ء، لاہور)

54،53۔ ......'' یہ بالکل قطعی ہے کہ منکرین حق (کافروں) کے خلاف جنگ اور اس کے نتیجے میں مفتوحین پر جزیہ عائد کر کے انھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔'' (میزان، ص 270، طبع اپریل 2002ء لاہور)

55۔ (ا) ''زمانۂ جاہلیت کی یہ جنگیں زیادہ تر اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے تحت لڑی گئی تھیں اور ان میں لڑنے والوں کی حیثیت اصلاً آلات و جوارح کی تھی۔ وہ اللہ کے

حکم پر میدان میں اترے اور براہ راست اس کے فرشتوں کی مدد سے فتح یاب ہوئے۔
لہٰذا ان جنگوں کے مال غنیمت پر ان کا کوئی حق اللہ تعالیٰ نے تسلیم نہیں کیا۔''

(ب) اموال غنیمت سے متعلق اس بحث سے واضح ہے کہ یہ اصلاً اجتماعی مقاصد کے لیے خاص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجاہدین کا کوئی ابدی حق ان میں قائم نہیں کیا گیا کہ مسلمانوں کی حکومت اسے ہر حال میں ادا کرنے کی پابند ہو۔ وہ اپنی تمدنی ضرورتوں اور حالات کے لحاظ سے جو طریقہ چاہے، اس معاملے میں اختیار کرسکتی ہے۔''

(حوالہ بالا،ص609)



ضمیمہ 1۔ غامدی صاحب کے چند مزید عقائد ونظریات

(زبانی و تحریری)

1۔ ......عورت نکاح خواں بن سکتی ہے:

غامدی صاحب نے، اس سوال کے جواب میں کہ کیا کوئی عورت نکاح پڑھا سکتی ہے؟ ارشاد فرمایا:

''جی ہاں! بالکل پڑھا سکتی ہے......'' (WWW.gamidi.org)

2۔ ......مرد اور عورتیں برابر کھڑے ہو کر باجماعت یا انفرادی دونوں طرح سے نماز ادا کر سکتے ہیں:

غامدی صاحب کے ایک شاگرد سکالر سے سوال کیا گیا، کیا مرد اور عورت اکٹھے کھڑے ہو کر باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ:

''مرد اور عورت کھڑے ہو کر جماعت یا انفرادی، دونوں طرح سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس سے دونوں کی نماز میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔''

(www.urdu.understanding.islam.org)

3۔ ......اجنبی مردوں کے سامنے عورت بغیر چادر اوڑھے یا بغیر دوپٹہ یا اوڑھنی سر پر لیے آ جا سکتی ہے:

4۔ ......گانا بجانا اور موسیقی جائز ہے:

ماہنامہ ''اشراق'' کے نائب مدیر سید منظور الحسن اپنے مضمون ''اسلام اور موسیقی'' جو جاوید غامدی کے افادات پر مبنی ہے، میں لکھتے ہیں:

''موسیقی انسانی فطرت کا جائز اظہار ہے، اس لیے اس کے مباح ہونے میں

کوئی شبہ نہیں ہے۔"

ماہر فن مغنیہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا گانا سنانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کا گانا سنوایا، سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا حضور کے شانے پر سر رکھ کر بہت دیر تک گانا سنتی اور رقص دیکھتی رہیں۔" (ماہنامہ اشراق، شمارہ مارچ 2004، ص 8، 19)

5۔ ...... جاندار چیزوں کی تصویریں بنانا جائز ہے:

غامدی صاحب کے ادارہ "المورد" کے ریسرچ سکالر جناب محمد رفیق مفتی اپنی کتاب "تصویر کا مسئلہ" میں لکھتے ہیں کہ:

"لیکن فی نفسہٖ تصویر کے بارے میں کسی اعتراض کی کیونکر گنجائش ہو سکتی ہے، جب کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے انہیں جائز رکھا ہو" (تصویر کا مسئلہ، ص 30)

6۔ ...... مردوں کے لیے داڑھی رکھنا دین کی رو سے ضروری نہیں:

غامدی صاحب کے ادارہ "المورد" ہی کے ایک ریسرچ سکالر لکھتے ہیں:

"عام طور پر اہل علم داڑھی رکھنا دینی لحاظ سے ضروری قرار دیتے ہیں، تاہم ہمارے نزدیک داڑھی رکھنے کا حکم دین میں کہیں بیان نہیں ہوا، لہٰذا دین کی رُو سے داڑھی رکھنا ضروری نہیں۔" (www.urdu.understanding.islam.org)

7۔ ...... ہندو مشرک نہیں ہیں:

غامدی صاحب کے ایک شاگرد "کیا ہندو مشرک ہیں؟" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"ہمارے نزدیک مشرک وہ شخص ہے جس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطورِ دین اپنا رکھا ہو۔ چونکہ اب کسی ہندو کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے شرک کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد بھی شرک ہی کو بطورِ دین اپنا رکھا ہے، لہٰذا اسے مشرک نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

(www.urdu.understandign.islam.org)

8۔ ......مسلمان لڑکی کی شادی ہندو لڑکے سے جائز ہے:

حلقہ غامدی کے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:

''ہماری رائے میں غیر مسلم کے ساتھ شادی کو ممنوع یا حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

(www.urdu.understandign.islam.org)

9۔ ......ہم جنس پرستی ایک فطری چیز ہے، اس لیے جائز ہے:

''المورد'' کے انگریزی مجلد ''رینی ساں'' کے شمارہ اگست 2005ء میں اس موضوع پر ایک مکمل مضمون موجود ہے۔

10۔ ......اگر بغیر سود کے قرضہ نہ ملتا ہو تو سود پر قرضہ لے کر گھر بنانا جائز اور حلال ہے:

11۔ ......قیامت کے قریب کوئی امام مہدی نہیں آئے گا:

(بحوالہ ماہنامہ اشراق، جنوری 1996، ص 60)

12۔ ......امریکہ افغانستان اور عرق پر حملہ کرنے میں حق بجانب ہے:

(انٹرویو ''زندگی'')

13۔ ...... اسامہ بن لادن اور ملا عمر دونوں انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں۔ اور ان کا جہاد کا موقف شرعی طور پر درست نہیں:

14۔ ......مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کا نہیں، اس پر صرف یہودیوں کا حق ہے:

(ملاحظہ ہو: اشراق جولائی، اگست 2003، اور اشراق مئی، جون 2004ء)

15۔ ......تصوف اسلام سے الگ ایک متوازی دین ہے:

''تصوف فی الواقع ایک متوازی دین ہے جسے دین خداوندی کی روح اور حقیقت کے نام سے اس اُمت میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

(برہان، ص 188، طبع جون 2006ء)

16۔ ......مسلمانوں کے تمام صوفیاء غیر مسلم ہیں:

غامدی صاحب کے اس فتوے کے بعد کہ

"تصوف فی الواقع ایک متوازی دین ہے۔" (برہان، ص188، طبع جون 2006ء)

اُمت مسلمہ کے تمام صوفیاء کرام دین اسلام سے خارج، کافر اور غیر مسلم قرار پاتے ہیں۔

17۔ ......شمالی افریقی کے مسلم ممالک (مراکش، الجزائر، تیونس، اور لیبیا وغیرہ) کے مسلمان اصلی قرآن مجید کو چھوڑنے کی وجہ سے غیر مسلم ہو چکے ہیں کیونکہ وہ قراءت ورش اختیار کرنے اور قراءت عامہ "قراءت حفص" کو چھوڑنے کے مرتکب ہو کر قرآن کے منکر ہو چکے ہیں لہٰذا وہ سب کافر ہیں:

غامدی صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ:

"قرآن صرف وہی ہے جو مصحف میں ثبت ہے، اور جسے مغرب کے چند علاقوں کو چھوڑ کر دنیا میں اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت اس وقت تلاوت کر رہی ہے۔ یہ تلاوت جس قراءت کے مطابق کی جاتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری قراءت نہ قرآن ہے اور نہ اسے قرآن کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔"

(میزان، ص25، 26، طبع دوم، اپریل 2002ء)

18۔ ......اقامت دین یعنی دین کو قائم کرنے اور دین شریعت کا نفاذ کرنے کا کوئی شرعی حکم موجود نہیں ہے: (برہان، ص147، طبع جون 2006ء)

19۔ ......افغانستان اور عراق میں خودکش حملے جائز نہیں ہیں:

(اشراق، شمارہ اپریل 2003، ص41، 42)



ضمیمہ 2۔ غامدی صاحب سے سو (100) سوالات

جاوید احمد غامدی صاحب کی اصل شخصیت کو جاننے اور اُن کے مخصوص گمراہ کن عقائد و نظریات کو سمجھنے کے لیے ذیل میں ایک معلوماتی سوال نامہ جاری کیا جاتا ہے:

1: شخصیت کے بارے میں

1۔ سنا ہے آپ ککے زئی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ تیس سال کی عمر کے بعد سے عرب قبیلے غامد کی نسبت سے غامدی کیوں کہلاتے ہیں؟ کیا اسلام میں اس طرح اپنا نسب بدل لینا جائز ہے؟

2۔ کیا آپ کی تعلیم صرف بی۔اے ہے؟

3۔ کیا آپ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل اور سند یافتہ ہیں؟

4۔ سنا ہے آپ جماعت اسلامی کے رکن (ممبر) بھی رہے ہیں؟

5۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ نے جماعت کو کیوں چھوڑا؟ یا آپ کو جماعت سے نکال دیا گیا؟

6۔ جماعت سے نکالے جانے کا سبب کیا تھا؟

7۔ کیا مولانا مودودی آپ کی مالی امداد بھی کرتے رہے؟

8۔ کیا کسی امریکی سفیر نے آپ سے کبھی ملاقات کی؟ اگر کوئی ملاقات ہوئی تو یہ کب اور کہاں ہوئی تھی؟

9۔ کیا سابق صدر پرویز مشرف سے بھی آپ کی ملاقات رہی؟

10۔ کیا اُن کے لیے آپ نے ایک تقریر بھی لکھی جو انہوں نے امریکہ میں جا کر جیوش کانگریس کے سامنے پڑھی تھی؟

2۔ قرآن مجید سے متعلق

11۔ آپ نے اپنی کتاب 'البیان' میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کے سات (7) ابواب ہیں، اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

12۔ کیا صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور پہلے دور کے مفسرین میں سے کسی نے قرآن مجید کے سات ابواب ہونے کا ذکر کیا ہے؟

13۔ کیا قرآن کی صرف ایک ہی قراءت (Pronounciation) درست ہے اور باقی کوئی قراءت درست نہیں؟

14۔ اگر ایسا ہے تو جو لوگ دوسری قراءتوں (سبعہ، عشرہ) کو بھی درست مانتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

15۔ کیا قرآن کے متن (Text) اور رسم الخط (Script) میں اس بات کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ایک کے سوا کسی دوسری قراءت کو قبول ہی نہیں کرتا؟

16۔ کیا قرآن کا ایک صفاتی نام ''المیزان'' بھی ہے؟ امت کے کسی معتبر اور مستند مفسر قرآن یا عالم دین کا نام بتایئے جس نے قرآن کا ایک صفاتی نام ''المیزان'' بتایا ہو؟

17۔ کیا سورہ النصر مکی سورہ ہے؟

18۔ کیا کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا؟

19۔ کیا قرآن مجید کے الفاظ کے صرف معروف معنی لینا درست ہے؟

20۔ پھر آپ نے اپنی کتاب ''البیان'' میں بعض قرآنی الفاظ کے ''غیر معروف'' معنی کیوں لیے ہیں جیسے سورۃ اللھب میں تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ۔ اس کے معروف معنی ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے'' کے ہیں مگر آپ نے اس کے معنی ''ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے'' کیوں مراد لیے ہیں۔ اسی طرح سورۃ المدثر آیت 4 میں ''وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ'' کے معروف معنی ہیں ''اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھ۔'' مگر آپ نے اس کے غیر معروف معنی لیے ہیں کہ ''اور اپنے دامن دل کو پاک رکھو''۔ کیا ثِیَابٌ کے

معروف معنی ''کپڑوں'' کے نہیں ہے اور عربی زبان میں ثِیَابٌ کے معنی ''دامن دل'' کے ہرگز نہیں ہوتے۔

21۔ کیا سورۂ الفیل میں اصحابِ فیل کا جو واقعہ مذکور ہے اس کے مطابق ابرہہ کے ہاتھیوں کا لشکر پرندوں کے کنکر برسانے سے تباہ ہوا تھا یا اس کی تباہی کا کوئی اور سبب تھا؟

22۔ کیا سورۂ کوثر میں کوثر سے خانہ کعبہ مراد لیا جاسکتا ہے؟

23۔ قرآن مجید میں ''اصحاب الاخدود'' (کھائیوں والے) کا ذکر آیا ہے۔ کیا اس سے قریش کے سردار مراد ہیں؟

24۔ سورۂ عبس کا شانِ نزول کون سا واقعہ ہے؟

25۔ قرآن مجید کی سورہ الحجر آیت 87 میں ''سبع مثانی'' کا ذکر آیا ہے کیا اس سے سورۂ فاتحہ مراد نہیں ہے؟

26۔ سورۂ الاعلیٰ آیت 5 میں فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی کے الفاظ آئے ہیں ان کا کیا ترجمہ ہے؟

27۔ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 79 میں مقامِ محمود کا ذکر آیا ہے آپ کی رائے میں اس کا کیا مطلب ہے؟

28۔ کیا معراج کا واقعہ بیداری کی حالت میں ہوا تھا یا پھر نبی ﷺ کو وہ سب کچھ خواب میں دکھایا گیا تھا؟

29۔ قرآن مجید کی سورۂ البقرہ آیت 143 میں اُمَّةً وَّسَطًا کے الفاظ آئے ہیں۔ کیا ان سے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت مراد ہے اور بعد کی امت اس میں شامل نہیں۔

30۔ کیا قرآن مجید کے بعض مقامات پر سجدۂ تلاوت واجب ہے؟

31۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے غزوات کے ذریعے کفار کے خلاف جہاد کیا تھا؟ یا یہ جہاد نہیں تھا اور یہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تھا۔

32۔ کیا اب مسلمانوں کے لیے کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم باقی نہیں رہا؟

33۔ کیا اسلام میں صرف دفاعی جہاد جائز ہے اور جارحانہ جہاد جائز نہیں ہے۔

34۔ کیا غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ لینے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے؟

3۔ حدیث و سنت سے متعلق

35۔ کیا سنت قرآن سے مقدم ہے؟

36۔ آپ کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے؟

37۔ سنت کا آغاز حضرت محمد ﷺ سے ہوتا ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔

38۔ کیا قرآن مجید کے ثبوت کی طرح سنت کے ثبوت کے لیے بھی تواتر اور اجماع کی شرط ہے؟

39۔ کیا سنت کا تعلق صرف اعمال سے ہے اور اس میں اقوال شامل نہیں ہیں؟

40۔ آپ نے اپنے ماہنامے ''اشراق'' مئی 1998ء میں پہلے چالیس (40) اعمال کو سنت لکھا اور پھر مئی 2008ء میں آپ نے اپنی کتاب ''میزان'' میں صرف ستائیس (27) اعمال کو سنت قرار دیا۔ کیا وقت کے ساتھ ساتھ سنن میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دس برسوں کے اندر تیرہ (13) سنتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے تو کیا باقی 27 سنتوں کا اگلے بیس (20) سال میں خاتمہ نہیں ہو جائے گا اور ہم ہر قسم کی سنتوں سے چھٹکارا نہیں پالیں گے؟

41۔ آپ کے نزدیک حدیث کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

42۔ کیا حدیث سے دین اسلام کا کوئی حکم، عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔

43۔ کیا ختم نبوت کا عقیدہ صرف حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کیا اذان کا طریقہ اور اُس کے الفاظ حدیث ہی سے ثابت نہیں ہیں اور مرتد کی سزائے قتل حدیث سے ثابت نہیں ہے؟

44۔ کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص یا تحدید نہیں ہو سکتی؟

45۔ کیا حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا؟

46۔ یہ قرآن کا حکم ہے یا یہ حدیث سے ثابت حکم ہے کہ کوئی مرد اپنے نکاح میں بیک وقت

پھوپھی اور بھتیجی کو یا خالہ اور بھانجی کو نہ رکھے؟

47۔ کیا امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ نا قابل اعتبار راوی حدیث تھے؟

48۔ کیا آخرت میں پل صراط ہوگا۔

49۔ آپ نے اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھا ہے کہ جانور کی قربانی کرنا نفل ہے، سنت ہے، قانون ہے؟ کیا کوئی نفلی کام بھی قانون ہوتا ہے؟

4۔ فقہی مسائل سے متعلق

50۔ کیا شریعت میں کھانے کی صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں: خون، مردار، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ؟ اور کیا کھانے کے سوا خنزیر کی چربی اور بالوں کا کوئی دوسرا استعمال جائز ہے۔

51۔ اسلامی شریعت کے مصادر و ماخذ کون کون سے ہیں؟

52۔ معروف اور منکر کا تعین اسلامی شریعت کرتی ہے یا انسانی فطرت؟

53۔ کیا اجماع کے خلاف بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے؟

54۔ کیا نماز میں عورت مردوں کی امامت کر سکتی ہے؟

55۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے قبل از بعثت بھی عید الفطر اور عید الاضحیٰ منائی تھیں اور ان کی نمازیں بھی پڑھی تھیں؟

56۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے پہلے کبھی کوئی روزہ رکھا؟

57۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے پہلے بھی حج کیا تھا؟

58۔ کیا اسلامی قمری مہینے کے آغاز کی تعیین کے لیے رویت ہلال (چاند دیکھنا) ضروری شرط نہیں ہے؟

59۔ کیا زکوٰۃ کا نصاب اور مقداریں (مقادیر) مقرر اور منصوص نہیں ہیں۔ یا ان میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

60۔ کیا مسلم حکومت کسی شخص کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر سکتی ہے؟

61۔ کیا بنو ہاشم (سادات) کو زکوٰۃ دینی جائز ہے؟

62۔ کیا کوئی کافر کسی مسلمان کا اور کیا کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث ہو سکتا ہے؟

63۔ کیا قاتل مقتول کا وارث ہو سکتا ہے؟

64۔ اگر صرف بیٹیاں وارث ہوں تو ان کو کل میراث کا دو تہائی⑥ حصہ نہیں ملے گا؟

65۔ کیا تجارتی بنکوں کا منافع ربا یعنی سود ہے؟

66۔ کیا مکان بنانے کے لیے بنک سے سود پر قرضہ لیا جا سکتا ہے؟

67۔ کیا زندگی کا بیمہ (Life Insurance) جائز ہے؟

68۔ مردوں کی داڑھی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

69۔ کیا مسلمان عورت کے لیے پردے کا شرعی حکم نہیں ہے؟

70۔ کیا عورت نکاح خواں بن سکتی ہے؟

71۔ کیا جاندار کی تصویر جائز ہے؟

72۔ کیا شریعت میں موسیقی اور گانا بجانا حرام نہیں ہے؟

73۔ کیا اسلام میں مجسمہ سازی اور مجسّمے (Sculptures) جائز ہیں؟

74۔ کیا اسلامی شریعت میں صرف دو جرائم ...... قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم میں قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی؟

75۔ کیا اسلام میں مرتد اور توہین رسالت کی سزا قتل نہیں ہے؟

76۔ کیا اسلامی شریعت میں شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کے ذریعے قتل کی حد نہیں ہے؟

77۔ جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے گواہوں کا نصاب کیا ہے؟ اور کیا حدود کے مقدمات میں عورت کی گواہی بھی معتبر ہے؟

78۔ کیا نبی کریم ﷺ نے کسی شادی شدہ زانی کو صرف سو کوڑوں کی سزا دی تھی؟

79۔ کیا نبی کریم ﷺ نے کسی کنوارے زانی کو زنا بالجبر یا اوباشی کے جرم میں رجم یا سنگساری کی سزا دی؟

80۔ کیا شراب نوشی پر شرعی سزا نہیں ہے؟

81۔ کیا ہم جنس پرستی (Homosexuality) گناہ اور حرام ہے؟

82۔ کیا اسلامی شریعت میں قسا کا فوجداری قانون موجود ہے؟

83۔ کیا نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا؟

84۔ کیا قادیانی غیر مسلم نہیں ہیں؟

85۔ کیا ہندو مشرک نہیں ہیں؟

5۔ متفرق سوالات

86۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور وہ قیامت کے قریب دنیا میں دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے؟

87۔ کیا قربِ قیامت میں امام مہدی نہیں آئے گا؟

88۔ کیا دجال کسی خاص شخصیت کا نام نہیں ہے؟

89۔ یاجوج ماجوج سے کیا مراد ہے؟

90۔ کیا قربِ قیامت میں سورج کے مغرب سے نکلنے کا یہ مطلب ہے کہ اُس وقت مغربی اقوام کا سیاسی غلبہ ہوگا۔

91۔ آپ کی رائے میں سکول کے بچوں کو کس عمر میں اور کس کلاس سے اسلامیات کی تعلیم شروع کرائی جائے؟

92۔ تصوف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

93۔ کیا عراق اور افغانستان پر امریکی حملوں کا کوئی جواز تھا؟

94۔ کیا افغانستان، عراق اور فلسطین میں مسلمانوں کی طرف سے خودکش حملے جائز ہیں؟

95۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے واقعے میں کون قصوروار تھا؟

96۔ آپ کی رائے میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر دہشت گرد ہیں یا مجاہد؟

97۔ کیا مقبوضہ کشمیر میں جہاد ہو رہا ہے؟

98۔ کیا اقامت دین بھی کوئی دینی فریضہ ہے؟

99۔ کیا نظام خلافت کا قیام مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری نہیں ہے؟

100۔ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کا حق ہے یا یہودیوں کا؟



ضمیمہ 3۔ منظومات

1۔ غامدی نامہ

1۔ غامدی نامہ

تقریر تیری ، ساحری	تحریر تیری ، منطقی
کیا خوب تیری شاعری	ویسے تو ہے کلّے زئی

جاوید احمد غامدی

کونسل کا تو ممبر بھی ہے	ٹی وی کا دانش ور بھی ہے
مغرب کا نامہ بر بھی ہے	اے منکرِ وحیٔ خفی!

جاوید احمد غامدی

کتنے ہی تیرے ہم سفر	کرتے گئے تجھ سے حذر
جس کا سبب یہ تھا مگر	ہے بے مروّت آدمی

جاوید احمد غامدی

جب جھوٹ مسجد میں کہا	تھا سامنے قرآں دھرا
یوں تو 'جماعت' سے گیا	پائی نئی پھر روشنی

جاوید احمد غامدی

معنیٔ سنت بھی غلط؟	اجماعِ اُمت بھی غلط؟
سبعہ قراءت بھی غلط؟	مرتد کی حد ساقط ہوئی

جاوید احمد غامدی

تصویر زندہ کی درست؟ رقص اور موسیقی درست؟
ختم کے معنی درست؟ کیا مرچکے عیسیٰ نبیؑ!

جاوید احمد غامدی

اے ناقدِ حکمِ جہاد تاویلِ باطل کا فساد
اے اہلِ مغرب کی مراد پرویز و مرزا کی کڑی

جاوید احمد غامدی

اے منکرِ شرع متین! اے حامی اعدائے دین!
'روشن خیالی ایں چنیں' تو از کجا برآمدی؟

جاوید احمد غامدی

أَنْكَرْتَ حَدَّ الْمُرْتَدِ بَدَّلْتَ دِيْنَ أَحْمَدِ
لَا تَصْلُحُ، لَا تَهْتَدِيْ أَنْتَ كَضَالٍّ مُّلْحِدٍ

اَلْغَامِدِيُّ الْغَامِدِيْ



2۔غزل

ربابِ غامدی میں ہے وہی آہنگِ پرویزی
وہی ذوقِ تجدّد، ترکِ سنت ، فتنہ انگیزی
بھروسا کر نہیں سکتے کبھی دانش فروشوں پر
سکھاتے ہیں مسلماں کو جو اُمت سے کم آمیزی
ہمیشہ بولتے ہیں دشمنانِ دین کی بولی
جہادِ غوری و محمود کو کہتے ہیں خوں ریزی
چمن میں نظم لاتے ہیں وہ مصنوعی طریقے سے
گھٹا دیتے ہیں جس سے حسنِ فطرت کی دل آویزی
پرے ہے سرحدِ اِدراک سے جبریلؑ کی دنیا
جہاں بے کار ہو جاتی ہے اَسپِ عقل کی تیزی
یہ دینِ حق خود اِک طوفانِ عالمگیر ہے جس کو
ڈرا سکتی نہیں باطل کی موجوں کی بلاخیزی
رفیقؔ اُن سے توقع خیر کی ہم کو نہیں ہرگز
سیاست جن کی لادینی، قیادت جن کی چنگیزی

3۔ تضمین بر شعرِ اقبال

یہ خلل دماغ کا ہے یا کسی کی مہرہ بازی
کہ مصوری ہے جائز، ہے حلال نے نوازی
وہ تو بات غیر کی تھی جو تیری زباں سے نکلی
کہ اُسامہ اور اَیمن، نہ مجاہد ہیں نہ غازی
یہ کڑا ہے وقت مانا، مگر اِس قدر نہیں ہے
کہ جو غزنوی ہے اُس کو بھی سکھائے تو ایازی
یہ ''شراقیوں'' سے کہہ دو کہ رہے گی تا قیامت
وہ محمدی شریعت کہ نہیں فقط حجازی
یہ ترا عجیب دعویٰ کہ جو دین تو نے سمجھا
نہ سمجھ سکا تھا اس کو کوئی شافعی، نہ رازی
یہ ترا اُصولِ باطل کہ 'حدیث دیں نہیں ہے'
ہے خسارا ہی خسارا، یہ نبیؐ سے بے نیازی
نہ کوئی اُصول تیرا، نہ کوئی رفیق مذہب
ہے کبھی سخن طرازی، ہے کبھی زباں درازی
''تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تَذَرْواں نہیں دینِ شاہبازی''



4۔صاحبِ اشراق کے اُسرار و رموز

صاحبِ اشراق کے کھلتے ہیں اَسرار و رُموز
کشورِ پنجاب میں وہ روحِ مرزا کا بُروز
رقص وموسیقی ہوئے اُس کی شریعت میں حلال
ہے حرام اِس دور میں کفّار سے جنگ و قتال
ہو چکی اُس کی نظر میں ابنِ مریمؑ کی وفات
اور افسانہ کہ اُن سے کھائے گا دجّال مات
اُس کی ہر گفتار میں مذہب کی تاویلات دیکھ
رشتۂ الفاظ میں اُلجھی ہوئی ہر بات دیکھ
بندۂ حُر کو سکھاتا ہے غلامی کے طریق
اہلِ حق سے ہے جدا ، وہ اہلِ باطل کا رفیق
قرب حاصل ہے اُسے سرکار کے دربار میں
ہے مگر خود جنسِ ارزاں وقت کے بازار میں
آج وہ ہے لشکرِ اَعدا کے دل کی آرزو
رنگ لائے گا مگر اپنے شہیدوں کا لہو

اُس کے مے خانے میں ہے کیسی کرامت کا ظہور
جامِ مشرق لاتا ہے مغرب کی صہبا کا سُرور
نغمۂ بے سوز پوشیدہ ہے اُس کے ساز میں
غیر کا مطلب ہے پنہاں اُس کی ہر آواز میں
اُس کے نظمِ باطنی سے پیدا بدنظمی ہوئی
اور قرآں کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی
'غامدیت' دین کی راہوں میں کج بینی کا نام
'غامدیت' دین کے پردے میں بے دینی کا نام
جس میں ہے بُوئے تجدّد، دین کا انکار بھی
پائے جاتے ہیں رفیقِ اِلحاد کے آثار بھی



5۔ 'ہم سفر' میر سفر کے جواب میں

ع خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

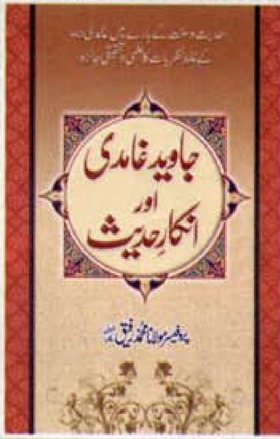
دکھائے میں نے بہت سبز باغ لوگوں کو
مگر کسی کو بھی مجھ پر نہ اعتبار آیا
مجال کس کی تھی کرتا جو ہمسری میری
تمام قافلہ ادنیٰ تھا، ایک میں اعلیٰ

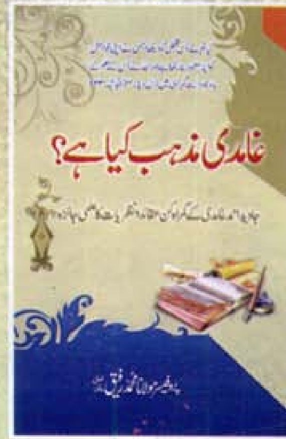
اِسی سبب سے تو چھوڑا مجھے ندیموں نے
کہ میری طبع میں اوروں کا احترام نہیں
بجا کہ اُن میں کئی باہنر بھی تھے لیکن
کسی کا آج بھی مجھ سے بڑا مقام نہیں

مرے جمال سے ہوتی تھی کہکشاں روشن
تکلم ایسا کہ جس کو زبانِ گل کہہ دوں
نجانے کیا ہوا کہ ہو گیا میں ہرجائی!
مآلِ کار میں شہرِ جنوں میں تنہا ہوں

ہلال کی طرح اُبھری تھی گرچہ ذات مری
فروغِ بدر سے پہلے ہوئی ممات مری







مکتبہ قرآنیات ۔ لاہور
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0321-7724032 , 0333-4399812